ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین دہلی کی مذہبی اور تاریخی مطبوعات

ذیل میں ندوۃ المصنفین دہلی کی چند اہم دینی، اصلاحی اور تاریخی کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے۔
مفصل فہرست جس میں آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی دفتر سے طلب فرمائیے۔

اسلام میں غلامی کی حقیقت جدید ایڈیشن
جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی
کئے گئے ہیں قیمت سے، مجلد للعہ

سلسلہ تاریخ ملت مختصر وقت میں تاریخ اسلام
کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے یہ سلسلہ نہایت
مفید ہے اسلامی تاریخ کے یہ حصے مستند و معتبر
بھی ہیں اور جامع بھی۔ انداز بیان نکھرا ہوا اور شگفتہ

نبی عربی صلعم (تاریخ ملت کا حصہ اول) جس میں
سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص
ترتیب سے نہایت آسان اور دل نشین انداز میں
یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت عہ مجلد عہ

خلافت راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ)
عہد خلفائے راشدین کے حالات و واقعات کا
دل پذیر بیان قیمت ہے مجلد ہے

خلافت بنی امیہ (تاریخ ملت کا تیسرا حصہ)
قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ مجلد تین روپے بارہ آنے

خلافت ہسپانیہ (تاریخ ملت کا چوتھا حصہ)
قیمت دو روپے۔ مجلد دو روپے چار آنے

خلافت عباسیہ (جلد اول) (تاریخ ملت کا
پانچواں حصہ) قیمت ہے مجلد للعہ

خلافت عباسیہ (جلد دوم) (تاریخ ملت کا
چھٹا حصہ) قیمت للعہ، مجلد صہ

تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ (تاریخ ملت کا ساتواں حصہ)
مصر اور سلاطین مصر کی مکمل تاریخ صفحات ۳۰۰
قیمت تین روپے چار آنے۔ مجلد تین روپے آٹھ آنے

خلافت عثمانیہ تاریخ ملت کا آٹھواں حصہ مجلد ہے

فہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم
اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو
مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت عہ مجلد ہے

غلامان اسلام اسی سے زیادہ غلامان اسلام
کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی
بیان۔ جدید ایڈیشن قیمت صہ مجلد ہے

اخلاق و فلسفہ اخلاق علم الاخلاق پر
ایک مبسوط اور محققانہ کتاب۔ جدید ایڈیشن جس میں
غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں۔ اور مضامین کی
ترتیب کو زیادہ دل نشین اور سہل کیا گیا ہے۔
قیمت ہے، مجلد معہ

قصص القرآن جلد اول تیسرا ایڈیشن۔
حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰ و ہارونؑ کے حالات
واقعات تک۔ قیمت ہے، مجلد معہ

قصص القرآن جلد دوم حضرت یوشعؑ سے
حضرت یحییٰؑ کے حالات تک تیسرا ایڈیشن قیمت ہے مجلد للعہ

قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات
کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت صہ مجلد ہے

بُرہان

جلد بست و دہم　　　　　شمارہ نمبر ۱

جنوری ۱۹۵۳ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۷۲ھ

آہ مفتی اعظم ہند!

واحسرتا! ۳۱ دسمبر ۱۹۵۲ء کو شب کے ساڑھے دس بجے یعنی ٹھیک اس وقت جبکہ ایک سال شمسی اپنی حیاتِ دوازدہ ماہ کی مقررہ مدت پوری کر کے ہمیشہ کے لئے گوشۂ عدم میں آسودۂ سکون ہو جانے کی تیاری کر رہا تھا علم و عمل کے آسمان کا ایک آفتابِ عالمتاب غروب ہو گیا۔ یعنی حضرتنا الاستاذ مولانا الحاج المفتی محمد کفایت اللہ الدہلوی نے اسّی سال کی لگ بھگ عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہہ کر جان جانِ آفریں کے سپرد کی! انا للہ و انا الیہ راجعون۔

حضرت مفتی صاحب کا وجودِ گرامی اپنی چند در چند علمی و عملی خوبیوں اور گوناگوں دماغی و اخلاقی کمالات کے باعث صرف ہندوستان اور پاکستان کا نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کا ایک ایسا متاعِ گرانمایہ اور سرمایہ بلند پایہ تھا کہ آج اس کے اُٹھ جانے پر جتنا بھی ماتم اور اُس پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے:-

حضرت مرحوم خود جلیل القدر بزرگ اور بزرگوں کی یادگار تھے۔ اُنہیں دیکھ کر اور اُن کی صحبت میں دو چار

سے لذا زکر سلفِ صالحین کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ قدرت نے اُن میں دل اور دماغ دونوں کی خوبیاں اور ان کے فضائل و کمالات کچھ اس طرح بیک وقت جمع کر دئے تھے کہ اُن کی ہستی "اے تو مجموعۂ خوبی بچہ نامت خوانم" کا مصداق بن گئی تھی۔ وہ ایک طرف بہت بڑے عالم، مفسر، محدث اور فقیہ تھے تو دوسری جانب علوم عصریہ کے جامع تھے اور ان میں بہت ٹھوس استعداد رکھتے تھے۔ پھر معاملات میں سمجھ بوجھ اور سیاسی و دینی امور و مسائل میں ان کی فرزانگی و دانشمندی کا یہ عالم تھا کہ جس طرح علما کی بزم کے وہ صدر نشین تھے اسی طرح اربابِ سیاست و تدبر کی محفل میں بھی اپنا مقام خاص رکھتے تھے "جو بات کہتے تھے" اور جو لفظ اُن کے قلم سے نکلتا تھا وہ اس قدر جچا تلا اور نپا تلا ہوتا تھا کہ کسی بڑے سے بڑے نکتہ چیں کے لئے بھی اُس پر حرف گیری آسان نہ ہوتی تھی۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے آنمرحوم کو سب ہی علوم اسلامیہ میں غیر معمولی درک و بصیرت اور فہم و فراست عطا فرمائی تھی۔ تاہم آپ کا اصل طغرائے امتیاز تفقہ فی الدین تھا۔ بڑے سے بڑا پیچیدہ مسئلہ ان کے سامنے آتا تھا اور وہ قرآن و حدیث اور احکام فقہ کی روشنی میں اس کا صحیح حل اس طرح علیٰ وجہ البصیرت معلوم کر لیتے تھے کہ پھر کسی کے لئے اس کا خلاف کرنا آسان نہیں ہوتا تھا۔ یہی وہ صفت تھی جس کے باعث ملتِ بیضا نے ان کو مفتی اعظم کا خطاب دیا تھا۔ اور کوئی شبہ نہیں کہ اس خطاب کا جامہ ان کے تفقہ کے قامتِ موزوں پر بالکل چست آتا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت مفتی صاحب رح کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کافی غور و خوض اور تفکر و تدبر کے بعد کسی نتیجہ پر پہونچتے تھے اور اس وقت کے وقت مسئلہ کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا تھا جو ان کی نظرِ توجہ سے اوجھل رہ گیا ہو۔ اور پھر ان کا فیصلہ ایسا اور مستحکم ہوتا تھا کہ اس کو بدلوا دینا ممکن نہ تھا۔ اس حیثیت سے وہ بلاشبہ اسرار و غوامض شریعت کے بڑے محرم اور احکام و تعلیمات اسلام کے ایک دیدہ ور نباض تھے۔ ان کے فتوی مختصر مگر نہایت جامع اور مدلل ہوتے تھے۔ وہ عام اربابِ افتا کی طرح اپنی تحریروں میں کتبِ فقہ کی طول طویل عبارتوں اور مختلف اقوالِ ائمہ کے نقل کرنے کے عادی نہ تھے۔ مگر جتنا کچھ لکھتے تھے مسئلہ کی اصل روح اور اس کے اصل مغز کا حامل ہوتا تھا۔ اسی بنا پر ۱۹۲۶ء میں مکہ معظمہ کی موتمر عالم اسلامی میں جمعیۃ علماء ہند کے صدر وفد کی حیثیت سے انہوں نے شرکت کی اور اس کے بعد قاہرہ کی موتمر میں تشریف لے گئے تو ہر جگہ حجاز، مصر اور عالم

اسلام کے دوسرے ملکوں کے علماو فضلا نے آپ کے غیر معمولی تفقہ فی الدین اور اصابت رائے کو تسلیم کیا اور آپ کی علمی عظمت و برتری کا علانیہ اعتراف کیا۔ قاہرہ کے دوران قیام میں آپ کی علمی سیادت کا اعتراف اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا تھا کہ شیخ جامعہ ازہر علامہ مراغی جو اپنے عہدہ کی حیثیت سے شاہ مصر کے محل میں جانے کے علاوہ اور کسی کے مکان پر جا نہیں سکتے تھے حضرت مفتی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی مزاج پرسی کے لئے دو مرتبہ آپ کے قیام گاہ پر تشریف لائے نہ صرف علماء مصر بلکہ پوری مصری قوم کی طرف سے یہ سب سے بڑا خراج عقیدت تھا جو عالم اسلام کی کسی عظیم المرتبت ہستی کو پیش کیا جا سکتا تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ طبعاً نہایت ٹھنڈے دماغ، سنجیدہ فکر، متین طبیعت، اور مرنج و مرنجان مزاج کے بزرگ تھے۔ ہنگامہ آفرینی یا انقلاب پسندی سے ان کی طبیعت کو کوئی لگاؤ نہیں تھا لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی تاریخ جد وجہد آزادی کے نہایت نازک دور میں جمعیۃ علماء ہند کے پہلے صدر کی حیثیت سے جب انہوں نے ایک نہایت اہم اور بھاری ذمہ داری اپنے سر لی تو اب وقت آیا کہ اُن کی قوتِ عمل اور کیرکٹر کی پوشیدہ خوبیاں بروئے کار آئیں۔ چنانچہ کانگریس کی تحریک آزادی اور جمعیۃ علماء ہند کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ حضرت مفتی صاحب نے اس تمام مدت میں جس تدبر، فراست، عزم وہمت، استقلال و پامردی اور راہِ حق میں بے خوفی و بیباکی کا ثبوت دیا ہے اسے دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ "ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند"

حضرت مفتی صاحبؒ کو اگر رئیس العلماء یا امیر العلماء کہا جائے تو ایسا کہنا صورۃً و معنیً ظاہراً و باطناً دونوں طرح بالکل موزوں ہوگا۔ کیونکہ وہ جس طرح علم وفضل کے اعتبار سے رئیس علماء تھے معاشی خوشحالی اور مالی رفاہیت کے لحاظ سے بھی علماء میں انہیں ایک خاص مقام حاصل تھا۔ انہوں نے ایک کتب خانہ قائم کر کے خود اپنی قوت بازو سے دولت پیدا کی۔ پھر ان کی کتاب تعلیم الاسلام کے مختلف حصے گھر گھر اس قدر مقبول ہوئے کہ اب تک لاکھوں کی تعداد میں ان کی اشاعت ہو چکی ہے اور ان کے ذریعہ ہزاروں روپیہ کا ان کو فائدہ ہوا۔ اس مالی رفاہیت اور معاشی فارغ البالی کے باعث وہ نہایت خودداری اور بڑا رکھ رکھاؤ کے ساتھ رہتے تھے۔ خرچ کرنے کے موقع پر بے دریغ خرچ کرتے تھے۔ اور اس معاملہ میں بھی ان کا ہاتھ ہمیشہ کھلا

اور ارباب تموّل کی امداد سے بے نیاز و مستغنی رہتا تھا۔

مجموعی حیثیت سے حضرت مفتی صاحبؒ کا سب سے بڑا جوہر کمال یہ تھا کہ انہوں نے قدرت کی بخشی ہوئی ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کو اپنی خاص توجہ اور محنت سے اس طرح ابھارا اور انہیں پروان چڑھا کر اپنی شخصیت کی تعمیر اس انداز سے کی تھی کہ علم و فضل کے علاوہ وہ اندرون خانہ اور بیرون خانہ زندگی کے کسی کام میں عاجز اور تہی مایہ نہ تھے۔ انہوں نے ایک معمولی گھرانے میں پیدا ہونے کے باوجود اپنی دنیا آپ پیدا کی تھی۔ جو دینی حیثیت سے جس طرح مکمل تھی دنیوی حیثیت سے بھی کہیں سے تشنہ اور خام نہیں تھی۔ چنانچہ گوناگوں علمی و عملی اور روحانی و معنوی کمالات و فضائل کے علاوہ وہ اعلیٰ درجہ کے خطاط بھی تھے اور خیاط بھی۔ ایک بہترین انجینیر بھی تھے اور طباخ بھی خوش لباس خوش غذا تھے اور ورزشی جسم رکھتے تھے۔ ملتان جیل میں بیڈمنٹن کھیلنا شروع کیا تو چند روز کی مشق میں ہی سب ساتھیوں پر بازی لے گئے۔ حساب دانی میں مشکل سے کوئی عالم اُن کا حریف ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھی عربی فارسی اور اردو میں شعر بھی کہتے تھے بات چونکہ جچی تلی کہنے کے خوگر تھے اس بنا پر ان کی تقریر اگرچہ پُرمغز اور مدلل ہوتی تھی لیکن ہنگامہ آفریں اور ولولہ انگیز نہیں ہوتی تھی، بزم احباب میں ایک بذلہ سنج مگر باوقار و متین یار شاطر اور ارباب معاملہ کی مجلس میں ایک غائر النظر مدبر و مفکر تھے۔ اس حیثیت سے ان کی زندگی بے شبہ علوم دینیہ کے علماء و طلباء کے لئے ایک کامیاب نمونۂ عمل اور اس بات کی شہادت تھی کہ علوم عربیہ و اسلامیہ کا ایک بوریہ نشین طالب علم اگر چاہے اور کوشش کرے تو قوم کے عطیات اور چندوں سے سرکاری ملازمت وغیرہ کی غلامی سے بے نیاز ہو کر اپنی دنیوی زندگی بھی ایک معیاری اور خوشحال زندگی بنا سکتا ہے۔

صد حیف! کہ اب یہ بزرگ صورتیں۔ یہ علم و عمل کی جیتی جاگتی شکلیں، اسلام کی دیرینہ روایات کی حامل و علمبردار یہ شخصیتیں اپنوں اور پرایوں کا غم کھانیوالی اور بنی نوع انسان کی ہمدرد و غمگسار یہ ہستیاں روز بروز عنقا ہوتی جا رہی ہیں۔ اور ایک وقت آئے گا کہ لوگ ان صورتوں کے دیکھنے کو ترسیں گے بطن ارض کا خزانہ ان سے مالامال ہوگا لیکن مادر گیتی کی کوک ان سے خالی ہوگی۔ آئندہ نسلیں تاریخ کے صفحات میں ان کے تذکرے پڑھیں گی۔ لیکن ظہر ارض پر ان کی سی ایک صورت و سیرت بھی نہ ملے گی۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ رحمۃ واسعۃ وامطر علیہ سحائب لطفک السامی وکرمک الھنی تامۃ وکاملۃ۔

حضرت خواجہ محمد عاقلؒ

از

(پروفیسر خلیق احمد صاحب نظامی ایم۔ اے)
(لکچرر شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

"پروفیسر خلیق احمد صاحب نے "مشائخ چشت" کے نام سے جو عظیم الشان اور ضخیم کتاب مرتب فرمائی ہے اور جو عنقریب ندوۃ المصنفین سے شائع ہونے والی ہے، زیر نظر مضمون اسی کتاب کا ایک باب ہے۔"

"ایڈیٹر"

خواجہ محمد عاقلؒ، حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کے ممتاز ترین خلفاء میں تھے۔ پنجاب میں نظامیہ سلسلہ کی اشاعت میں انھوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ چاچڑان، کوٹ مٹھن، احمد پور وغیرہ مقامات کی خانقاہیں اُن ہی کی کوششوں سے وجود میں آئیں۔

حاجی نجم الدین صاحب نے لکھا ہے۔

"ہزارہا مخلوق از دروازۂ ایشاں فیض یاب شدند و صدہا صاحب خانقاہ از ایشاں مبعوث شدند"[1]	ہزارہا مخلوق نے اُن کے دروازے سے فیض پایا اور سینکڑوں صاحب خانقاہ ان سے مبعوث ہوئے

ان کے علمی تبحر، پابندیِ شرع، بزرگانہ شفقت، اخلاق و مروت کا دور دور شہرہ تھا۔ لوگ بڑی عقیدت سے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ پنجاب کے نہایت ہی دور افتادہ اور غیر معروف علاقوں میں مذہبی اور روحانی تعلیم کا چرچہ ہو گیا۔ اور اُن کے خرمنِ کمال کے خوشہ چیں دور دور پھیل گئے۔

---

[1] مناقب المحبوبین۔ ص ۱۲۳

خاندان و نسب | خواجہ محمد عاقلؒ ایک معزز فاروقی خاندان کے فرد تھے۔ ان کے اجداد شاہان مغلیہ اور امراء وقت کی نظروں میں خاص عزت رکھتے تھے۔ ان کے ایک بزرگ حضرت محبوب اللہ الصمد مخدوم نور محمد تھے۔ ارادت خاں وزیر شاہ جہاں ان کا مرید تھا۔ شاہ جہاں نے ان کو پانچ ہزار بیگہ اراضی اخراجات کے واسطے دی تھی اور اس مضمون کا ایک فرمان عطا کیا تھا۔[۱]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ الخ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ الخ

مورخہ بست و پنجم شہر ربیع الاول ۔۔۔ جلوس مطابق ۔۔۔

بدیں مضمون کہ

"دریں زماں فرمان سعادت نشان فرخندہ عنوان بغرض اینکہ موازی پنج ہزار بیگہ زمین قابل زراعت از پرگنہ منکلوٹ سرکار صوبہ دارالامان ملتان در وجہ مدد معاش بنام خادمان کرامت نشان پیر و مرشد طریقت ہادی راہ حقیقت راہبر راہ شریعت و معرفت، غواص بحر عرفاں، زبدہ خدا پرستان حضرت قبلہ میاں صاحب مخدوم نور محمد کوریجہ دام اللہ ظلہ و شرفہ معہ فرزندان از ابتدائے فصل خریف بازگشت ادی بہشت ۱۰۹۹ فصلی مقرر است امر رفیع القدر شرف صدور یافت کہ زمیں مذکورہ بہ میاں صاحب معز الیہ عنایت فرمودیم۔ حاصلات آنہا فصل بفصل سال بسال صرف مایحتاج خود نمودہ دعائے خیر دولت ابد پیوند اشتغال می فرمودہ باشند باید کہ حکام و عمال و جاگیرداران و کروریاں حال و استقبال و اہل پرگنہ اراضی مذکور در عمل نمودہ حسب الحکم اشرف الاعلیٰ ایں امر جلیل القدر مستمر دانستہ در زمین مذکور از مالیہ سرکار یک صد و چہل و چہار بیگہ و یک مسجد مبارک و سرائے رنگین پختہ درس خواندن طالب علماں ساختہ بتصرف میاں صاحب معز الیہ دہند و بلو جہات و بسا آ حیات اخراجات مثل مغلیہ و پیشکش و جرمانہ و خالصانہ و محصولانہ و دروغگانہ و جہرانہ و دہ نیمی و مقدمی و صد و دمی و قانونگوئی و ضبط ہر سال و نکر از زراعت و کل تکالیف دیوانی و مطالبات سلطانی

---

[۱] مناقب فریدی۔ ص ۴۶ - ۴۷

مزاحمت نرسانند و در ہر سال و ہر فصل سند مجدد نطلبند و اجب الارشاد عمل نمودہ تخلف نوازند" تحریر تاریخ

مناقب فریدی میں عالمگیر اور شاہان مابعد کے فرامین بھی درج ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس جاگیر کو برقرار رکھا اور شاہ نور محمد نوریجہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

نور محمد کوریجہ کے تین فرزند تھے۔

(۱) سلطان مخدوم (۲) مخدوم محمد یعقوب (۳) حاجی محمد اسحاق

اول الذکر نے لاولد وصال فرمایا۔ موخر الذکر کی اولاد بیرون ضلع ڈیرہ غازی خاں میں آباد ہوگئی

محمد یعقوب کے دو بیٹے ہوئے۔

(۱) مخدوم غلام حیدر۔ ان کا مزار دریائے سندھ کے کنارے، یارا والی میں ہے۔

(۲) مخدوم محمد شریف۔ ان کے دو بیٹے تھے۔ ایک قاضی نور محمد دوسرے قاضی محمد عاقل۔

محمد شریف صاحب، یارا والی میں مقیم ہو گئے تھے اور وہاں ان کے کثیر تعداد میں مرید ہو گئے تھے۔

وہ بڑے مرتاض بزرگ تھے۔ زہد و ورع، قناعت و توکل میں یگانۂ روزگار تھے۔ حاجی نجم الدین صاحب[2] نے لکھا ہے کہ وہ "عالم باعمل" اور "صاحب برکت" تھے[2]۔ خواجہ گل محمد احمد پوری نے لکھا ہے کہ وہ زہد و ورع، میں لاثانی تھے[3]۔

کوٹ مٹھن | "مناقب فریدی" میں کوٹ مٹھن کے آباد ہونے کے متعلق لکھا ہے کہ جب مخدوم محمد شریف صاحب یارا والی میں آکر آباد ہوتے تو مٹھن خاں بلوچ رئیس یارا والی آپ کا مرید و معتقد ہوگیا۔ ایک دن آپ کا گذر اس جگہ سے ہوا جہاں اب کوٹ مٹھن آباد ہے۔ دریا کے کنارہ پر یہ پر فضا مقام دیکھ کر آپ نے خان موصوف سے کہا کہ اس جگہ ایک شہر آباد کیا جائے اور وہ اللہ والوں کا مسکن ہو۔ خاں نے اس جگہ شہر بسانا قبول کر لیا اور مخدوم سے گذارش کی کہ وہ خود اس مقام کو اپنا مستقر بنائیں۔ اس طرح کوٹ مٹھن وجود میں آیا[4]۔ اور حضرت مخدوم محمد شریف کی موجودگی کی وجہ سے دور دور سے علماء و مشائخ وہاں آکر جمع ہو گئے۔

---

[1] مناقب فریدی ص۴۳ [2] مناقب المحبوبین - ص ۱۱۹ [3] تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۳۰ [4] مناقب فریدی ص ۹۴

کورسیجہ لقب شاہ محمد عاقل صاحب کا خاندانی لقب کورسیجہ تھا۔ تمام شاہی فرامین میں اُن کے بزرگوں کے نام کے ساتھ کورسیجہ لقب ملتا ہے۔ حاجی نجم الدین صاحب نے اس کی وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ خواجہ صاحب کے خاندان کے ایک بزرگ ایک دن مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے گئے اور پوچھا کہ کیا کسی نے آذان کہہ دی ہے؟ - لوگوں نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے مٹی کے ایک برتن کو جو قریب ہی رکھا تھا اٹھایا اور کہا کہ اے کوزہ تو اذان کہہ۔ اس وقت سے ان کو "کورسیجہ" کہنے لگے۔ کوزہ کو سندھی زبان میں کورا کہتے ہیں۔ اور کہنے کے لئے "چو" استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ "کورا چو" ہو گیا۔ جس کے معنی ہوئے "کوزہ بگو"۔ رفتہ رفتہ "کورا چو" سے کورسیجہ ہو گیا۔[۱]

تعلیم خواجہ محمد عاقل نے بہت تھوڑی عمر میں کلام پاک حفظ کر لیا تھا۔[۲] ان کے والد ماجد مخدوم محمد شریف صاحب جو "یکتائے زماں" اور "محدث دوراں" تھے[۳] خود ان کو تعلیم دیتے تھے۔ فاضل باپ نے اپنے ہونہار بیٹے میں علم و ادب کا وہ ذوق و شوق پیدا کر دیا جو آخر عمر تک ان کا طرۂ امتیاز رہا اور جس سے ہزاروں شائقین علم و ادب نے فائدہ اٹھایا۔

خواجہ صاحب نے اپنے والد کے علاوہ حضرت شاہ فخر صاحبؒ اور خواجہ بہاروی سے بھی تحصیل علوم کیا تھا۔ حضرت شاہ فخر صاحب نے ان کو شرح عبد الحکیم اور سواء السبیل کا درس دیا تھا۔[۴] خواجہ بہارویؒ سے انھوں نے حدیث کی سند لی تھی۔[۵]

خواجہ صاحب کا حافظہ نہایت عمدہ تھا۔ جزوی مسائل تک صحت اور حوالوں کے ساتھ ان کو یاد رہتے تھے۔ ان کے تبحر علمی کے متعلق خواجہ گل محمد احمد پوریؒ نے لکھا ہے۔

---

[۱] مناقب المحبوبین۔ ص ۱۱۹ - ۱۲۰ [۲] مناقب فریدی، ص ۵ [۳] تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۳۹ [۴] مناقب المحبوبین ص ۱۲۱

[۵] تکملہ سیر الاولیاء ص ۱۸۰ - ۱۷۹۔ سلسلہ حدیث اس طرح درج ہے

شیخ محمد عاقل۔ شیخ نور محمدؒ۔ شیخ فخر الدین دہلویؒ۔ شیخ نظام الدین الغوری ثم اورنگ آبادیؒ۔ شیخ حافظ محمد سعد الانصاری المکی ثم اورنگ آبادی۔ شیخ محمد طاہر بن شیخ محمد ابراہیم کردی شہر مدنی۔ شیخ محمد ابراہیم کردی

"در عصر خود شرقاً غرباً مماثل آنحضرت در علم ظاہری ہم کسے نبود"[۱]　　شرق و غرب میں ان کی مثل اس زمانہ میں علم ظاہری میں کوئی نہ تھا۔

پھر آگے چل کر فرماتے ہیں۔

"خلوص علم از اصول و فروع بآں مشابہ بود کہ بدرجہ اجتہاد رسیدہ بود"[۲]

اجراء مدارس سلسلہ درس تدریس خواجہ محمد عاقل صاحبؒ کو ابتدا ہی سے درس و تدریس کا بڑا شوق تھا۔ انھوں نے کوٹ مٹھن میں نہایت اعلیٰ پیمانہ پر ایک مدرسہ قائم کیا۔ بڑے بڑے عالم اس مدرسہ میں ملازم تھے۔ درس و تدریس کا کام بہت باقاعدہ ہوتا تھا۔ خود خواجہ محمد عاقلؒ سو سے زیادہ طلبا، کو درس دیتے تھے مدرسہ کے ساتھ ہی ایک بڑا لنگر خانہ تھا۔ جب آپ کوٹ مٹھن سے چاچڑاں شریف لے گئے تو وہاں بھی مدارس قائم کئے اور طلباء و اساتذہ کے لئے لنگر کی سہولتیں بہم پہنچائیں۔[۳]

خواجہ صاحبؒ کے مدارس میں جن کتابوں کا درس ہوتا تھا وہ یہ ہیں۔

مشکوۃ شریف۔ احیاء العلوم۔ صحیح بخاری۔ لوائح و شرح قصیدہ۔ سوا السبیل۔ تسنیم۔ فصوص الحکم۔ شرح وقایہ معہ حواشی۔ ہدایہ۔ شرح مواقف۔ شرح ہدایہ حکمت۔ میر ہاشم۔ شرح عقاید خیالی مطول وغیرہ۔[۴]

خواجہ مہاروی کی خدمت میں حاضری تحصیل علم کے بعد خواجہ محمد عاقلؒ اور ان کے بڑے بھائی میاں نور محمدؒ کو اصلاح باطن اور تزکیہ نفس کے لئے مرشد کامل کی تلاش اور جستجو پیدا ہوئی۔ اگرچہ خود ان کے والد ماجد بڑے صاحب کمال بزرگ تھے لیکن بقول خواجہ گل محمدؒ

"داعیہ آنجناب شہباز بلند پرواز بود"[۵]

اسی اثنا میں حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کی شہرت سنی۔ اتفاقاً ان کے بڑے بھائی کی موضع یاران والی میں خواجہ مہاروی سے ملاقات بھی ہوگئی۔ پہلی ہی نظر میں یہ عالم ہوا کہ

"..... ہیبت ..... آں بادشاہ گدا لباس در گرفت"[۶]

اور بے اختیار زبان پر یہ اشعار آگئے ؎

---

[۱] تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۳۹ [۲] ایضاً ص ۱۴۰ [۳] ایضاً [۴] ایضاً [۵] ایضاً ص ۱۴۵ [۶] ایضاً

بشبہا سیہ کے بُدا امیدم کہ رد زیے گرد داین روز سفیدم
شبم را صبح فیروزی برآید غم و رنج شبا نروزی سر آید
کہ بودم گر ہمے در ظلمتِ شب رسیدہ جان ز گمراہیم بر لب
برآمدہ از افق رخشندہ ماہے بکوئے دوستم بنمود راہے[1]

اسی رات کو ایک قاصد خواجہ محمد عاقل کو بلانے کے لئے کوٹ مٹھن بھیجا گیا۔ خواجہ صاحب فوراً آکر ملے۔ اور اُدھر ہی خواجہ نور محمدؒ کے دست حق پرست پر بیعت کر لی۔

دہلی کا سفر اور شاہ فخر صاحب کی خدمت میں حاضری

خواجہ محمد عاقلؒ کو کئی مرتبہ[2] حضرت شاہ فخر صاحب رح کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ پہلی بار جب وہ خواجہ مہاروی کی ہمراہی میں مہار سے دہلی تشریف لائے تھے تو سارا سفر پیادہ پا کیا تھا۔ جب مرشد نے اس کا سبب دریافت کیا تو عرض کیا "میں نے خدا سے عہد کیا تھا کہ حضرت شاہ فخر صاحب کی زیارت کو پا پیادہ جاؤں گا"[3] دوسری مرتبہ وہ دہلی اس طرح آئے کہ اپنے وطن سے مہار خواجہ مہارویؒ کی خدمت میں گئے تھے، وہاں معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب دہلی تشریف لے گئے ہیں۔ یہ سن کر آپ نے فوراً دہلی کا رُخ کیا۔ دہلی پہنچے تو شاہ فخر صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے کچھ پاس نہ تھا۔ صرف ایک لوٹا تھا۔ اس کو فروخت کیا اور شاہ فخر صاحب کے لئے مٹھائی خریدی۔ خواجہ مہاروی کو اس کا علم ہوا تو دو اشرفیاں دیں کہ یہ حضرت شاہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دو[4]۔

مناقب فریدی میں لکھا ہے کہ دوسری بار جب وہ شاہ فخر صاحبؒ کی خدمتِ بابرکت میں حاضر ہوئے تھے تو علاوہ فیضانِ باطنی کے کچھ مسائل تصوف بھی سمجھے تھے[5]۔ مناقب المحبوبین کا بیان ہے کہ انھوں نے شاہ فخر صاحب سے شرح عبدالحق اور سواء السبیل پڑھی تھی[6]۔ آخری بار جب وہ مولانا فخر صاحب

---

[1] تکملہ سیر الاولیا۔ ص ۱۴۶ [2] مناقب فریدی میں ان کے تین مرتبہ دہلی تشریف لانے کا ذکر ہے ص ۶۰-۵۹ تکملہ نے لکھا ہے کہ دو مرتبہ دہلی گئے (ص ۱۴۶) مناقب المحبوبین نے فیصلہ نہیں کیا بلکہ لکھا ہے "دو سہ مرتبہ رفتہ اند" ص ۱۲۱ [3] [4] تکملہ ص ۱۴۷ مناقب المحبوبین میں لکھا ہے کہ خواجہ مہاروی نے ۴ اشرفیاں پیش کرنے کے لئے دی تھیں (ص ۱۲۲) [5] مناقب فریدی ص ۶۰ ص ۱۴۷ [6] ایضاً

[7] مناقب المحبوبین۔ ص ۱۲۱

سے رخصت ہوئے تو انھوں نے چار کتابیں عنایت فرمائی تھیں۔

(۱) مکتوبات شیخ عبدالقدوس گنگوہی

اس پر مولانا کے ہاتھ کا حاشیہ لکھا ہوا تھا۔ مناقب المحبوبین کے مصنف نے اس نسخہ کی زیارت کی تھی۔[1]

(۲) آداب معقول

(۳) سوالات ...

(۴) ایک مجموعہ جس میں لوائح جامی، شرح رباعیات جامی وغیرہ تھی۔[2]

مجاہدات قاضی محمد عاقل صاحب نے نہایت سخت مجاہدات کئے تھے۔ خواجہ حافظ محمد جمال کہا کرتے تھے کہ قاضی صاحب نے جتنے مجاہدے کئے ہیں مشکل سے کوئی دوسرا شخص کرسکتا ہے۔[3] ان کو ذکر جہر میں بڑی دلچسپی تھی۔ آخر زمانہ میں بھی جب ان کا بدن پیرانہ سالی کے باعث کمزور اور نحیف ہوگیا تھا وہ نہایت پابندی سے ذکر جہر کرتے تھے۔ ان کے ذکر کی آواز میلوں تک جاتی تھی۔[4] نواب غازی الدین خاں نے اسماء الابرار میں لکھا ہے۔ کہ قاضی صاحب کے ذکر کی آواز بہار سے شہر فرید تک (جو تین چار میل کے فاصلہ پر ہے) جاتی تھی۔[5]

قاضی صاحب "حبس دم" کی بڑی مشق فرمایا کرتے تھے۔

خواجہ گل محمد نے لکھا ہے کہ انھوں نے مجاہدۂ حبس دم کو کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اُن کا ارشاد تھا

"شغل حبس مثل مار بر گنج است۔ ہر کہ از گزند او نترسد بگنج می رسد"[6]	شغل حبس دم خزانے پر سانپ کی مانند ہے جو اس کے نقصان سے نہیں ڈرتا وہ خزانہ تک پہنچ جاتا ہے۔

عبادت میں مشغولیت کا یہ عالم تھا کہ بعض اوقات ان لوگوں سے جو بلاناغہ حاضر خدمت ہوتے تھے، یہ دریافت فرمالیتے تھے کہ اتنے دنوں کہاں رہے۔ جب کوئی جواب میں عرض کرتا کہ بندہ تو روزانہ حاضر ہوتا ہے تو فرماتے ــــــ "من ندیدہ ام"[7]

---

(۱) مناقب المحبوبین ص ۱۲۱۔ (۲) مناقب فریدی ص ۸۵ (۳) تکملہ سیرالاولیا۔ ص ۱۴۷ (۴) تکملہ سیرالاولیا۔ ص ۱۴۸ (۵) بحوالہ مناقب المحبوبین ص ۱۱۹ (۶) تکملہ سیرالاولیا۔ ص ۱۴۸ (۷) تکملہ سیرالاولیا ص ۱۴۵

قیدو بند کے مصائب | قاضی محمد عاقل صاحبؒ کے بڑے بھائی قاضی نور محمد صاحب ڈیرہ غازی خاں میں ٹھیکے لیتے تھے۔ ایک مرتبہ ٹھیکہ کی رقم ادا نہ ہوئی تو ناظم ڈیرہ نے شاہ محمد عاقل صاحب کو جو ضامن تھے قید کر لیا۔ ۹ مہینے تک شاہ صاحبؒ نے قید و بند کے مصائب برداشت کئے۔ اس زمانہ میں انھوں نے اپنا سارا وقت عبادت و ریاضت میں صرف کیا۔ رہائی کے بعد فرمایا کرتے تھے۔

"اگر آں نہ ما هرا بدست نمی آمد شاید از نتیجہ شغل بے نصیب می رفتم"[۱]

قید کے زمانہ میں پیر و مرشد کی جانب سے حضرت نارو والہ صاحب نے متعدد بار رہائی کے لئے اعمال ان کے پاس بھیجے لیکن انھوں نے کوئی عمل نہیں پڑھا۔ بعد کو جب لوگوں نے عمل نہ پڑھنے کی وجہ پوچھی تو فرمایا۔

"برائے خلاص نفس خود عمل کردن مبادا اسن گیری شد"[۲]

مقبولیت | خلافت ملنے کے بعد کچھ عرصہ تک خواجہ محمد عاقلؒ نے شیوع سلسلہ کی طرف توجہ نہیں کی شیخ مہاروی کو علم ہوا تو نہایت سختی کے ساتھ لکھا "تم فیض کو عام کیوں نہیں کرتے اور خلق اللہ کو داخل سلسلہ کیوں نہیں کرتے۔ میں اس کی اطلاع شاہ فخر صاحبؒ کو کروں گا" یہ سن کر خواجہ صاحب لرز گئے اور نہایت ادب سے عرض کیا۔

"کدام کس پیش من آمده است کہ آں رد نمودم۔ اگر مرضی مبارک باشد خود بہ خود بگویم"[۳]

اپنے مرید کا یہ انکسار اور عجز دیکھ کر خواجہ مہارویؒ کو جوش آگیا فرمانے لگے۔

"اے میاں صاحب! روزے باشد کہ ملائک آسماں بنام شما منادی دہند و خلائق از شرق و غرب بر آستانِ شما جبہ سایند۔ سبحان اللہ شما می فرمائید کہ پیش من کسے نمی آید"[۴]

تھوڑے ہی دنوں بعد پیر کی پیشین گوئی صحیح ہوئی اور ہزاروں عقیدت مند ان کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔

فتوح اور لنگر | قاضی صاحب کا لنگر ابتدائی زمانہ سے ہی جاری تھا۔ طلباء اور فقراء کو اس لنگر سے کھانا

---

۱ ۲ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۴۹ ۳ ۴ تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۵۰

ملتا تھا۔ لیکن ایک زمانہ شاہ صاحب پر ایسا بھی گذرا تھا کہ مسلسل فاقہ رہتا تھا اور لنگر کے سب متعلقین فقرا اور طلباء کو یہ مصائب برداشت کرنے پڑتے تھے

خواجہ گل محمد احمد پوری اس تنگی اور عسرت کے زمانہ میں قاضی صاحب کی خانقاہ میں رہتے تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ جب فتوح نہ آتی تھی تو کچھ نہ پکتا تھا۔ جب کچھ آجاتا تو پک جاتا۔ لیکن خواجہ صاحب کا یہ عالم تھا کہ جب تک تمام متعلقین، درویش اور طالب علم کھانا نہ کھا لیتے

"دست بہ طعام نمی بردند"[۱]

خواجہ گل محمد نے لکھا ہے کہ ان کے متعلقین وغیرہ کی تعداد پانچسو تھی[۲]۔ اور یہ تعداد اس وقت تھی جب فقر و فاقہ کے مصائب بھی برداشت کرنے پڑتے تھے جب باب فتوح کھل گیا تو لنگر سے کھانے والوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا۔ لکھا ہے —

"درآں وقت نہ واردین را تعداد بود، نہ طعام را انداز، یکے دربار شاہنشہی بود"[۳]	(اس وقت نہ آنے والوں کا شمار تھا نہ کھانے کا انداز ایک شاہی دربار تھا جو چلتا رہتا تھا)

اتباع سنت | خواجہ محمد عاقل اتباع سنت کا خاص لحاظ رکھتے تھے۔ ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی کہ احکام شریعت و سنت نبوی پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ وصال سے کچھ پہلے حضور سرور کائنات کو خواب میں دیکھا کہ فرماتے ہیں۔

"تو مارا بسیار خوش کردی کہ ہمگیں سنتہائے مارا زندہ کردی"[۴]

خواجہ جلال پوری فرمایا کرتے تھے کہ ان کو درجہ فنا فی الرسول حاصل تھا۔[۵]

توزیع اوقات | خواجہ محمد عاقل اپنے اوقات کے بہت پابند تھے مغرب کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد وہ شغل و ذکر میں مصروف ہو جاتے تھے پھر کھانا کھا کر عشاء کی نماز باجماعت پڑھتے تھے۔ اس کے بعد مریدوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو جاتے تھے آدھی رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا تہجد کی نماز پڑھ کر ذکر جہر کرتے تھے۔ قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تھے۔ طلبار کو درس شام کے وقت

[۱] [۲] [۳] تکملہ سیر الاولیا۔ ص ۱۴۹ [۴] مناقب المحبوبین ص ۱۲۳ [۵] ذکر حبیب۔ ص ۸۰۔ ۲۷۹

دیتے تھے۔ ڈیڑھ پہر دن باقی ہوتا تھا کہ اُن کا حلقۂ درس شروع ہو جاتا تھا۔[1]

لباس و خوراک | خواجہ صاحب عمدہ اور لطیف لباس زیب تن فرماتے تھے۔ شاہ فخر صاحبؒ نے ہدایت کی تھی کہ لطیف لباس اور لطیف غذا استعمال کریں۔ اس نصیحت سے ان کو بہت تعجب ہوا تھا لیکن پھر جب انھوں نے رسالہ خواجہ عبید اللہ احرارؒ میں لکھا دیکھا کہ

"سالک را باید کہ غذا و لباس لطیف استعمال کند کہ انوار لطیف زود ظاہر شوند"[2]

تو شاہ فخر صاحب کی نصیحت کی حکمت اُن کے ذہن نشین ہو گئی۔

خواجہ صاحبؒ کا قمیص سینے پر سے چاک رہتا تھا۔ کلاہ ترکی سر پر ہوتی تھی۔ جب باہر تشریف لے جاتے تو سر مبارک پر دستار یا سلاری (لنگی) باندھ لیتے تھے۔ تکملہ میں اُن کے لباس کے متعلق لکھا ہے۔

"پاجامہ نہ توسیلہ سیاہ و پاتہ بند سیاہ مستعمل می شد، و بر دوش لنگی یا الاچہ یا دوپٹہ یا سلاری بہر کیف می رسد مستعمل می شد"[3]

ریشمین کپڑا کبھی استعمال نہ کرتے تھے۔

خواجہ صاحبؒ بہت قلیل الطعام تھے۔ رات دن میں ۵۰ درم سے زیادہ خوراک نہ ہوتی تھی تکملہ میں لکھا ہے۔

"در اکل و شرب آں حضرت از شصت و ہشت درم ارد ہفت نان تنک تنور بہ تیار کردہ می شد بایں طریق کہ بر تابہ نیم پختہ نمودہ بعد ازاں بر انگرہا تمام پختہ می شد بایں صورت نان تمام نرم می شود ازاں نانہا دو نیم نان گاہے بہ شوربہ چوزہ یا دال مونگ یا شلغم تناول می فرمودند و ہم چنیں وقت شب می کردند"[4]

اخلاق | شاہ صاحبؒ کا اخلاق نہایت اعلیٰ تھا۔ امیر و غریب، بوڑھے اور جوان سب ہی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور وہ سب سے یکساں شفقت اور انکساری سے ملتے تھے۔ جو اُن سے ملتا تھا یہ سمجھتا تھا کہ جس قدر التفات و اکرام مجھ پر ہے کسی پر نہیں۔ اکثر اوقات ایسا دیکھا گیا کہ بعض لوگوں نے بازو پکڑ کر آپ کو اپنی طرف رجوع کیا لیکن آپ نے نہایت ہی خندہ پیشانی اور محبت سے ان کو جواب دیا۔

---

[1] مناقب فریدی ص ۸۵ [2] تکملہ سیر الاولیا ص ۱۴۲ [3] تکملہ سیر الاولیا ص ۱۴۴ ۔ مناقب فریدی ص ۵۵ [4] ایضاً

لوگ زور زور سے گفتگو کرتے لیکن آپ نہایت آہستگی اور خندہ روئی سے اُن کو مطمئن کرتے ۔ بعض مرتبہ خود ہنس کر فرمایا کرتے تھے کہ لوگ میرے باز دیکڑ کر اور زور زور سے چیخ کر مخاطب کرتے ہیں، گویا میں بہرا ہوں۔[۱]

اصلاح مریدین شاہ محمد عاقلؒ اپنے مریدوں کی اصلاح و تربیت کی طرف خاص توجہ فرماتے تھے۔ وہ اُن میں صحیح مذہبی جذبات، خدا پر بھروسہ اور اسی سے ہر مشکل میں مدد مانگنے کا صحیح جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے ایک مرتبہ چیچک کے عمل کے متعلق ذکر ہو رہا تھا۔ فرمانے لگے ۔

"نسبت اثر بخود کردن عین شرک است۔ موثر حقیقی حق تعالیٰ است"[۲]

شاہان مغلیہ کی عقیدت اکبر شاہ ثانی نے شاہزادہ جہاں خسرو اور کاؤس شکوہ کو قاضی محمد عاقل صاحب کا مرید کرایا تھا۔[۳] بہادر شاہ ظفر کو اُن سے بہت عقیدت تھی۔ ایک شعر میں کہتا ہے ؎

دل فدا کرتے ہیں نام فخر دیں پر اے ظفر — ہم ہیں عاقل ربط عاقل سے دلی رکھتے ہیں ہم

وصال قاضی صاحب تقریباً چار مہینے تک علیل رہے۔ ایک روز فرمانے لگے ۔

"امروز در تمام سرج سفر کشیدیم خوب شد کہ بمنزل رسیدیم"[۴]

حاضرین حیران ہو گئے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ خواجہ گل محمد احمد پوری یہ الفاظ سن کر رونے لگے اسی دن شاہ صاحب نے وصال فرمایا۔ شدانی سے کوٹ مٹھن لا کر سپرد خاک کیا گیا۔ ۸ رجب ۱۲۲۹ھ کو یہ واقعہ پیش آیا۔ تاریخ وصال ہے ؎

دل ز داغِ دردِ پُر سوز و لہب	جاں بلب شد چوں سخن گوید بلب
رفت از دارِ فنا سوئے بقا	رہبرِ دینِ ھُدیٰ عالی نسب
مظہرِ نورِ محمد، فخرِ دیں	شہ محمد عاقل، محبوب رب
ہادیِ خلق خدا رفت از جہاں	حسرتا دردا دریغا صد عجب
آہ وا ویلا و صد افسوس و درد	کز جہاں نورِ جہاں شد محتجب

[۱] تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۴۴ [۲] تکملہ۔ ص ۱۹۵ [۳] تکملہ سیر الاولیاء۔ ص ۱۴۴۔ مناقب فریدی۔ ص ۵۵ [۴] تکملہ ص ۱۴۳

خم تہی گشت و نماندہ صاف درد — درد باقی بہر مست و مضطرب
چونکہ تاریخ و مہ سال وصال — از دل پر درد خود کردم طلب
سر ز جیب بے خودی بر کرد و گفت — روز ہشتم بود از ماہِ رجب
سال ۱۲۲۹ھ

۱؎ تکملہ سیر الاولیاء، ص ۱۵۳

مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ

از

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

(بسلسلۂ گذشتہ)

"جمہور متکلمین اشاعرہ اور معتزلہ دونوں ہی کی طرف یہی خیال کتابوں میں منسوب کیا گیا ہے۔"
(عقد الجید صفحہ ۱۱)

مسئلہ کو سمجھاتے ہوئے ارقام فرمایا ہے کہ

ان اختلافات کی مثال ایسی ہے جیسے حدیثوں میں آیا ہے کہ

اُنزِلَ القرآنُ علیٰ سبعۃِ اَحرُفٍ قرآن سات (یعنی بہت سے) حروف پر نازل ہوا ہے

آخر ہم قرآنی الفاظ کی قراءتوں کی مختلف شکلوں کو جیسے صحیح سمجھتے ہیں اجتہادی مسائل کے اختلافات کے ہر پہلو کو صحیح قرار دینے میں کیا دشواری پیش آئے گی،

بہرحال سلف سے خلف تک کتابوں میں بھی لوگ لکھتے چلے آئے ہیں، اور اول سے آخر تک مسلمانوں کی فہم عمومی کا عملی مذاق بھی یہی رہا ہے، تقلید تو کوئی شبہ نہیں لوگ کسی ایک امام کی ہی کرتے رہے ہیں، لیکن احترامی تعلقات اجتہاد و تفقہ کے سارے ائمہ کے ساتھ سبھوں نے مسلسل باقی رکھے ہیں۔ سب ہی کو قبولان حق اور دین کے راست باز پیغمبر کے وفادار بزرگوں میں شمار کرتے رہے ہیں۔

لیکن بایں ہمہ اس کا اعتراف بھی واقعہ کا اعتراف ہوگا، کہ خاص حالات کے زیر اثر کبھی کبھی مسلمانوں پر ایسے خفقانی دورے بھی پڑے ہیں، جن میں دیکھا گیا ہے کہ روح سے بے تعلق ہو کر بیک دماغوں کا کوئی طبقہ یا گروہ دین کے صرف بیرونی خط و خال نوک پلک کے سنوارنے پر بے جا اصرار کر رہا ہے۔ غلو میں بڑھتے ہوئے اس حد تک پہنچ گیا کہ عام مسلمانوں کے لئے اس گروہ کا وجود باعث فتنہ و فساد، افتراق و شقاق بن گیا۔ نہ جاننے والے عموماً اس کی ذمہ داری فقہی اختلافات کے قصوں کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

حالانکہ سچ پوچھئے تو ہر آبادی میں کچھ لوگ ایک خاص قسم کے نفسیاتی مرض، اور ذہنی روگ کے شکار ہوتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ قدرتِ حق سے کہیں کسی سرکاری ملازمت کے حاصل کرنے میں مثلاً کامیاب ہو گئے تو ان کی زندگی سمٹ سمٹا کر اسی ملازمت اور ملازمت کے قصوں میں کھپ جاتی ہے سرکاری ملازم کے جو فرائض ہیں۔ کہ وقت پر کچہری میں آدمی حاضر ہو، خدمت جو اس کے سپرد کی گئی ہے، دیانت، دامانت کے ساتھ اس کے حقوق ادا کرے، لیکن ظاہر ہے کہ کچہریوں کا ملازم صرف کچہریوں کا ملازم ہی نہیں ہوتا وہ اپنے بچوں کا باپ بھی ہے۔ بیوی کا شوہر بھی ہے، عزیزوں اور قریبوں کا رشتہ دار بھی ہے، سوسائٹی کا ایک فرد بھی ہے، الغرض کچہری کی زندگی کے سوا اور بھی بیسیوں شعبوں سے اس کا تعلق ہے، لیکن مذکورہ بالا نفسیاتی روگ کے بیماروں کی مصیبت یہ ہوتی ہے کہ ان کی ملازمت دفتر کی کرسی اور میز تک محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ اپنی بیوی بچوں میں بھی سرکاری ملازمت کا شعور ان کا گلا پکڑے رہتا ہے، ملنے جلنے والوں کے سامنے بھی وہ سرکاری ملازم کے سوا اور کسی شعور کو اپنے اندر نہیں پاتے، جاگتے بھی ہیں، تو اسی تصور کے ساتھ کہ حکومت کا میں عہدہ دار ہوں، اور سوتے بھی ہیں تو اسی خیال کے ساتھ سوتے ہیں الغرض زندگی کا کوئی لمحہ اس احساس سے ان غریبوں کا خالی نہیں ہوتا، اکثر و بیشتر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ اس قسم کے لوگ درحقیقت اپنی ملازمت کے حقیقی فرائض کی تکمیل سے قاصر ہوتے ہیں، آخر دفتر کے باہر بھی جو سرکاری ملازم ہی بنا رہے گا، تو دفتر کے اندر پہونچ کر نئے فرائض کا شعور اس میں کہاں پیدا ہو سکتا ہے اور اندر پہونچ کر بھی وہ باہر رہے، تو اس قسم کی ذہنیت کا انجام عام حالات میں یہی ہونا بھی چاہئے۔

مذکورہ بالا نفسیاتی مرض کے مریضوں کا ذہنی رشتہ کسی وجہ سے مذہب یا دین کے ساتھ جب قائم ہو جاتا ہے تو اس کے تماشے بھی عجیب ہوتے ہیں۔ اچانک اپنے ہم مذہب افراد کی عمومیت سے دیکھا جاتا ہے، کہ اچک کر باہر ہو گیا، جو کچھ سب مانتے ہیں وہی وہ بھی مانتا ہے، جو کچھ سب جانتے ہیں وہی سب کچھ وہ بھی جانتا ہے لیکن اس نفسیاتی بحران کے زمانہ میں چشم و ابرو کے ہر اشارہ سے یہی ظاہر کرتا ہے کہ دین اور دینیات کے سوا نہ اس کے اندر کچھ باقی رہا ہے اور نہ باہر، حرکت ہو یا سکون، نشست ہو یا برخواست، ہر حال میں ایسا معلوم ہوتا ہے اور شاید دوسروں کو وہ یہی معلوم بھی کرانا چاہتا ہے کہ براہ راست خدا سے اسی کا تعلق قائم ہے مذہب کے واحد

جاگیردار اور دین کے تنہا ٹھیکہ دار کی شکل میں اپنے آپ کو نمایاں کرتا ہے اپنے متعلق طرح طرح کی خوش فہمیوں میں غلطاں و پیچاں رہتا ہے۔

شاید اسی قسم کے نفوس، اور ان کے نفسیاتی مرض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے۔ حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے، تاریخ دمشق میں ابن عساکر نے ان ہی کے حوالے سے یہ قول ان کا نقل کیا ہے،

اقوام یظہر علیہم سرعۃ الانتساب الی اللہ تعالیٰ عند الحوادث و نزول الاحکام فقال ابعد الناس عن اللہ من یدعی الانتساب والقرب واکثرہم الیہ اشارۃ ومسقتھم عنہ ہ [illegible]

کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کو دیکھا جاتا ہے کہ عالم میں جو حوادث پیدا ہوتے ہیں، یا احکام الٰہی جاری ہوتے ہیں ان کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہیں سب سے زیادہ پیش پیش نظر آتے ہیں (ابو سعید نے ان کا ذکر کرکے کہا) جو خدا کی طرف اشارہ کا، اور خدا سے نزدیک ہونے کا دعی ہو وہی سب سے زیادہ خدا سے دور ہے، خدا کے غصہ کا سب سے زیادہ وہی ہے جو سب سے زیادہ (ہر بات میں) اسی کی طرف اشارہ کرتا ہوا دکھائی دے۔

شاید اسی ممقوت و نحوس طبقہ کے انجام کو دیکھ کر مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ

"تم مچھروں کو چھانتے ہو اور اونٹوں کو نگلتے ہو"

ہندوستان میں بھی پچھلے دنوں زوال حکومت کے بعد مسلمانوں پر آفات و مصائب کے جو پہاڑ ٹوٹے ان دنوں میں اور تو جو کچھ ہوا سو ہوا، ساتھ ہی اسلام اور مسلمانوں کی رسوائی کی بعض ناگوار صورتیں اس شکل میں جو پیش آئیں، کہ مسجدوں میں دنگے ہو رہے ہیں، جوتے چل رہے ہیں، گتھم گتھی ہو رہی ہے، ایک دوسرے کو معمولی معمولی باتوں پر مسجدوں سے نکالنے پر اصرار کر رہا ہے، بسا اوقات بے غیرت مسلمانوں کو اپنے دینی مسائل کے جھگڑوں میں انگریزی حکام کے سامنے فیصلہ طلب کرنے کے لئے حاضر ہونا پڑا دین اسلامی کے اختلافی مسائل کے استعمال کی یہ ایک بدترین شکل تھی جو دین کے متعلق اسی قسم کے نازک حساسات والوں کے غلط طریقہ عمل کی پیداوار تھی۔

اسلام کی روح اور دین کے مغز سے بے گانہ ہو کر صرف اسی پر لڑ رہے تھے کہ گو آہستہ آمین کہنا بھی حدیثوں سے ثابت ہے لیکن زیادہ قوی حدیثوں سے ان کا دعوی تھا کہ زور سے آمین کی آواز کا منہ سے نکلنا بھی بہتر ہے، یا بجائے ناف یا زیر ناف کے نماز میں سینے پر ہاتھ باندھا خیال کرتے تھے کہ زیادہ اچھا ہے، رکوع میں جاتے ہوئے یا اس سے اٹھتے ہوئے کوئی ... دونوں ہاتھوں کو نہ اٹھائے تو وہ بھی کہتے تھے کہ اس کی نماز ہو گئی تاہم اٹھانا ہاتھوں کا کہتے تھے کہ زیادہ ثواب کا کام ہے، یہ سب کچھ ماننے کے باوجود ان ہی چند مسئلوں میں جو قیل غیاڑے ہوئے، ہنگامے مچائے گئے، جگ ہنسائیاں ہوئیں وہ بڑی دردناک داستان ہے۔ فقہی اختلافات کے غلط استعمال کی یہ بڑی ہولناک تاریخی مثال ہے۔

اور گو اب یہ جوش و خروش رفتہ رفتہ ٹھنڈا پڑتا چلا جا رہا ہے، لیکن دین کے صحیح احساس کا نتیجہ شاید ہم اس کو کبھی قرار نہیں دے سکتے، وہ تو جو کچھ ہو رہا تھا دینی احساس کی شدت کا نتیجہ تھا، اور اب جو کچھ دیکھا جا رہا ہے، دینی احساس سے بے گانگی کی یہ پیداوار ہے، جیسے جیسے مغربی تمدن کا اثر جاگزیں ہوتا جا رہا ہے دین کے فروعی مسائل تو خیر دور کی چیزیں ہیں، خود اصل دین سے ہی لوگ بے تعلق ہوتے چلے جا رہے ہیں خدا ہی جانتا ہے کہ اس کا آخری انجام کیا ہوگا۔ زوالِ حکومت کی چوٹ سے کچھ چونک پیدا بھی ہوئی تو اس چونک اور تنبیہ کا رخ، اختلافی مسائل کی طرف پھر گیا، ادھر سے رخ کچھ مڑا بھی ہے تو خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ اصل دین ہی کا قصہ (العیاذ باللہ) ختم نہ ہو جائے۔

بہر حال کہنا یہ چاہتا تھا کہ بجائے خود اندرونی اختلافات کے ان قصوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے، البتہ کمیں سبک دماغوں کے اس طبقے نے ان کو بھیانک اور حد سے زیادہ خوفناک بنا دیا۔ جیسا کہ پچھلے دنوں ہندوستان کے مسلمانوں میں زوالِ حکومت سے پیدا ہونے والی بے چینیوں کے سلسلے میں دیکھا گیا تھا، لوگ حیران تھے کہ اچانک یہ ہوا کیا۔ جو حاکم تھے وہ محکوم بن گئے، جن کا سب کچھ تھا ان کا کچھ باقی نہ رہا، پھر کچھ تو مذہب کے ان ہی فروعی مسائل کے سلجھانے میں مشغول ہوئے شاید ان کا احساس تھا کہ ان مسائل سے غفلت کی سزا مسلمانوں کو قدرت کی طرف سے دی گئی ہے لیکن سلجھانے کی ہر کوشش مسائل کو الجھاتی ہی چلی گئی بعضوں نے قصہ کے ساتھ حدیثوں کے قصہ کو بھی اسی لئے ختم کر دینے کا تہیہ کیا اور دعوت دینے لگے کہ

عذاب الٰہی کے ازالہ کی کوئی شکل اس کے سوا نہیں ہے، کہ سب کچھ چھوڑ کر اللہ کی کتاب پر مسلمانوں کو جمع کر دیا جائے مگر عمل کا جب وقت آیا تو جو ہونا چاہئے تھا وہی ہوا یعنی اللہ کی کتاب کے ساتھ اپنے اوپر بھی جمع کرنے والے مسلمانوں کو جمع کرنے لگے، قرآن کے ساتھ ضروری قرار دیا گیا کہ قرآن سمجھانے والوں کے دماغوں اور بھیجوں پر بھی ایمان لایا جائے

اسی سلسلہ میں بعض نے تو قرآن کے ساتھ ساتھ خود اپنے اوپر ہونے والی وحیوں پر بھی ایمان لانے کی دعوت حکومت سے محروم ہونے والے مسلمانوں کو دینے لگے، کھوئی ہوئی حکومت کے ملنے کی واحد شکل یہی قرار دی گئی کہ محمد رسول اللہ کی وحی کے ساتھ جدید نئی وحی کی روشنی حاصل کی جائے۔ گویا محمدؐ رسالت ناکافی ٹھہرائی گئی یہی خفقانی دورہ تھا، جو مختلف شکلوں میں دلوں اور دماغوں پر پڑتا رہا، اور یہ سب جو کچھ بھی ہوا، ان ہی لوگوں کے ہاتھوں ہوا، جو عام مسلمانوں کے مقابلہ میں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی اختصاصی رشتہ کے مدعی بن بیٹھے تھے۔ دین کی جاگیرداری اور مذہب کی ٹھیکہ داری کا دھوکہ کسی نہ کسی وجہ سے ان کو لگ گیا تھا۔ اسی کے ساتھ تاریخ ہی کی شہادت یہ بھی ہے کہ قصداً و ارادۃً و فرعی اختلافات کے ان نقطوں کو چھیڑ کر کبھی کبھی ناواقف غریب مسلمانوں کے اندر اپنا الو سیدھا کرنے کی نکو ہیدہ کوششیں بھی کی گئیں، بات تبنگڑ بنی، تل بڑھا کر مسہ بنا دیا گیا جو کچھ نہ تھا، قرار دیا گیا کہ وہی سب کچھ ہے۔

یوں ائمہ اجتہاد کے ماننے والوں کو ٹکڑیوں میں بانٹ بانٹ کر اپنی شکم پروری کا سامان بھی ماننا چاہئے کہ بعض سیاہ سینہ افراد نے کیا۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ افتراق کی جو شکلیں مسلمانوں کے اندر زوالِ حکومت کے بعد پیدا ہوئیں۔ ان میں بھی فیکلی کار و بار والوں کا ہاتھ تھا یا نہیں، بلکہ عرض کر چکا ہوں میرا خیال یہی ہے کہ زیادہ تر یا س نفسیاتی روگ کی پیداوار ہے، جس کا بدقسمتی سے اس زمانہ میں دین ہی سے تعلق قایم ہو گیا تھا۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اس جھمیلے میں شکمی عیارانِ شاطر بھی شریک ہو گئے ہوں۔

بہر حال ہندوستان میں دینی جھگڑوں کے یہ تماشے جو دیکھے گئے، دین کے صحیح احساس پر اس کی بنیاد یقیناً قایم نہ تھی۔ اب خواہ تہ میں ان کے وہی نفسیاتی مرض ہو، یا شکمی تقاضے پوشیدہ ہوں۔ تاہم یہ بھی قطعاً بہتان اور افترا ہے کہ بانٹنے والوں نے مسلمانوں کو کلیۃً فقط اپنے پیٹ میں کچھ ڈالنے کے لئے بانٹا تھا بلکہ کہہ سکتا ہوں کہ اکثریت اس جرم سے اپنا حسنِ ظن تو یہی ہے کہ عموماً بری اور پاک تھی،

لیکن پیٹ کے لئے ناواقف مسلمانوں کو کبھی بانٹا نہیں گیا ہے۔ یہ بھی کلیۃً درست نہیں ہے۔ چوتھی صدی ہجری کے ایک بڑے فہیم وذکی، عالم بیدار مغز سیاح علامہ مقدسی ہیں، انھوں نے سیاحت کے بعد سفر کی یادداشتوں کو ایک کتاب کی شکل میں مرتب بھی کردیا تھا۔ کتاب یورپ میں طبع ہوکر شائع بھی ہوچکی ہے، اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے، کہ سارے اسلامی ممالک جن میں مقدسی گھومتے ہیں، وہاں کے مسلمانوں کے دینی رجحانات کا بھی تذکرہ کرتے چلے گئے ہیں۔

خراسان میں جب پہونچے تو لکھا ہے کہ

”حنفی مسلمانوں کو دیکھا کہ ان کو لوگ یہاں مسکیہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور شافعیوں نے اپنے آپ کو صدقیہ کے نام سے مشہور کیا ہے“

آگے ان ہی کا بیان ہے کہ

بینهما عصبیات تهراق فیها الدماء ویدخل بینهما السلطان ص۳۲۶	(حنفیوں اور شافعیوں میں) لاگ ڈانٹ کے تعلقات میں بسا اوقات اسی سلسلہ میں خون ریزیاں بھی ہوئی ہیں، حکومت کو دخل اندازی کی ضرورت ہوئی ہے

خراسان کے شہر سرخس میں پہنچے تو پایا کہ حنفیوں کو یہاں ”[illegible]سیہ“ کہتے ہیں اور شافعیہ اپنے آپ کو [illegible] کہتے ہیں۔ آئے دن ان میں مذہبی جھگڑے ہوتے رہتے ہیں، ہرات میں بھی یہی تماشہ انھوں نے دیکھا۔ حد یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں بھی مقدسی نے لکھا ہے کہ میں نے دیکھا کہ

”وہاں کے جزارین (قصابوں) اور خیاطین (درزیوں) میں خوب جھگڑے ہوتے ہیں۔ قصابوں کی پارٹی سُنی بن کر لڑتی تھی اور درزی شیعہ بن کر ان پر چڑھائی کرتے تھے۔ ص۱۰۲“

عرب ہی کے مقام یمامہ میں پہنچے، تو لکھا ہے کہ

”وہاں دیکھا کہ قصابوں کی ٹولی الگ ہے، اور بدوؤں سے ان کی لاگ ڈانٹ چلی جاتی ہے (دینی جھگڑے بڑھتے ہوئے اس نوبت کو پہنچ چکے ہیں کہ جا[illegible]بد تک کا ان لوگوں نے بٹوارہ کرلیا ہے، جب کوئی مسافر باہر سے ان کے یہاں آتا ہے تو کہتے ہیں کہ ان دونوں فرقوں میں سے جس کے پاس تمہارا جی چاہے

ٹھہر سکتے ہو، ورنہ پھر یہاں سے نکل جاؤ" صـ۱۰۲

بصرہ میں بھی بیان کیا ہے کہ

"شہریوں کو بھی ان ہی مذہبی قصوں کے سلسلے میں لوگوں نے بانٹ رکھا ہے، آپس میں لڑتے رہتے ہیں اور اطراف نواح کے قصبوں، دیہاتوں سے بھی لوگ ہر ایک کی مدد کے لئے آتے ہیں"

کتاب تو اس وقت میرے پاس نہیں ہے، لیکن یاد آتا ہے کہ معجم البلدان میں "رے" جس کے کھنڈروں کے پاس آج کل طہران کا شہر آباد ہو گیا ہے۔ اسی "رے" کے ذیل میں لکھا ہے کہ

"حنفیوں اور شافعیوں کو اس شہر میں لڑایا گیا۔ اور اتنا لڑایا گیا کہ برابر دیہاتوں اور قصبوں سے اپنی اپنی پارٹی کی حمایت کے لئے جرگے آتے رہتے تھے۔ اتنی خونریزیاں ہوئیں کہ بالآخر "رے" کا اکثر حصہ ویران و برباد ہو کر رہ گیا"

لیکن ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے فروعی اختلافات سے ناجائز اور قطعاً ناجائز نفع اٹھانے کی یہ ناپاک کوششیں تھیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں قصابوں، درزیوں، بدوؤں یا اسی قسم کے بے چارے عامیوں، ناواقفوں کو بے وقوف بنا کر کام نکالنے والے اس زمانے میں بھی کام نکالتے تھے اور آج بھی اس راہ میں کامیابی کے لئے عوام کے ان ہی طبقات کو تاکا جاتا ہے ورنہ جہاں کے مسلمان پڑھے لکھے صاحبِ فہم و بصیرت تھے ان ہی مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حریفوں کی وہاں نہیں چلتی تھی۔ خود مقدسی نے اس کی مثالیں بکثرت پیش کی ہیں۔ قیروان جو کسی زمانہ میں افریقہ کا سب سے بڑا مرکزی شہر لاکھوں لاکھ کی آبادی والا تھا۔ مقدسی نے وہاں کے حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس شہر میں حنفی بھی ہیں، اور مالکی بھی جن میں کسی قسم کی کوئی کشمکش اور جھگڑے نہیں سب ایک دوسرے کے ساتھ محبت و الفت کی زندگی بسر کرتے ہیں" صـ۲۲۵

جس سے معلوم ہوا کہ "مذہبی اختلافات" میں بجائے خود فتنہ و فساد شقاق و نفاق کے جراثیم پوشیدہ نہیں ہیں، بلکہ بھرنے والوں کا جب جی چاہتا ہے، یا ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ان میں بھی باہر سے زہر بھر دیتے ہیں اسی جہاں گرد، جہاں بیں سیاح نے ایک موقعہ پر بڑی دلچسپ تجربہ کی عبرت آموز خبر دی ہے، بلخ کے متعلق

یہ لکھ کر کہ

"اس شہر کو مذہبی جھگڑوں سے دیکھا کہ پاک ہے"۔

آگے وہی اطلاع دیتے ہیں کہ

و بلغ عصبیات غیر المذاهب	لیکن بجائے مذہب کے، وہاں غیر مذہبی تعصبات کا
وکذالک فی جمیع البلدان	زور ہے اور اسی طرح تمام شہروں میں کسی نہ کسی قسم
عصبیات ص۳۳۶	کا تعصب پایا ہی جاتا ہے۔

یہ بڑے پتہ کی بات ہے، اور یہی واقعہ ہے، عرض کر چکا ہوں کہ بنی نوع انسانی کے افراد میں وحدت کے ساتھ کثرت اور اختلافات کے پہلوؤں کا پایا جانا، ایک ناگزیر قدرتی واقعہ ہے۔ لیکن اختلاف کے ان پہلوؤں کے استعمال میں آپ کو اختیار ہے، چاہے فتنہ و فساد کے بھڑکانے میں ان کو استعمال کیجئے، چاہے گلہائے رنگ رنگ کو زینتِ چمن قرار دے کر ان سے منافع حاصل کیجئے۔

سادہ دلوں کا ایک گروہ باور کئے ہوئے ہے کہ سارے جھگڑے مذہبی اختلافات ہی سے پیدا ہوتے ہیں جن کے ختم کرنے کی دو ہی صورتیں ہیں یعنی یا تو دنیا کو مذہب اور دین کے عنصر سے کلیتہً خالی کر دیا جائے اور یہ ممکن نہ ہو سکے، تو دنیا کو جنت بنانے کی ایک شکل احمقوں نے یہ تجویز کی ہے کہ زمین کے ہر حصہ کو کسی خاص دینی فرقہ کا وطن بنا دیا جائے۔ جب یہ ہو جائے گا تو شاید خود بھی یہی باور کئے ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی باور کراتے پھرتے ہیں کہ آئے دن کے جھگڑوں، رگڑوں سے ہمیشہ کے لئے فرصت ہو جائے گی۔

"احمقوں کی جنت" صحیح معنوں میں اگر مالیخولیا کی کوئی شکل ہو سکتی ہے تو شاید یہی تجویز ہو سکتی ہے آپ دیکھ چکے کہ ایک ہی مذہب کے ماننے والوں کو بھی جب بآسانی مختلف ٹولیوں میں بانٹ دیا جا سکتا ہے، اور ایک فرقہ کو لے کر دوسرے فرقہ کے سروں پر ٹپکنے والے بسہولت تمام ٹپک سکتے ہیں۔ تو آخر "ایک مذہب" کی صحیح تعریف کیا کی جاتی ہے، جب حنفیوں کو شافعیوں سے لڑایا جا سکتا ہے ایک کا خون دوسرے کے ہاتھوں بہانے میں بھی کامیابی حاصل کرنے والے کامیابی حاصل کر چکے ہیں تو آخر "دینی وحدت" کا ایسا قالب کون بنا سکتا ہے جس میں قطعاً کسی اختلاف کی سرے سے گنجائش باقی نہ رہے،

پھر جو مذہب کو ختم کر کے انسانوں کے باہمی اختلافات کے قصوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں، مقدسی نے تو کئی سو سال پہلے دیکھا تھا کہ "جہاں مذہبی تعصبات نہ تھے، وہاں غیر مذہبی عصبیتوں کی بنیاد پر لوگ آپس میں الجھے ہوئے تھے" لیکن ہم تو اپنی آنکھوں سے آج دیکھ رہے ہیں۔ ہماری صدی ہی اسی تماشے میں گذر رہی ہے، کہ ایک ہی دین، ایک نبی، ایک کتاب، کے ماننے والے بلکہ ایک ہی رنگ تقریباً ایک ہی نسل والے ٹھہر ٹھہر کر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے ہیں، لاکھوں ہی نہیں بلکہ کروڑوں کی تعداد میں مقتولوں کی فہرستیں مسلسل بنتی چلی جا رہی ہیں، تقسیم کے نئے معمولی معمولی حیلہ تراش لیا جاتا ہے، آخر جب کالے رنگ کے چہرے والوں کو اجلی کھال والوں سے رنگ کے اختلافی پہلو کو ابھار کر ٹکرا دیا جا سکتا ہے تو کسی زمانہ میں پست قد والوں کی ایک صف بنا کر دراز قد والوں سے یا چھوٹے کان والوں کو بڑے کان والوں سے بھڑا دینے کو آپ عجیب بات کیوں سمجھتے ہیں؟ زمین کے فرضی و وہمی ٹکڑے کو وطن کا نام دے کر جب عوام کو کٹوایا جا رہا ہے تو اس قصہ کو گھروں اور پلنگوں تک کیوں نہیں بڑھایا جا سکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ یوں مذہب اور دین سے کسی کا دل بیزار ہو تو پھر یہ دوسری چیز ہے، لیکن لڑائی جھگڑوں کا الزام مذہب کے سر منڈھنا کہ سارے دنگے جھگڑے مذہب سے پیدا ہوتے ہیں اور اسی الزام کو لگا کر سرے سے مذہب ہی کے ختم کر دینے کا وسوسہ جن دلوں میں پیدا ہو رہا ہے، ان کو ہمارے عہد کے ذرا واقعات پر نظر رکھتے ہوئے رائے قائم کرنی چاہیے،

دوسروں سے تو کچھ کہنے کا مجھے حق نہیں لیکن مسلمانوں سے کہنا ہے کہ کم از کم ان کے منہ سے تو مذہبی اختلافات کی نوحہ خوانیاں قطعاً بھلی نہیں معلوم ہوتیں۔

مقدسی نے اپنی اسی کتاب میں مذہبی اختلافات کے قصوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کوفہ کے ایک پرانے بزرگ عمرو بن مرہ کا ایک بڑا پر مغز بیان درج کیا ہے۔ خلاصہ جس کا یہ ہے کہ ایک شخص عمرو بن مرہ کے پاس حاضر ہو کر کہنے لگا کہ جناب والا میرا عجیب حال ہے، اب تک مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں شریک ہو ہو کر الگ ہوتا رہا ہوں ہر فریق اپنی تائید میں قرآن ہی سناتا ہے میں تو ان مذہبی جھگڑوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ بتائیے کہ آخر میں کروں کیا؟

عمرو بن مرہ نے کہا کہ اے شخص سن! تو نے مسلمانوں کے مذہبی اختلافات کا ذکر کیا، میں پوچھتا ہوں تو جواب دیتا جا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے سچے رسول ہیں اور جو کچھ اللہ کے پاس سے لائے سب سچ ہے کیا مسلمانوں کا اس میں اختلاف ہے؟ جواب دیا گیا نہیں۔

قرآن خدا کی کتاب ہے، کیا مسلمانوں کا اس میں اختلاف ہے؟ نہیں۔ پانچ وقتوں کی نمازیں فرض ہیں کیا مسلمانوں کا اس میں اختلاف ہے؟ نہیں۔ کعبہ مسلمانوں کا قبلہ ہے کیا اس میں اختلاف ہے؟ نہیں

کیا رمضان کے مہینے میں روزے فرض ہیں اس میں اختلاف ہے؟ نہیں

بیت اللہ کا حج مسلمانوں پر فرض ہے کیا اس میں اختلاف ہے؟ نہیں

زکوٰۃ فرض ہے اس میں اختلاف ہے؟ نہیں

جنابت (ناپاکی) سے پاک ہونے کے لئے غسل کرنا فرض ہے کیا اس میں اختلاف ہے؟ نہیں

الغرض ابن مرہ مسلسل یوں ہی سوال کرتے جاتے تھے اور جواب میں پوچھنے والا بے چارا نہیں نہیں کہتا رہا تب عمرو بن مرہ نے کہا کہ

"دیکھو بھائی مسلمانوں کا جن مسائل پر اتفاق ہے، محکمات بھی ان ہی کو کہتے ہیں ان کو پکڑو اور اختلافی مسائل میں زیادہ غور و خوض کی ضرورت نہیں، ان کی نوعیت متشابہات کی ہے"

اور آخر میں وصیت کی،،

"اہل کتاب کے بعد دین مسلمانوں کے سپرد کیا گیا، ہمارے پہلوں نے یعنی صحابہ نے دین کو جس شکل میں مانا اور برتا بس ان ہی کا طریق کار اور ان ہی کا شیوہ اختیار کر کے مطمئن ہو جانا چاہئے۔

المقدسی نے ابن مرہ کے اس بیان کو نقل کر کے ایک قاضی صاحب کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ جن جن لوگوں سے میں اب تک ملا ہوں۔ ان میں سب سے زیادہ اثر پذیر ان ہی سے ہوا،

ان کی مجلس میں فروعی اور فقہی اختلافات کا ذکر چھڑا تو میں نے دیکھا کہ قبلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہی فرما رہے ہیں:-

من صلی ھٰذہ القبلۃ فھم اخواننا — اس قبلہ کی طرف رخ کر کے جو نماز پڑھتے ہیں وہ ہمارے مسلمان بھائی ہیں۔

المسطور ص ۳۶ احسن التقاسیم

آخر میں "المقدسی" نے اپنے ان احساسات کو درج کر کے ان اختلافات کی بحث ختم کر دی ہے،

هذا التعصب الذی تری انما
ثورة الجهال والمسرفون من القصاص
وغيرهم واما الامة فعلى ما ذكرت
ص ۳۶۷

تعصبات اور تنگ نظریاں جنہیں تم دیکھتے ہو وہ اہل
یہ شورش جاہلوں کی پھیلائی ہوئی ہے اور قصہ کہانیاں
سنانے والے واعظوں کی حدود سے متجاوز بیانات
کے نتائج ہیں لیکن عام اسلامی امت کو ان قصوں سے
کوئی تعلق نہیں۔

فقیر بھی یہی عرض کرتا چلا آ رہا ہے، اسی پر اپنے اس مقالہ کو ختم کرتا ہوں۔ واللہ ولی الامر والتوفیق وعلی اللہ قصد السبیل ومنها جائر ولو شاء لهدا کم اجمعین۔

رحمت عالم صلعم کا پیش کردہ نظام حیات

۱ حصہ

(مولانا محمد ظفیر الدین صاحب استاذ دار العلوم معینیہ ساسنگھ)

آج دنیا ایک ایسے نظام حیات کے لئے سرگرداں ہے، جو اسے تمام شعبہ جات زندگی میں طمانیت کی دولت وافر عطا کر دے، اور جس نظام اجتماع و تمدن میں عدل و مساوات کی حکمرانی ہو، جہاں افراط و تفریط کو چھوڑ کر اعتدال و توازن قایم ہو۔ انسانیت کا احترام و اکرام ہو، دھرم اور مذہب کے نام پر فتنہ و فساد کی گرم بازاری نہ ہو، نظام معیشت میں ہمواری ہو اور طبقات انسانی میں کوئی طبقہ افلاس کے قدموں میں کچلتا ہوا نظر نہ آئے، معاشرتی زندگی پاکیزہ اور بدکرداریوں سے پاک ہو، اور تمام انسانوں کی عفت و عصمت کا مکمل تحفظ ہو۔

بلاشبہ دنیا میں اس وقت تک ہزاروں مصلح اور پیغمبر تشریف لائے، اس میں بڑے بڑے انقلابوں اور راہنماؤں نے جنم لیا، اور انسانیت کی فلاح و نجاح کے نام پر اصلاح کی سعی کی مگر اس عظیم الشان جامعیت میں جو ہمہ گیر نظام حیات رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا وہ اور کہیں نظر نہیں آتا ہم آپ کے سامنے آنحضرتؐ کی زندگی اور آپ کے پیغام کا خلاصہ سرسری طور پر پیش کرتے ہیں۔

چالیس سال اپنوں میں | محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس سال کی عمر اپنے آبائی ماحول میں گذاری، اس عرصہ میں آپ نے تجارت کی، ازدواجی زندگی گذاری، بڑوں اور چھوٹوں میں رہے اور عرب اور شہر مکہ کی ہی تہذیب و تمدن میں پرورش پاکر جوان ہوئے، مگر سوال یہ ہے کہ ان کی اس چالیس سالہ زندگی پر کسی کو کوئی جائز اعتراض ہوا؟ کسی نے آپ کے اعمال و اخلاق کا کوئی گلا اور شکوہ کیا؟ آپ کے رہن سہن اور اپنوں کے ساتھ احترام و اکرام اور محبت و شفقت پر کسی نے کوئی حرف گیری کی؟ انسانی لغزشوں اور کذب و افترا کی کسی نے ایک مثال پیش کی؟ ظلم و ستم اور جور و تعدی پر کسی کو نالاں پایا؟ مختصر یہ ہے کہ

آپ کی زندگی کے کسی شعبہ پر کسی ایک متنفس کو بھی (بشرطیکہ وہ قابل اعتماد اور منصف ہو) شکوہ سنج نہیں پائیں گے، بلکہ اس کے برعکس نظر آئے گا۔ تو یہ کہ پورے مکہ والوں کی زبان پر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے امین اور صادق کے پاکیزہ لفظ کے علاوہ دوسرا کوئی لفظ نہیں ہے۔

زندگی کے تیئیس سال مکہ اور مدینہ میں | اب چالیس سال بعد باایں ہمہ اعتماد و اعزاز جب توحید کا لفظ زبانِ وحی ترجمان پر آتا ہے تو مکہ والوں میں ایک عجیب شورش پیدا ہو جاتی ہے، اور مکہ کی تیرہ سال کی زندگی کا نقشہ یہ ہوتا ہے، کہ اپنے غیر ہو گئے، مجلسِ احباب بزم اعداء میں تبدیل ہو گئی، چچا پیچھے پڑ گئے، اہل خاندان نے حمایت سے انکار کر دیا، سردارانِ قریش نے دباؤ ڈالنے کی سعی کی، قوم تند مزاجی اور درشت خوئی سے پیش آئی، قریش نے سخت و سست کہا، قتلِ نبی کی پے در پے جدوجہد کی گئی، صحابہ کرام پر مشقِ ستم جاری رہی، مسلمان خواتین کو زخم لگایا گیا، صاحبزادیؓ کو ہجرت حبشہ پر مجبور ہونا پڑا، منافقوں نے مذاق اڑایا شانۂ مبارک پر غلاظت ڈالی گئی، گردنِ مبارک میں پھندا ڈالا گیا، محمدؐ کی جگہ مذمم سے خطاب کیا گیا، شعب ابی طالب میں قید کر کے ترکِ موالات کیا گیا، جسمِ اطہر لہولہان کیا گیا۔ معراج کی تکذیب کی گئی، فریب دینے کی کوشش کی گئی، بیہودہ مطالبات کئے گئے، اور بالآخر ہجرت پر مجبور کیا گیا، ہجرت کر کے نکلے تو تعاقب کیا گیا، گرفتاری پر انعام و اکرام کا اعلان کیا گیا اور کاشانۂ نبوی پر پہرہ لگایا گیا، جو چند گنے چنے مسلمان ہوتے تھے سب نے وطنِ عزیز کو سلام رخصت کیا اور مدینہ منورہ جا پہنچے،

مدینہ منورہ پہنچے تو تعمیری کام کی طرف توجہ دی مگر مدینہ کی دس سال کی زندگی میں آپ کو یہ سن کر حیرت ہو گی، کہ یہود و منافقین اور کفارِ مکہ سے چھوٹی بڑی ۸۲ لڑائیاں لڑنی پڑیں، عزیز چچا اور رفیقہ حیات کی موت کا غم مکہ میں اٹھا چکے تھے، یہاں بھی کتنے عزیزوں کی موت کا صدمہ برداشت کرنا پڑا، پھر صحابہ کرام کی اچانک شہادت کا رنج والم، حضرت حمزہؓ کی شہادت کا صدمۂ عظیم اور ان کی لاش کے ساتھ وحشیانہ سلوک کا درد، اور دوسری اذیتیں علاوہ ہیں۔

تعلیمات نبوی | ۲۳ سال کی مختصر مدت اور مصائب اور دوسری مصروفیتوں کا یہ ہجوم مگر بتانا یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باایں ہمہ افکار و مصائب دنیا کو کیا تعلیمات دیں، ان کی کیسی اصلاح

کی، ان کے انتشار و تشتت کو کیوں کر دور کیا، سالہا سال کی جنگ کو صلح اور آشتی سے کیسے بدلا، اور گری ہوئی انسانیت کو بام رفعت تک کس طرح پہنچایا،

انسانیت کا مقام | انسانیت دم توڑ چکی تھی اور آدمیت رسوا ہو رہی تھی، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم پہلے شخص تھے۔ جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بعد انسانوں کو ہدایت کی مشعل دکھائی اور بتایا کہ ساری کائنات انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے، زمین و آسمان، چاند و سورج سب انسان کے اطاعت گذار ہیں، دنیا کی تمام چھوٹی بڑی چیزیں انسان کے فائدہ کے لئے ہیں، انسانیت کا مقام سب سے بلند اور عظیم ہے، آپ نے اعلان کیا۔

سَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ	اور تمہارے کام میں اس نے رات، دن، سورج اور چاند
وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرَاتٌ بِأَمْرِهِ إِنَّ	کو لگا دیا ہے اور ستارے اس کے حکم سے کام میں لگے ہیں
فِي ذَالِكَ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ (نحل ۲)	اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں

انسانوں کو توہم پرستی سے نکالا، اور بتایا کہ انسان اپنی خلقت میں سب سے اشرف ہے، خوبصورتی اور وضع قطع میں دنیا کی کوئی چیز انسان کے مد مقابل نہیں ہے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کی طرف سے اعلان فرمایا۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (والتین)	بے شبہ ہم نے آدمی کو بہترین انداز سے پر بنایا

مرکزیت و اجتماعیت | انسان میں خود اعتمادی پیدا کی اور بتایا کہ تم سے اوپر کوئی ہے تو وہ صرف خدا کی ذات ہے اور تم اسی کی پرستش کے لئے پیدا کئے گئے ہو، وحی محمدی نے اعلان کیا۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ	اور میں نے آدمی اور جن جو پیدا کیا سو اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا۔

اور یہ انسان کا مرکزی نقطہ اسی ایک ذات کو قرار دیا، جس نے کائنات کو وجود بخشا اور اسی مرکز پر لا کر سب میں یگانگت اور اتحاد پیدا کیا، انتشار و تشتت کو دور کیا، اور سب کے لئے لا الٰہ الا اللہ، محمد رسول اللہ کی تصدیق و اقرار کو بنیاد قرار دیا جس میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ	اے اہل کتاب، آؤ ایک بات کی طرف جو ہم میں اور
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا	تم میں برابر ہے، کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں
نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا	اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور اللہ کے سوا
بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ (آل عمران - ۶۴)	کوئی کسی کو رب نہ بنائے۔

کلمہ توحید میں "محمد رسول اللہ" کا کلمہ شریک کیا گیا، مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اپنی بےکسی کا بیسیوں جگہ اعلان کیا اور اپنی عبدیت کو کبھی بھی الوہیت کے درجہ میں لانے کی سعی نہیں فرمائی بلکہ بےشمار موقعوں پر تاکید فرمائی کہ میں اس کا محض ایک بندہ اور رسول ہوں، اس سے زیادہ میری کوئی حیثیت نہیں۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا	تو کہہ میں بھی تم جیسا ایک آدمی ہوں، میری طرف وحی آتی ہے
إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (کہف)	کہ تمہارا معبود ایک معبود ہے۔

یہ بھی پسند نہیں فرمایا کہ کوئی آپ کی تعظیم کے لئے کھڑا ہو، کسی نے غیب داں بتایا تو اسے روک دیا، کہ اس طرح مت کہو، یہ کوئی مخفی بات نہیں ہے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی زندگی گذاری، پتھر اٹھائے، خندق کھودی، لکڑی توڑی، رات رات بھر اللہ تعالیٰ کی عبادت کی، دوسروں سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے خود ڈرتے رہے، الوہیت کا مسئلہ جب اجاگر ہو گیا تو نظام اجتماع کی بنیاد ڈالی اور اپنے ہر عمل سے توحید کا مظاہرہ کیا۔

نظام اجتماع دن رات میں پانچ وقت کی نماز فرض ہوئی، اور ہر بالغ مرد و عورت پر یہ فریضہ ضروری قرار دیا گیا، نماز کے اوقات متعین کئے اور سب کے لئے ایک ہی وقت مقرر کیا، فرض نماز کی ادائیگی کے لئے مسجد کے نام سے ایک خاص گھر بنوایا گیا، یہ جماعت کی نماز جس کو عذر شرعی نہ ہو اس پر ضروری قرار دی اسی کے ساتھ اس میں ایک شخص کو امام اور بقیہ کو مقتدی قرار دیا، اور اس طرح یہ نماز روزانہ اجتماعی زندگی کے لئے راہ عمل قرار پائی، اس میں اخوت و مساوات کی پوری پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی، ہر روز ہر محلہ اور گاؤں کی مسجد میں یہ اجتماع ہوتا ہے، ہفتہ میں تمام محلوں کو ایک وسیع مسجد میں جمع کر دیا، سال میں

شہر اور دیہات کو عیدگاہ میں لاکر اکٹھا کر دیا اور سال کے آخیر مہینہ میں مسجد حرام کے ذریعہ سارے مسلمانوں کو یکجا کر دیا گیا، ان اجتماعوں میں سے کسی میں بھی امیر و غریب، شاہ و گدا، اور شریف و وضیع کا امتیاز باقی نہیں رکھا گیا، بلکہ سب کو ایک صف میں، ایک گھر کے اندر، ایک امام کے پیچھے جمع کر دیا گیا، یہ عملی عبادت آج بھی کسی نہ کسی درجہ میں قائم ہے اس لئے مزید توضیح اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے،

دنیاوی زندگی میں ایک امیر کی امارت ضروری ٹھہرائی گئی، خلیفۃ المسلمین امام منتخب ہوا، اس کی اطاعت اگر اکثریت نے اسے منتخب کر لیا ہے ضروری ہے، اس سے انحراف جرم اور معصیت ہے، خلیفہ خود بھی احکم الحاکمین کے حکم کا تابع ہوگا، اسے کسی الٰہی قانون میں دم مارنے کی گنجائش نہیں، نماز کے متعلق رب العزت کا ارشاد ہے۔

وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ (بقرہ) — اور نماز پڑھنے والوں کے ساتھ نماز پڑھو

مسجد میں ادا کرنے کے متعلق ارشاد ربانی ہے

وَأَقِيمُوا وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ — تم سب اپنا چہرہ ہر مسجد کے پاس سیدھا کرو اور اس کو

وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (اعراف ۳) — خالص اسی کا فرمانبردار ہو کر پکارو۔

جامع مسجد کے نظام اور ہفتہ وار اجتماع کے باب میں قرآن نے پکارا

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ (جمعہ) — اے ایمان والو، نماز جمعہ کی جب اذان پکاری جائے تو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف دوڑ پڑو اور بیچنا چھوڑ دو

سالانہ اجتماع کے لئے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ (حج ۴) — اور حج کے واسطے لوگوں کو پکار دو کہ تری طرف پیدل اور دبلے دبلے اونٹوں پر سوار ہو کر تری طرف آئیں، تمام دور راہوں سے آئیں۔

امامت کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اذا کانوا ثلثۃ فلیؤمہم احدھم واحقہم بالامامۃ اقرأھم (مسلم باب من احق بالامامۃ) | وہ جب تین شخص ہوں تو ان میں ایک کو ان کی امامت کرنی چاہیے اور ان میں مستحق امامت سب سے زیادہ پڑھا ہوا ہے

امام کی اقتدا اور پیروی کی تاکید فرمائی۔

انما جعل الامام لیؤتم بہ (بخاری انما جعل الامام الخ) امام تو بس اسی لئے بنایا گیا ہے کہ اس کی پیروی کی جائے۔

یہ چیزیں اس لئے پیش کی جارہی ہیں کہ غور فرمائیے کہ ان میں کہیں بھی ایسا لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہے جس سے پنچ اور نیچ کی بو آتی ہو، شریف اور کمینہ کی بات معلوم ہوتی ہو، شودر اور برہمن کی تفریق ہو، اور پھر یہ بھی دیکھنے کی بات ہے کہ یہ نظام کیسا تدریجی اور کتنا مرتبط اور ٹھوس ہے۔

خلافت ارضی کے متعلق اعلان ہوا

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ | اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا ہے کہ بالآخر زمین پر ہمارے نیک بندے مالک ہوں گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوا

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْأَرْضِ | اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کیا ہے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کئے کہ البتہ ان کو زمین میں خلیفہ بناویں گے

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمائی

اسمعوا واطیعوا وان ولی علیکم عبد حبشی ذو زبیبۃ | کہ سنو اور فرمانبرداری کرو، گو تم پر کسی حبشی بدصورت غلام کو والی بنادیا جائے۔

طریق انتخاب کے متعلق ارشاد فرمایا گیا

أَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ (شوریٰ۔۴) | وہ آپس کے مشورہ سے کام کرتے ہیں

یہاں بھی بار بار غور کیا جائے کہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خلافت ارضی کے متعلق جو طریقہ اختیار فرمایا اس میں کہیں ذات پات اور زور زبردستی کی گنجائش ہے؟ کہیں بھی مساوات کا دامن

ہاتھ سے چھوڑ گیا ہے؟ صرف صلاحیت اور ایمان وجہِ استحقاق ہے اور انتخاب کا معاملہ باہمی مشورہ پر ہے، جو منتخب ہوگیا، اس کی اطاعت سب پر ضروری قرار دی گئی،

نظامِ مساوات | اسلام کا نظامِ اجتماع دیکھ چکے، اب دیکھئے آپ نے مساوات کا کیسا نظام قائم فرمایا، جو کچھ عرض کیا جارہا ہے اسے گہری تنقیدی نگاہ سے ملاحظہ کیجئے، رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان فرمایا

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (حجرات-۱)   سارے مسلمان تو بس بھائی بھائی ہیں۔

اس کی تشریح فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا لابیض علی اسود ولا لاسود علی ابیض الا بالتقوی، الناس من آدم وآدم من تراب (زاد المعاد جلد ۲)

نہ کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے اور نہ کسی عجمی کو عربی پر، نہ کسی گورے کو کالے پر فضیلت ہے اور نہ کسی کالے کو گورے پر، مگر اصل تقوی ہے تمام لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے ہیں۔

علاوہ ازیں خود قرآن پاک کے ذریعہ وضاحت فرمائی۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً (نساء)

اے لوگو، تم اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مردوں و عورتوں کو پھیلایا

شعوب و قبائل کے متعلق جو مسئلہ پیش تھا اس کو بھی کھول کر بیان فرمایا، اور بتایا کہ شرافت و رذالت خاندان اور قبیلہ میں نہیں ہے، یہ اپنے کردار اور اعمال و اخلاق میں ہے اور عند اللہ شریف وہ ہے جو خدا سے سب سے زیادہ ڈرتا ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اعلان کیا،

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ (حجرات)

اے لوگو: ہم نے تم کو ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا، اور تمہاری ذاتوں اور قبیلوں کو رکھا تاکہ تمہارے آپس کی پہچان ہو اور اللہ کے نزدیک تم میں با عزت وہی ہے جو بڑا متقی ہے

دین کے معاملہ میں نسب و نسل کے بت کو پاش پاش کر ڈالا، اور شرافت اور بزرگی، اتقاء اور خدا ترسی کو قرار دیا، کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ حضرت زیدؓ کی شادی جو نسباً غلام تھے حضرت زینب بنت جحشؓ سے کی، اور اس کا تذکرہ قرآنِ پاک میں محفوظ کر دیا۔ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ان اولیائی المتقون حیث کانوا این کانوا (زاد المعاد) — میرے ہم کنبہ وہ ہیں جو اللہ سے ڈرتے ہیں وہ جہاں کہیں بھی ہو۔

اس نظامِ مساوات میں کہیں سے کوئی خامی نظر آتی ہے؟ ایک منصف مزاج کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ اسلام کا نظامِ مساوات کلاً و جزءاً بے داغ ہے،

نظامِ عدل و انصاف دنیا میں شور بپا ہے کہ عدل و انصاف کی روشنی ہر جگہ چمکتی نظر آتی ہے، یورپ جو اس وقت دنیا میں سب سے بڑا متمدن خطہ ہے وہ ساری ترقی و تہذیب کے باوجود اب تک گورے اور کالے کی تفریق کرتا ہے اور قانون میں جو رعایت گورے کو اس نے دی ہے، کالے کو اس سے محروم رکھا ہے، اپنوں کے لئے جو لطف و کرم ہے غیروں کے لئے نہیں، مگر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نظامِ عدل و انصاف ملاحظہ فرمایئے، کہیں اس میں رو رعایت نظر آتی ہے؟

نظامِ مساوات کے ضمن میں آپ نے عدل کی جلوہ گری دیکھ لی۔ اب غور فرمایئے کہ اپنوں سے نہیں غیروں کے ساتھ عدل و انصاف کا کیا برتاؤ روا رکھا گیا ہے، بڑے بڑے عادل یہاں پہنچ کر جوشِ عصبیت میں مبہوت نظر آتے ہیں، اور قوانین میں ہمواری باقی نہیں رکھتے مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی بھر اس میں افراط و تفریط نہیں کی اور دوست و دشمن دونوں کے ساتھ برابر کا سلوک کیا، عدل و انصاف کے قوانین کا اعلان فرمایا، اور آج نہیں جبکہ اس کا عام شور بپا ہے بلکہ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے جب کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا،

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ (المائدہ۔ ۲) — اے ایمان والو! اللہ کے واسطے انصاف کرو

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا — کسی قوم کی دشمنی کے باعث انصاف کا دامن ہرگز نہ چھوڑو

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (مائدہ ۲۰) عدل کرو کہ پرہیزگاری کے زیادہ قریب یہی بات ہے۔

جور و تعدی پر جب حالات مجبور کر رہے ہوں، انسانی عقل و فہم عدل و انصاف کا ساتھ نہ دے رہی ہو، اس وقت بھی حکم ہے کہ انصاف کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے کیونکہ اسلام کی محبت و عداوت دونوں جچی تلی ہوتی ہیں، کسی موقع پر بے قابو ہونے کی اجازت نہیں ہے، اگر کوئی بے قابو فرض کر لیجیے ہو جائے تو حکم یہ ہے کہ اس کی اس سلسلہ میں ہرگز امداد نہ کی جائے، بلکہ اس کے لئے سب مل کر نیکی اور تقوی کا اس طرح اظہار کریں کہ وہ بے جا غیظ و غضب پر شرمندہ ہو کر راہ راست پر آجائے۔

لَا یَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ (مائدہ)

اس قوم کی دشمنی جو تم کو حرمت والی مسجد سے روکتی تھی اس کا باعث نہ ہو کہ زیادتی کرنے لگو، آپس میں نیک کام اور پرہیزگاری پر مدد کرو، گناہ اور ظلم پر مدد نہ کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، بلا شبہ اللہ کا عذاب سخت ہے

انصاف کے تخت پر جلوہ افروز ہونے کے بعد کبھی معاملہ سنگین آجاتا ہے، احترام و اکرام اور محبت و شفقت ارادوں میں جنبش پیدا کر دیتی ہے اس وقت بھی اجازت نہیں ہے کہ عدل کا دامن تار تار کیا جائے، ارشادِ رب العزت ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ (نساء ۲۰)

اے ایمان والو انصاف پر قایم رہو، اللہ جیسی گواہی دو گو تمہارا یا تمہارے ماں باپ کا اور یا تمہارے قرابت والوں کا نقصان ہو،

یہ اعلان ہی اعلان نہیں ہے عہدِ نبویؐ اور خلافتِ راشدہ کے زمانہ کی تاریخ پڑھ جائیے، وہاں عمل ہی عمل ملیں گے، آپ پڑھیں گے کہ مسلمان اور یہود کا مقدمہ پیش ہوا اور فیصلہ یہود کے حق میں ہوا، تفصیل میں چونکہ جانا نہیں ہے اس لئے واقعات کی تفصیل چھوڑتا ہوں۔

نظام جنگ اور انتقام | جنگ اور انتقام کا نام ہی خوفناک ہے، یہاں اعتدال کا نام شاید کہیں نظر آئے، اگر یقین

کے ساتھ اعتدال دیکھنا ہو تو اسلام کی تاریخ پڑھئے، کہ اسلام نے نظام جنگ کتنا پاکیزہ ترتیب دیا اور انتقام کے لئے کتنا جاذب نظر اور دل نشین اصول مرتب کیا ہے، جزا اور سزاء کے متعلق رب العزت کا ارشاد ہے، کہ درگذر سے کام لیا جائے، اور اگر بدلہ ہی لینا ہو تو برابر، اور ویسا ہی ہو،

جَزَاءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا	برائی کا بدلہ برائی اسی کے برابر ہے، پھر جو معاف کرے اور
وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ	صلح کرے، تو اس کا اللہ کے پاس سے ثواب ہے، بیشک
الظَّالِمِينَ (شوری - ۴)	اس کو زیادتی کرنے والے پسند نہیں،

دوسری جگہ فرمایا اور کیسے دل نشین انداز میں فرمایا کہ کوئی سخت بات کہے یا برا معاملہ کرے تو اس کے ساتھ رفق و ملاطفت سے پیش آنا چاہیے۔

لَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ	نیکی اور بدی برابر نہیں، یں ایسی بات کہو جو اس سے
إِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي	بہتر ہو، پھر ایسا ہو کہ تجھ میں اور جس میں دشمنی تھی گویا گہرا
بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ	دوست قرابت والا ہے، اور یہ بات انہی کو ملتی ہے
حَمِيمٌ وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا	جو تحمل رکھتے ہیں اور یہ بات اسی کو نصیب ہوتی جس
وَمَا يُلَقَّاهَا إِلَّا ذُو حَظٍّ عَظِيمٍ (حم سجدہ ۴)	کی قسمت بڑی ہے۔

عفو اور درگذر کے متعلق ارشاد فرمایا گیا

وَإِنْ تَعْفُوا وَتَصْفَحُوا فَإِنَّ ذَالِكَ	اگر تم معاف کرو اور درگذر کرو تو بے شک یہ عزمت
مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ	کی بات ہے۔

جنگ و قتل کے متعلق فرمایا کہ بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور جو خدا کی یاد میں گوشہ نشین ہوں، ان کو نہ چھیڑو

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ	اور اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے
وَلَا تَعْتَدُوا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ	ہیں اور کسی پر زیادتی نہ کرو، اللہ تعالیٰ بے شک زیادتی
الْمُعْتَدِينَ (بقرہ ۲۳)	کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے

اسلام نے کہیں بھی زیادتی اور جور وظلم کو پسند نہیں کیا، صلح وسلامتی اسلام کے قوام میں داخل ہے، انتقام ومکافات کے سلسلہ میں اس نے بہادری اور احتیاط کی تعلیم دی، ارشاد ہوا کہ جو ہتھیار ڈال دیں اور صلح کے لئے آمادہ ہو جائیں ان پر زیادتی نہ کرو۔

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْا إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلًا (النساء)

سو اگر وہ تم سے علیحدہ رہیں، پھر تم سے نہ لڑیں اور صلح پیش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تم کو ان پر راہ نہیں دی

جہاں جاؤ، وہاں خوب غور وفکر کو کام میں لاؤ، بغیر سوچے سمجھے کوئی کام عجلت میں نہ کر ڈالو قتل وخونریزی کوئی معمولی بات نہیں ہے، اس لئے اسے خوب اچھی طرح تحقیق کر لو، ارشاد باری تعالیٰ ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا (النساء-۱۳)

اے ایمان والو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جب سفر کرو تو تحقیق کر لیا کرو۔

پھر بے رحمی کو بھی راہ نہیں دی ہے، اگر کوئی زبان سے ایسا کلمہ کہے جو اس کے با ایمان ہونے کو بتاتا ہو یا اطاعت کا اعتراف کرے تو اس کو معاف کر دیا جائے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا (النساء-۱۳)

اور جو شخص تم سے سلام علیک کرے اس کو یہ نہ کہو کہ تو مسلمان نہیں۔

فیصلہ تو ظاہر عمل پر ہے باطن کی ذمہ داری حاکم کے ہاتھ میں نہیں ہے اسے اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور فیصلہ جو بھی ہو انصاف کے ساتھ ہو، افراط وتفریط سے پاک اعتدال پر حکم ہے ارشاد ربانی ہے

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (النساء-۸) اور تم لوگوں میں جب فیصلہ کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

اس حکم سے سرمو تجاوز کی اجازت نہیں، تاریخ اسلام میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی۔ غزوۂ احد میں جس خاتون (ہندہ) نے حضرت حمزہؓ کی کچی کلیجی نکال کر چبائی تھی، حضرت ابو دجانہؓ نے اس کے سر پر تلوار اس غزوہ میں رکھ کر اٹھا لی تھی کہ آنحضرت کی اجازت نہیں ہے کہ عورتوں پر تلوار چلائی جائے۔[1]

---

[1] سیرۃ النبی جلد اول بیان غزوۂ احد۔

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے کچھ ہی پہلے ایک لشکر کی تیاری کا حکم دیا تھا جس کا سردار حضرت اسامہ بن زیدؓ کو مقرر فرمایا تھا، ابھی لشکر روانہ بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ وفات فرما گئے، چنانچہ صدیق اکبرؓ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو اسے روانگی کا حکم فرمایا، حضرت ابوبکر صدیقؓ نے حضرت اسامہؓ کو روانہ کرتے ہوئے یہ نصیحتیں فرمائیں۔

"دیکھو خیانت نہ کرنا، دھوکا نہ دینا، مال نہ چھپانا، کسی کے اعضاء کو نہ کاٹنا، بڈھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، کھجور کے درختوں کو نہ جلانا، پھل والے درختوں کو نہ کاٹنا، اور کھانے کی ضرورت کے سوا کسی بکری گائے یا اونٹ کو نہ کاٹنا، تمہارا گذر ایک قوم پر ہوگا، جو دنیا کو چھوڑ کر اپنی خانقاہوں میں بیٹھی ہوگی تم اس سے تعرض نہ کرنا۔"[1]

پھر دنیا جانتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جنگ کے معاملہ میں یہ دستور تھا کہ پہلے مخالفین پر اسلام کی دولت پیش فرماتے اگر اس پر راضی نہیں ہوتے، تو جزیہ کا مطالبہ ہوتا جس کا ماحصل یہ تھا اسلام کی حکومت تسلیم کرلی جائے، اور اس کے بعد آخری درجہ میدان کارزار کا ہوتا، ذمیوں کی تاریخ پڑھی جائے کہ وہ اسلامی حکومت میں کتنے آرام و عافیت کی زندگی گذارتے تھے، ان کی عزت و آبرو کتنی محفوظ ہوتی تھی۔

یہ تھا رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا نظامِ جنگ اور اصولِ انتقام، آج تو بہت سے لوگ جب اسلام کی رحمتیں عام ہوچکی ہیں یہ کہتے نظر آئیں گے کہ جنگ میں وحشت و بربریت نہیں ہونی چاہئے، مگر اس وقت تو کسی کے وہم میں بھی ایسی بات نہیں تھی، جب آنحضرت صلعم یہ نظامِ جنگ مرتب فرما کر پیش کررہے تھے۔

نظامِ معیشت دنیا میں تہلکہ مچا ہوا ہے کہ انسانوں میں ایسا نظامِ عمل ہونا چاہئے، کہ سارے انسان پیٹ بھر کھائیں، پہننے کے لئے ان کو کپڑا میسر ہو اور رہنے کے لئے گھر ہوں، پیٹ کے نام پر بے شمار تحریکیں اٹھتی رہتی ہیں گو نتیجہ کے اعتبار سے کوئی بھی کامیاب نہیں ہوتی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے جو نظامِ معیشت پیش فرمایا، اس میں کوئی بھی بھوکا، ننگا اور بے گھر نہیں رہ سکتا، اس کی عملی مثال خلافتِ راشدہ کا دورِ خلافت موجود ہے،

---

[1] تاریخ ملت صفحہ ۵ ج ۲

اسلام میں زکوٰۃ کو بنیادی حیثیت حاصل ہے، اور ارکانِ خمسہ میں ایک زکوٰۃ بھی ہے، خدا سے ڈرنے والوں کی صفتوں میں ایمان بالغیب کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (بقرہ - ۱) اور جو کچھ ہم نے ان کو روزی دیا، اس سے خرچ کرتے ہیں

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ (بقرہ - ۵) نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیا کرو

قرآن میں بیسیوں جگہ اس کی تکرار ہے، اور یہی وہ زکوٰۃ ہے جس کے بند کر دینے پر صدیق اکبرؓ نے تلوار اٹھائی تھی، وہ سب کچھ ماننے اور کرنے کو آمادہ تھے مگر صرف یہ کہتے تھے کہ نبی کریم صلعم کے بعد زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ بہت سے صحابۂ کرام اس موقع پر پس و پیش میں تھے، کہ وہ کلمہ اسلام پڑھتے ہیں پھر صرف زکوٰۃ کے بند کر دینے پر ان کے خلاف تلوار کس طرح اٹھائیں مگر صدیق اکبرؓ کی عزیمت اور ان کے بیان سے سبھوں کا سینہ کھلا اور سب نے متفقہ طور پر طے کیا کہ جو زکوٰۃ بند کر دے اس سے لڑنا ضروری ہے اور لڑے، صدیق اکبرؓ کی اسی سوجھ پر امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں قام ابوبکر یوم الردۃ مقام الانبیاء (ارتداد کے زمانہ میں حضرت ابوبکرؓ نے نبیوں کا سا کام کیا)

بخاری اور مسلم دونوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کا واقعہ بیان کیا ہے، اس میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لا الٰہ الا اللہ جو کہتے ہیں ان سے قتال کس طرح کیا جائے گا، اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا

واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکاۃ فان الزکاۃ حق المال واللہ لو منعونی عقالا ... لقاتلتھم علی منعہ (ریاض الصالحین ص۲۵۹) خدا کی قسم میں ان سے ضرور قتال کروں گا جو نماز و زکوٰۃ کی فرضیت میں تفریق کرے گا، کیونکہ زکوٰۃ مال کا حق ہے بخدا اگر کوئی مجھ کو زکاۃ کا ایک عقال (رسی) بھی نہ دے گا اس کے روکنے پر بھی ان سے لڑوں گا۔

اس واقعہ سے اہمیت کا اظہار ہے کہ عمل بھی اس پر کس قدر ضروری ہے، ورنہ قرآن پاک میں جس قدر تاکید ہے وہی بہت کافی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ ان کے مالوں سے زکوٰۃ لے، کہ تو ان کو پاک کرے اور

وَتُزَکِّیْھِمْ بِھَا (توبہ - ۱۳) اس کی وجہ سے ان کو بابرکت کرے۔

اور اس زکوٰۃ کا منشا یہ ہے کہ مالداروں سے لے کر حاجتمندوں پر خرچ کی جائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

اِنَّ اللّٰہَ افترض علیھم صدقۃ تؤخذ من اغنیائھم وترد علیٰ فقرائھم متفق علیہ (ریاض الصالحین باب وجوب الزکوٰۃ) بے شک اللہ تعالیٰ نے ان پر زکاۃ فرض کی ہے کہ ان کے مالداروں سے لی جائے اور ان کے حاجتمندوں کو دی جائے۔

زکوٰۃ پر چالیس روپے میں ایک روپیہ، غلہ میں اگر سینچائی نہیں لگی ہے تو دس من میں ایک من یعنی دسواں حصہ جسے اصطلاح میں عُشر کہتے ہیں اور اگر سینچنا پڑا ہے تو اس میں نصف عشر ہے یعنی بیسواں حصہ، اسی طرح ہر پائدار چیز میں زکاۃ ہے جس کی تصریح فقہار نے بتائی ہے تفصیل فقہ اور حدیث کی کتابوں میں دیکھی جائے،

غور فرمائیے صرف زکوٰۃ اور عُشر کی رقم کتنی ہو گی، پورے ملک میں جتنا غلہ پیدا ہوتا ہے اس کا دسواں اور بیسواں حصہ غریبوں کے نام پر نکل جائے گا اور نقد رقم کا چالیسواں حصہ محتاجوں کو مل جائے گا، علاوہ ازیں قرابت داروں کا حق ہے پڑوس کا حق ہے اور دوسرے حقوق ہیں، جن کی تاکید حدیث کی کتابوں میں جگہ جگہ ہے۔

پھر سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میراث کے خدائی قانون کا اعلان فرمایا، سود کو حرام قرار دیا، فریب اور کذب کی کمائی سے منع فرمایا، رشوت کو ناجائز بتایا، اور دوسرے ناجائز شعبوں پر پہرہ بٹھا دیا،

اس کے ساتھ اسلام کا یہ قانون ہے کہ اگر تمام ضروری مدات کی وصولی اور تقسیم کے بعد بھی کچھ لوگ بھوک مر رہے ہوں اور کچھ لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ غلہ اور رقم ہو، تو خلیفہ وقت مالداروں سے فاضل چیز لے کر مفلسوں اور بھوک مرنے والوں پر خرچ کرے،

اس سے بڑھ کر بہتر اور مکمل نظام اور کیا ہو سکتا ہے، کمیونزم میں بھی بالکلیہ مساوات نہیں ہے،

ورنہ کاشتکاری نہ ہو، کارخانے نہ چلیں، باربرداری کا کام انجام نہ پائے، ایک کاشتکاری کرنے والا صدر جمہوریہ جیسا آرام نہیں پا سکے گا اور اس جیسی عزت حاصل نہ کر سکے گا، پھر کمیونزم میں قوتِ کارکردگی مردہ کردی جاتی ہے، لوگوں میں کمانے اور محنت کا صحیح جذبہ باقی نہیں چھوڑا جاتا، اسلام کا نظام ان تمام خامیوں سے پاک ہے،

نظام عفت وعصمت | رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو نظام معیشت پیش فرمایا ہے اس میں کوئی کمزور سے نہیں مر سکتا، پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا دنیا نے عفت وعصمت کی مٹی پلید کر ڈالی تھی، عورتوں کی قدر ومنزلت، ذلت وحقارت میں تبدیل ہو گئی تھی، حسب ونسب کا معاملہ پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا عصمت فروشی عام تھی، رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اس کے خلاف آواز بلند کی، ان کی عفت وعصمت کو بیش قیمت قرار دیا، اس راستے سے جو فتنہ وفساد اٹھتے رہتے تھے ان کو بند کیا، نکاح کا ایک درست طریقہ پیش فرمایا اور اس پر عمل کی تاکید کی، زن وشو کے تعلقات کے لئے قوانین ترتیب دئے، اعلان فرمایا

وَأَنْكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنْكُمْ وَالصَّالِحِينَ	اپنے بے بیاہوں کا اور تمہارے غلام اور لونڈیوں میں
مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِنْ يَكُونُوا	جو لائق ہوں ان کا نکاح کردو اگر وہ مفلس ہوں گے تو
فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَاللَّهُ	اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو غنی کردے گا، اور اللہ
وَاسِعٌ عَلِيمٌ (نور)	کشائش والا ہے سب کچھ جانتا ہے،

اس آیت کا لب ولہجہ بتاتا ہے کہ نکاح صلاحیت کے بعد ضرور کرنا چاہئے، فقر وفاقہ کا خدشہ جو نفس پیدا کرتا رہتا ہے اس طرف سے بھی بڑی حد تک تسکین دلائی گئی ہے کہ اگر مشیت ہے تو رب العزت کوئی نہ کوئی جائز شکل پیدا کردے گا،

جس میں نکاح کی صلاحیت ہی نہ ہو، نہ بالفعل ہو اور نہ بالقوہ بلکہ وہ ہر طرح مجبور ہو، اس کو عفت کی زندگی گذارنے کی ہدایت کی گئی ہے اور اشارہ ہے کہ جہاں پھر صلاحیت ہو نکاح کرلے،

وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا	ایسے لوگ جن کو نکاح کی استعداد نہیں ہے ضبط

حَتّٰی یُغْنِیَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (نور)

کریں تا آنکہ اللہ ان کو اپنے فضل سے غنی کر دے

نکاح ایک بڑی نعمت ہے، انسان اپنی زندگی میں ماں باپ کے بعد بیوی سے ہی آرام و عافیت اور سکون اور چین حاصل کرتا ہے اور اس کے ذریعہ اپنی عفت اور عورتوں کی عصمت کا پورے طور پر تحفظ کر سکتا ہے، رب العالمین فرماتے ہیں

وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (روم ۳۰)

اس کی نشانیوں میں سے یہ بات ہے کہ اس نے تمہارے لئے تمہاری ہی قسم سے جوڑے بنا دئے، تاکہ تم ان کے پاس چین حاصل کرو اور اس نے تمہارے آپس میں پیار اور مہربانی رکھی۔

شہوت کی جگہ کی حفاظت کا حکم فرمایا اور اس پر عمل کرنے والوں کو سراہا، برائی سے روکا اور زیادتی کرنے والوں کی مذمت کی، جہاں ایمان والوں کی فلاح کا تذکرہ ہے ان میں ان کو بھی شمار کیا گیا ہے۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ وَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ (مومنون)

اور جو اپنی شہوت کی جگہ کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں اور لونڈیوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں ان پر کوئی الزام نہیں ہے اور جو کوئی اس کے سوا کی جستجو کرے وہ حد سے بڑھنے والے ہیں۔

عفت و عصمت پر غلط تہمت لگانے والوں کے لئے اسّی دُرّے سزا مقرر کی، اور اس کی گواہی کو مردود قرار دیا۔

وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ یَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِیْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (نور-۱)

جو پاک دامن عورتوں کو تہمت لگائیں اور چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسّی کوڑے مارو اور کبھی ان کی گواہی قبول نہ کرو وہ فاسق لوگ ہیں۔

زنا کار کی سخت سزا مقرر کی، اگر غیر شادی شدہ ہے تو سو درے اور شادی شدہ ہے او خلوت کر چکا ہے تو اس کے لئے سنگ سار کرنے کا حکم ہے، یعنی قوم کے روبرو اس کو پتھر مار کر ہلاک کر دیا جائے

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ (نور-۱)

زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو، اور اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھتے ہو تو تم کو ان دونوں پر اللہ کا حکم جاری کرنے میں ترس نہ آئے اور کچھ مسلمان ان کی سزا کو دیکھتے رہیں

سنگسار کرنے کے باب میں حدیث میں حضرت ماعزؓ کا واقعہ مذکور ہے اور بھی بہت ساری حدیثیں ہیں۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے کتنا عظیم الشان نظام عفت و عصمت پیش فرمایا، اگر اس کے تمام شعبہ جات پر عمل کیا جائے، تو ممکن نہیں، دنیا میں عفت و عصمت کا تحفظ کمزور رہے، اور بہت ساری بد اخلاقیاں مٹ مٹا نہ جائیں،

نظام امن وامان | امن و امان جو اب ایک جنس نایاب بنتی جا رہی ہے، اس کے متعلق بھی رحمت عالم نے جو اصول و قوانین پیش فرمائے وہ ہر طرح مکمل ہیں ان میں کسی جگہ کوئی رخنہ نہیں ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل-۴)

اس جان کو قتل نہ کرو، جس کو اللہ نے حرام کیا ہے مگر حق کے لئے

قاتل کے لئے قصاص کا حکم نافذ فرمایا یعنی مقتول کے بدلہ میں قاتل بھی قتل کر دیا جائے،

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ (بقرہ-۲۲)

اے ایمان والو مقتولوں میں تم پر قصاص (برابری کرنا) فرض ہے، آزاد کے بدلہ آزاد، اور غلام کے بدلہ غلام اور عورت کے بدلے عورت،

اور اس کو عین زندگی بتایا کہ اس کی اہمیت اور فائدوں میں انسان غور و فکر سے کام لے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ (۲۲)

اور اے عقل والو! قصاص میں بڑی زندگی ہے

فسادیوں اور ڈاکوؤں کے متعلق سخت سے سخت سزا تجویز کی، تاکہ امن وامان میں کبھی خلل نہ ہونے پائے جس سے ملک کی ترقی رک جاتی ہے، پبلک میں خوف وہراس پھیل جاتا ہے، سفر اور کہیں آنا جانا دشوار ہوجاتا ہے اور بہت ساری مصیبتیں ٹوٹ پڑتی ہیں۔

إِنَّمَا جَزَآءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْٓا اَوْ يُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ (المائدہ)	ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور ملک میں فساد مچاتے ہیں یہ ہے کہ وہ قتل کئے جائیں، یا پھانسی دئے جائیں یا ان کے ادھر کے ہاتھ اور ادھر کے پاؤں کاٹ ڈالے جائیں، یا ملک سے الگ کردئے جائیں۔

چوری کی سزا کے متعلق رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو رات کا سکون حرام کردیتا ہے اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں

اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ (مائدہ۔۶)

یہ اور اس طرح کے بیسیوں حکم اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے جاری فرمائے جن سے امن وامان کا کامل تحفظ ہوجاتا ہے، کسی کو گنجائش نہیں مل سکتی ہے کہ وہ فتنہ برپا کرے

نظام تعلیم | رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تعلیمات میں جگہ جگہ علم وفضل کی ترغیب دی اور ارتقاء وعروج پر برانگیختہ کیا، دور اول میں مسلمانوں نے حکمت وتہذیب کے جو قابل تقلید نمونے پیش کئے وہ سب رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات وہدایات کا ادنیٰ پرتو تھا، ارشاد ہوا۔

هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الزمر۔۱)	کیا علم والے اور بے علم برابر ہوتے ہیں

کہیں ترغیب کا پہلو اختیار کیا اور فرمایا۔

وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا	تم کو علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا سا

دعا کے جملہ کے طور پر فرمایا گو خاص واقعہ ہی کے سلسلہ میں فرمایا

قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا (طٰہٰ - ۶) تو کہہ اے رب مجھ کو علم میں زیادہ کر

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے علوم وفنون کے تحصیل کی تاکید فرمائی، ارشاد فرمایا

اطلبوا العلم ولو کان بالصین علم حاصل کرو اگر اس کے لئے چین جانا پڑے

علم کی قدر افزائی فرمائی، عالموں کی قدر ومنزلت بیان کی، علم کے فضائل پر بحث فرمائی، اور مسلمانوں اور دوسرے انسانوں کے دل میں یہ حقیقت راسخ کی کہ علم دنیا کی بڑی نعمت اور بیش قیمت دولت ہے ارشاد نبوی ہے،

فقیہ واحد افضل عند اللہ من الف عابد ایک فقیہ اللہ کے نزدیک ہزار عبادت گذاروں سے افضل ہے۔

رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ طالب علم کی روشنائی شہید کے خون سے زیادہ مقدس ہے، طلبہ کے لئے ساری چیزیں دعا کرتی ہیں، حتیٰ کہ مچھلیاں سمندر کی تہ میں ان کے لئے دعا گو ہیں پھر اس کا جو نتیجہ ہوا وہ تاریخ میں پڑھئے، علوم وفنون کا وہ کون سا میدان ہے جہاں مسلمان نظر نہ آتے ہوں اور سائنس وفلسفہ کا کون سا شعبہ ہے جو مسلمانوں کا رہین منت نہیں، پہلے پہل تحقیقات کی تشویق مسلمانوں نے پیدا کی اور کد وکاوش اور جد وجہد کا صور رحمت عالمؐ کا پھونکا ہوا ہے، حدیث کی کتابوں میں ایک مستقل باب "کتاب العلم" کے نام سے موجود ہے،

عقل وفہم سے کام لینے کی ترغیب جتنی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے شاید کسی نے دی ہو، قرآن میں ہر چند سطروں کے بعد افلا تعقلون، افلا یتدبرون، لا یشعرون، لا یفقہون اور فہل من مدکر اور اس طرح کے بیسیوں الفاظ ہیں جو دماغ اور فکر وشعور سے کام لینے کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں اس کا اعتراف غیروں نے بھی کیا ہے۔

نظام اخلاق واعمال | رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاق واعمال کی جو بیش بہا تعلیم دی وہ تو مخصوص آپ ہی کا حصہ ہے فرمایا

انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق میں تو اس لئے بھیجا گیا ہوں کہ مکارم اخلاق کی تکمیل کروں

قرآن پاک نے اعلان کیا

إِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (القلم-۱) — اے محمد بے شک آپ اخلاق کے بڑے درجہ پر ہیں۔

دوسری جگہ کہا۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ (توبہ-۱۶) — تمہارے پاس تم ہی میں کا ایک رسول آیا ہے، تم کو جو تکلیف پہنچتی ہے وہ اس پر شاق گذرتی ہے، تمہاری بھلائی پر حریص ہے، ایمان والوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔

اپنی امت کو مخاطب کرکے فرمایا

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (آل عمران-۱۲) — تم بہترین امت ہو جن کو عالم میں بھیجا گیا، اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو۔

ہلاک ہونے والی کے متعلق ارشاد فرمایا گیا

كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ (المائدہ-۱۱) — وہ آپس میں برے کام سے نہیں روکتے تھے جسے وہ کررہے تھے۔

پھر جزئی مسئلوں میں اخلاق برتنے کی تاکید فرمائی ماں باپ کی تعظیم و تکریم کا حکم فرمایا ان کے لئے دعا خیر کرنے کی تاکید کی اور خلافِ ادب بات کہنے سے منع فرمایا، والدین کے متعلق ارشاد ربانی ہے

لَا تَقُلْ لَّهُمَا اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا (بنی اسرائیل) — تو ان کو ہوں نہ کہہ اور نہ ان کو جھڑک اور ان سے باادب بات کہو

باہمی تعلقات کے متعلق رحمت عالم نے ارشاد فرمایا

لا تقاطعوا ولا تدابروا ولا تباغضوا ولا تحاسدوا وکونوا عباد اللّٰہ اخوانا ولا یحل للمسلم ان یھجر — نہ قطع رحمی کرو، نہ ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے برا کہو، نہ بغض رکھو، اور نہ حسد رکھو، اے اللہ کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ، مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ تین

اخاہ فوق ثلاث (ترمذی ص۱۳ ج۲) دن سے زیادہ اپنے بھائی کو چھوڑ دے،

ضرر رسانی اور تکلیف دہی سے منع کیا اور مکر و فریب سے سختی کے ساتھ روکا، ایک دفعہ فرمایا

ملعون من ضار مومنا او مکر بہ اس پر خدا کی لعنت ہے جو کسی مسلمان کو نقصان پہنچائے

(ترمذی ص۱۶ ج۲) یا فریب دے

جھوٹ بولنے والوں کے لئے وعید شدید بیان فرمائی اور سچ بولنے والوں کو سراہا،

عَلَیْکُمْ بالصدق فان الصدق یھدی الی البر والبر یھدی الی الجنۃ... وایاکم والکذب فان الکذب یھدی الی الفجور والفجور یھدی الی النار (ترمذی ص۱۹ ج۲)

تم پر سچائی ضروری ہے کیونکہ سچ بولنا نیکو کاری کی راہ دکھاتی ہے اور نیکو کاری جنت کی، اور جھوٹ بولنے سے قطعی پرہیز کرو، کیونکہ جھوٹ بدکاری کی طرف لے جاتی ہے اور بدکاری آگ کی طرف،

حسن خلق کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا

خیارکم احسنکم اخلاقا (ترمذی ص۱۹ ج۲) تم میں بہتر وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہے

جو کچھ عرض کیا گیا، وہ سمندر میں سے چند قطرے ہیں، پھر بھی گذارش ہے کہ ان مسئلوں کو گہری نظر سے مطالعہ کریں اور یہ چیز بھی غور کرنے کے لائق ہے، کہ یہ تعلیمات آپ نے دنیا کے سامنے اس وقت پیش کیں، جب وہ فسق و معصیت، ظلم و جبر، عصبیت و جہالت اور شر و فتن میں پھنسی ہوئی تھی، ہدایت اور حقانیت کا چراغ گل ہو چکا تھا، اور روئے زمین آبِ رحمت کے ایک ایک قطرے کو ترس رہی تھی،

سطور بالا میں اسلام کے اجتماعی، معاشرتی، اقتصادی، عمرانی اور مملکتی کارناموں کی طرف اجمالی اشارہ کیا گیا ہے، اس دور میں بھی اس تابناک روشنی اور عالم تاب آفتاب ہدایت کی ضرورت پڑی ہے انشاء اللہ قوم و ملک دونوں کی گتھی اس میں غور و فکر کرنے سے سلجھ سکتی ہے اور اس پر عمل کرنا حکومت و ملت کی ترقی و عروج کا ذریعہ ثابت ہوگا، وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا رَحْمَۃً لِّلْعٰلَمِیْنَ، صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ

حضرت علیؓ کا نکاح ثانی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی

از

(سعید احمد)

لاہور سے ایک بہن لکھتی ہیں :-

"میں چند روز ہوئے ایک کتاب پڑھ رہی تھی کہ اس میں دیکھا ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہ زہرا کی زندگی میں ہی ایک اور لڑکی سے شادی کرنے کا ارادہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات معلوم ہوئی تو آپ کو بڑا غصہ آیا اور آپ نے مسجد میں جا کر مجمع عام کے سامنے اپنے شدید غیظ و غضب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ پیغمبر کی بیٹی کے ہوتے سوتے اس پر ابوجہل کی بیٹی کو کیوں کر سوکن بنا کر لایا جا سکتا ہے"

یہ واقعہ پڑھ کر قدرتی طور پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں، امید ہے کہ آپ ان کا جواب عنایت فرما کر میری تسلی کر دیں گے،

(۱) پہلا سوال تو یہ ہے کہ حضرت علیؓ کے لئے اس سے بڑھ کر فخر کی کوئی بات نہیں ہو سکتی تھی کہ ان کو سرور کائنات کی سب سے زیادہ چہیتی اور لاڈلی بیٹی کے شوہر ہونے کا شرف حاصل تھا اس لئے ان کو حضرت فاطمہ پر سوکن لانے کا خیال پیدا ہی کیوں کر ہوا؟ ایک ادنیٰ درجہ کا مسلمان بھی ایسا خیال نہیں کر سکتا چہ جائیکہ حضرت علی!

(۲) اچھا اگر حضرت علیؓ نے ایسا ارادہ کیا ہی تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر اتنا غصہ کیوں آیا، اور آپ نے یہ کیسے فرمایا کہ "میں ہرگز ایسا نہیں ہونے دوں گا" جب کہ اسلام میں چار عورتوں تک سے نکاح کرنا جائز ہے اور خود آں حضرت تو چار سے بھی زیادہ نکاح کئے تھے" خود کئی کئی نکاح کرنا لیکن اپنے داماد کو سختی کے ساتھ تعدد ازدواج سے روکنا گستاخی معاف انصاف سے بعید اور کم از کم

ایک پیغمبر کی شان سے گری ہوئی بات معلوم ہوتی ہے۔

(۳) پھر سب سے زیادہ جو بات کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کے رسول کی بیٹی اور اللہ کے دشمن کی بیٹی دونوں ایک جگہ اکٹھی نہیں ہو سکتیں! اب سوال یہ ہے کہ ابو جہل چاہے کیسا ہی ہو لیکن اس کی بیٹی تو بہرحال مسلمان تھی اور اسی وجہ سے حضرت علیؓ کا اس کے ساتھ نکاح ہو سکتا تھا، ورنہ مشرکہ سے نکاح جائز ہی کہاں ہے؟ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ مسلمان ہونے کے بعد سب گناہ دھل جاتے ہیں اور یوں بھی کسی شخص کو اس کے ماں باپ کے کفر و شرک یا کسی عمل کی بناء پر طعنہ نہیں دیا جا سکتا۔ جب یہ سب کچھ درست اور مسلم ہے تو پھر آں حضرت نے ابو جہل کی بیٹی کو "اللہ کے دشمن کی بیٹی" کہہ کر اس کی تحقیر کیوں کی!

میں نے جب سے یہ واقعہ پڑھا ہے سچ جانیے کسی کل چین نہیں ہے، سخت پریشان ہوں خدا کے لئے اور باتوں کا آپ جب چاہیں جواب دیں۔ میرے ان سوالات کا جواب جلد دیجئے، ورنہ اگر میرے ایمان میں خلل آگیا تو اس کی ذمہ داری آپ پر ہی ہوگی! آپ کی دور افتادہ

آمنہ عفت۔ لاہور

۱۲؍ستمبر ۵۲ء

جواب: کم فرصتی کی وجہ سے آپ کے سوالات کے جو جوابات سرسری طور پر میرے ذہن میں ہیں وہ لکھتا ہوں اگر ان پر آپ نے ٹھنڈے دماغ سے غور کیا تو امید ہے کہ آپ کو بھی اس معاملہ میں وہی اطمینان خاطر حاصل ہو جائے گا۔ جو مجھ کو ہے اور جس طرح یہ واقعہ اور اس کے تمام متعلقات و تفصیلات کتابوں میں پڑھنے کے باوجود مجھ کو اپنے ایمان میں خلل کے پیدا ہو جانے کا کبھی خطرہ نہیں ہوا اسی طرح آپ کا ایمان بھی شک وشبہ کی خلل اندازی سے محفوظ رہے گا۔

اصل جواب سے پہلے چند مقدمات سمجھ لیجئے:

(۱) اسلام دین فطرت ہے۔ یعنی وہ انسانی فطرت کو مسخ نہیں کرتا۔ فطرت کے جذبات اور اس کی خواہشات کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان خواہشات کی تسکین کے ذرائع و وسائل کا جائزہ لینے کے بعد ان کی

ترتیب وتنظیم کرتا ہے، ان میں جہاں کہیں بے اعتدالی یا اخلاقی گراوٹ ہوتی ہے اسے دور کرتا اور میل وکچیل سے پاک وصاف کرکے انھیں نکھار کر پیش کرتا ہے اس سلسلہ میں وہ مقتضی اور مقتضا اشتہار اور مشتہی دونوں کی حد بندی ضرور کرتا ہے لیکن اشتہا یا اقتضا کو دبانے اور اسے کچل دینے کا حکم نہیں دیتا۔ مثلاً بھوک اور پیاس سے سیری فطرت کا مطالبہ ہے تو اسلام یہ نہیں کرتا کہ بھوک اور پیاس کو جوگیانہ یا سنیاسیانہ طریقوں پر کم کردینے یا ان کو دبانے کا حکم دے بلکہ وہ صرف یہ کرتا ہے کہ ایک طرف حلال اور حرام چیزوں کا فرق بیان کرکے ان کی تشخیص وتعیین کردیتا ہے اور دوسری طرف وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ بھوک لگے تو کتنا اور کس طرح کھانا کھانا چاہئے مثلاً یہ کہ ناپ شناب نہیں کھانا چاہئے جس سے بدہضمی ہو، اور ہاتھ دھوکر بسم اللہ پڑھ کر داہنے ہاتھ سے اللہ کے رزق کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے کھانا چاہئے۔ پس جس طرح اسلام فطرت کے اس تقاضے کو فنا نہیں کرتا بلکہ اس کو پورا کرنے کے اسباب وذرائع کی ترتیب وتنظیم کرتا ہے اسی طرح فطرت کا دوسرا تقاضہ یعنی جنسی خواہش اس کو بھی دبانے یا کچل دینے کا حکم نہیں دیتا۔ بلکہ اس تقاضہ کو کس طرح پورا کرنا چاہئے؟ اس کی نسبت وہ اپنی تعلیمات پیش کرتا ہے۔

(۲) حضرت علیؓ کا کیا ذکر! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبر آخر الزماں اور خدا کے نہایت ہی برگزیدہ محبوب ہونے کے باوجود بشر تھے، قرآن مجید میں اس کا نہایت صراحت کے ساتھ ذکر موجود ہے۔ علاوہ بریں اگر آپ بشر نہ ہوتے تو انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ کیونکر ہو سکتے تھے؟ پھر چونکہ بشر بھی سب سے کامل واکمل تھے اس بناء پر آپ کی بشری طاقتیں اور قوتیں مثلاً آپ کا ذہن اور دماغ، آپ کی بصارت اور سماعت، جسمانی طاقت اور تندرستی، دل کی مضبوطی اور ارادہ کی پختگی سب سے بڑھی ہوئی تھیں اور اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کو اپنی اولاد کے ساتھ جو محبت تھی وہ بھی ماں باپ کی عام محبت سے زیادہ تھی، یہ محبت آپ کو اپنی سب ہی اولاد کے ساتھ تھی لیکن حضرت فاطمہ زہرا کہ چشم وچراغ دودمان نبوی اور گوہر یکتائے درج رسالت تھیں ان سے آپ کو اور بھی زیادہ محبت تھی۔ چنانچہ آپ نے متعدد موقعوں پر فرمایا کہ "فاطمہ میری ہے یہ مجھ سے ہے میری جگر پارہ ہے" "جو شخص اس کو تکلیف پہنچاتا ہے وہ مجھ کو تکلیف پہنچاتا ہے، جو اسے غصہ دلاتا ہے وہ مجھے غصہ دلاتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حضرت

فاطمہؓ کے ساتھ یہ والہانہ محبت آپ کا نقص نہیں بلکہ کمال ہے اور آپ کے بشر کامل ہونے کا ثمرہ ہے

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کرنا یا رکھنا فقہ کی اصطلاح میں فرض و واجب ہو یا نہ ہو مقتضائے ایمان ضرور ہے اور اس ذات ہمہ آیات بینات کے ساتھ جس قدر زیادہ کسی کو عشق ہو گا اسی قدر اس میں ایمان زیادہ ہو گا بلکہ صحیح حدیث میں تو یہ ہے کہ "خدا کی قسم تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے اپنے نفس اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہوں۔" اس حدیث کے ساتھ یہ ایک واقعہ بھی یاد رکھئے کہ حضرت عمرؓ نے یہ ارشاد گرامی سننے کے بعد فرمایا کہ "یا رسول اللہ! آپ بے شک مجھ کو میری اولاد سے اور مال باپ سے زیادہ محبوب ہیں۔ لیکن اب تک میرے اپنے نفس سے زیادہ محبوب نہیں۔" آنحضرت نے یہ سن کر فرمایا: "تو پھر اے عمرؓ! تم اب تک مومن بھی نہیں۔" اس ارشاد کا زبان مبارک سے ادا ہونا تھا کہ حضرت عمرؓ کے دل کی کائنات یک بیک بدل گئی اور فرمایا کہ "الآن یا رسول اللہ" ہاں بے شک اب آپ مجھ کو میرے اپنے نفس سے بھی زیادہ پیارے ہیں" ادھر حضرت عمرؓ نے یہ کہا اور ادھر ارشاد گرامی ہوا "الآن یا عمر!" تو ہاں بے شک تم اب مومن بھی ہو گئے۔

پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ یہ محبت محض عقلی نہیں بلکہ طبعی اور عادی ہونی چاہئے جیسا کہ مندرجہ بالا حدیث اور حضرت عمرؓ کے واقعہ میں "احب من ولدہ و نفسہ" سے معلوم ہوتا ہے

(۴) اس کے ساتھ ہی یہ بھی سمجھ لیجئے کہ محبت عادی و طبعی کا تقاضا کیا ہوتا ہے، فرض کیجئے مجھ کو کسی کے ساتھ غایت محبت ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ شرعی طور پر کسی شے کی اباحت اور اس کے مطلق جواز سے قطع نظر کر کے مجھ کو وہی کرنا چاہئے جس سے میرے محبوب کو خوشی حاصل ہو اور کسی شے کی مطلق اباحت کی آڑ لے کر مجھے وہ کام نہ کرنا چاہئے جو اس کو ناگوار ہو یا تکدر طبع کا باعث ہو، مثلاً مجھ کو طبعاً کوٹ پتلون زیادہ پسند ہے اور شرعاً اس کا پہننا جائز بھی ہے لیکن اگر میرا محبوب اپنے طبعی ذوق کی بنا پر شیروانی زیادہ پسند کرتا ہے تو میری محبت کا یہ تقاضا ہونا چاہئے کہ کوٹ پتلون کے شرعاً مباح اور جائز ہونے کے اور خود اپنی بھی پسند کے باوجود اس کو استعمال نہ کروں اور اس کے

بجائے شیروانی ہی پہنوں۔

(۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے اقوال و اعمال ہیں جن کا تعلق آپ کی پیغمبرانہ حیثیت سے بالکل نہیں ہے، مثلاً بحیثیت شوہر کے آپ نے ازواج مطہرات سے کوئی بات ارشاد فرمائی اولاد سے بحیثیت باپ کے ساتھیوں سے بحیثیت ایک دوست کے آپ نے کچھ فرمایا یا کوئی کام کیا تو اب اس پر غور کرتے وقت ہمیں آپ کی اس حیثیت کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور آپ کی اس حیثیت کو آپ کی پیغمبرانہ حیثیت کے ساتھ خلط ملط کر دینا کسی طرح قرین صواب نہ ہوگا۔ جو معاملہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے وہی معاملہ تمام صحابہ کرام اور حضرت علیؓ کا بھی ہے کہ ان کے کسی قول یا عمل پر غور کرتے وقت ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ وہ کس حیثیت میں کہا گیا یا کیا گیا ہے۔ اور آیا وہ اسلام کے کسی حکم یا اصل سے ٹکراتا ہے یا نہیں! اگر نہیں ٹکراتا تو بس اس کے درست اور بجا ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی ہے اگرچہ ایک عام اور خارجی نقطۂ نظر سے اس میں تھوڑی بہت بے اعتدالی پائی جائے، یہ بے اعتدالی صرف خارجی نقطۂ نظر سے ہوگی لیکن ایک جج کا فرض ہے کہ وہ کسی قول یا فعل پر محاکمہ کرتے وقت اس کے داخلی اسباب و عوامل اور اس کے باطنی محرکات کو بھی سامنے رکھے۔

اگر یہ مقدمات آپ کے ذہن نشین ہوگئے ہیں تو اب اپنے سوالات کے جوابات نمبروار لیجئے۔

(۱) بلاشبہ حضرت علیؓ کے لئے اس سے بڑھ کر فخر کی کوئی بات نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے داماد اور آپ کی سب سے زیادہ محبوب بیٹی کے شوہر تھے لیکن جب آپ حضرت فاطمہ کی اس بلند و اعلیٰ حیثیت پر غور کرتی ہیں تو اس وقت شاید یہ بھول جاتی ہیں کہ حضرت علیؓ ان کے شوہر تھے اور شوہر ہونے کی حیثیت سے ان کا حضرت فاطمہ سے مقدمہ نمبر اول کے بموجب ان توقعات کا قائم رکھنا بجا تھا جو ایک شوہر کو اپنی بیوی سے ہوتی ہیں پھر اس میں بھی ذرا شک نہیں کہ حضرت فاطمہ خود نہایت اعلیٰ اور بلند اخلاق و فضائل کی خاتون تھیں اور اس بناء پر ایک بہترین مثالی بیوی تھیں۔ تاہم دونوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چہیتے اور لاڈلے تھے اور دونوں کے مزاج میں نزاکت بھی تھی اس بناپر دونوں میں کبھی کبھی رنجش بھی ہوجاتی تھی۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خبر ہوتے ہی صلح صفائی کرا دیتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آنحضرت حضرت علیؓ کے

گھر میں تشریف لے گئے، باہر آئے تو زیادہ مسرور تھے لوگوں نے وجہ پوچھی تو فرمایا کہ میں نے ان دو شخصوں (حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ) میں صلح کرا دی ہے جو مجھ کو بہت محبوب ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود حضرت فاطمہؓ کی نازک مزاجی سے واقف تھے اور اس وجہ سے وقتاً فوقتاً حضرت فاطمہؓ کو سمجھاتے بھی رہتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت فاطمہؓ کو کسی بات پر ناگواری ہوئی تو آنحضرت کے پاس حضرت علی کی شکایت لے کر چلیں، پیچھے پیچھے حضرت علیؓ بھی ہولئے۔ حضرت فاطمہؓ نے شکایت کی تو آپ نے فرمایا "بیٹی! تمہیں خود جاننا چاہئے کہ کون شوہر اپنی بیوی کے پاس چپ چاپ چلا آتا ہے" حضرت علیؓ یہ سنکر بہت متاثر ہوئے اور حضرت فاطمہؓ سے بولے "میں اب تمہارے مزاج کے خلاف کوئی بات نہ کروں گا" بہر حال یہ نہ بھولنا چاہئے کہ حضرت علیؓ حضرت فاطمہ کے شوہر تھے۔ اور اگر انہوں نے نکاح ثانی کا ارادہ کیا تو وہ اسی حیثیت سے تھا حضرت فاطمہ اگر جگر گوشۂ رسول تھیں تو حضرت علی کو بھی یہ شرف تھا کہ وہ آپ کے چچا زاد بھائی اور پہلے مسلمان لڑکے اور آنحضرت کے محبوب تھے۔ دونوں کو آنحضرت کی محبت پر ناز تھا اور جب جانبین میں ناز ہوتا ہے تو ایک ہی جگہ رہنے سہنے کے باعث ٹکراؤ بھی ہو ہی جاتا ہے اور جب ٹکراؤ ہوتا ہے تو اگر شوہر کے دل میں کبھی نکاح ثانی کا خیال پیدا ہو جائے تو کون سی مستبعد بات ہے۔ یہ تصادم اور کشمکش بسا اوقات اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ شوہر میں یا بیوی میں باہمی تعلق کے اعتبار سے دو مختلف حیثیتیں جمع ہوں چنانچہ عشق و محبت کی شادیاں جو عام طور پر ناکام رہتی ہیں ان کی وجہ یہ ہی ہوتی ہے کہ بیوی شادی سے قبل محبوبہ اور اس حیثیت سے وہ گویا مخدومہ ہوتی ہے لیکن شادی کے بعد شوہر قوام بن جاتا ہے تو اب معاملہ برعکس ہو جاتا ہے اور کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ (۲) جیسا کہ مقدمہ نمبر ۲ میں بتایا جا چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بشر تھے اور نہایت کامل بشر اور حضرت فاطمہؓ کے ساتھ آپ کو حد درجہ محبت تھی اس بنا پر حضرت علی کے نکاح ثانی کے ارادہ سے آپ کا رنجیدہ ہونا بالکل فطری اور طبعی امر تھا۔ پھر جیسا کہ مقدمہ نمبر ۳ میں کہا گیا اگر حضرت علی کا کوئی فعل اس رنجیدگی کا سبب بنتا تو اس سے خود حضرت علی کا ایمان خطرہ میں پڑ جاتا اس بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ غصہ آیا۔ اور آپ نے مسجد میں جا کر اس کا اعلان فرمایا پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غصہ کی دو وجہیں تھیں ایک کا تعلق آپ کے باپ ہونے کی حیثیت سے تھا اور دوسری کا تعلق آپ کی پیغمبرانہ حیثیت سے تھا۔ اس بنا پر آپ کو جتنا بھی ملال اور رنج ہوتا کم تھا چنانچہ صحیح بخاری میں اس موقع پر آپ کے خطبہ کے جو الفاظ مروی ہیں ان میں آپ نے یہ صاف صاف فرمایا ہے کہ میں حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنے نہیں کھڑا ہوا ہوں۔ ان میں اشارہ اسی بات کی طرف ہے کہ حضور کے ارشاد کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا

کہ آپ حضرت علیؓ کے لئے تعدد ازدواج کو ممنوع قرار دے رہے تھے، بلکہ بات صرف یہ تھی کہ حضرت فاطمہ کے دکھ سے آپ کو دکھ ہوتا اور اس دکھ کا باعث جب حضرت علیؓ بنتے تو ان کا ایمان خطرہ میں پڑ جاتا۔

اللہ اکبر! ذرا غور کیجئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ بالا فقرہ کس طرح آپ کے رسول صادق و مصدوق ہونے کی گواہی دے رہا ہے ورنہ حضرت فاطمہ جیسی نور نظر و لخت جگر بیٹی کا معاملہ! آپ فوراً یہ حکم بھی دے سکتے تھے کہ دختر رسول پر سوکن لانا حرام ہے! یہ سب کچھ نہیں ہے اور آپ صرف ایک محبت سے بھرے باپ کی طرح اپنے طبعی رنج و آزردگی کا اظہار فرما رہے ہیں اور اس کی داد عام مسلمانوں سے چاہتے ہیں۔

بلغ العلیٰ بکمالہ کشف الدجیٰ بجمالہ
حسنت جمیع خصالہ صلوا علیہ وآلہ

اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی سے آپ کا متعجب ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ بعض صحابہ کو اس وقت ہوا تھا جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے ابراہیم پر جان کنی طاری تھی۔ آنحضرت نے ان کو اپنی گود میں لے لیا اور اسی عالم میں باغ رسالت کا وہ غنچہ نو دمیدہ قبل از وقت موت کی باد خزاں کے ایک جھونکے سے کمہلا کے رہ گیا اور مرغ روح کی ایک پرواز نے اس ننھے سے جسم کا رشتہ اس کی جان سے منقطع کر دیا۔ سرور کائنات کے قلب مبارک میں رنج و غم کی ایک لہر اٹھی اور آنکھوں سے بے ساختہ آنسو ٹپک پڑے، کسی نے کہا "یا رسول اللہ! آپ بھی روتے ہیں" تو ارشاد حق بنیاد ہوا کہ "کیا میں محبت کرنیوالا باپ نہ ہوں"۔ پھر جگر گوشہ کی ننھی سی لاش کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے "اے ابراہیم ہم تمہاری جدائی سے غمگین ضرور (المحزونون) ہیں لیکن اللہ کی رضا پر رضا مند ہیں" آپ نے دیکھا یہ ہے وہ مقام عبودیت و بندگی جہاں اسلام فطرت انسانی کو اس کے اصل جذبات و مطالبات کو قائم رکھتے ہوئے لا کھڑا کرتا ہے اور اس کو مسخ کر کے سنیاسی نہیں بننے دیتا۔

(۳) اب رہا آپ کا تیسرا سوال! تو میرے خیال میں اس کی نسبت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں رہی ہے اگر مذکورہ بالا دونوں سوالات کے جوابات آپ کی سمجھ میں آگئے ہیں تو اس تیسرے سوال کا جواب بھی خود بخود آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ اس میں شک نہیں کہ حضرت فاطمہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی

اور حضرت فاطمہؓ کے ساتھ آنحضرتؐ کی غایت محبت کے علم کے باوجود حضرت علیؓ کا نکاح ثانی کا ارادہ ایک بڑی جسارت تھی۔

پھر حضرت علیؓ کے مزاج میں جو خود رائی اور یک گونہ ضد تھی (جو زندگی بھر ان کے کاموں میں ظاہر ہوتی رہی اور جس کی وجہ سے وہ خلافت کے بار گراں سے حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ رضی اللہ عنہما کی طرح کامیابی کے ساتھ عہدہ برا نہیں ہو سکے) آں حضرت اس سے بھی بے خبر نہ تھے۔ اس بنا پر ضرورت تھی کہ حضرت علیؓ کو اس ارادہ سے باز رکھنے کے لئے آنحضرت سخت قدم اٹھاتے۔ مرض جتنا شدید ہوتا ہے دوا بھی اسی قدر تیز دی جاتی ہے پس ابو جہل کی بیٹی کی نسبت آنحضرت کا ارشاد خود اس کی تحقیر کے لئے نہیں ہے۔ بلکہ حضرت علیؓ کو سختی سے نکاح ثانی کے ارادہ سے روکنے کے لئے ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ رضی اللہ عنہما نے حضرت صفیہؓ سے انہیں چھیڑنے کی غرض سے کہا کہ ہم رسول اللہ کی بیوی بھی ہیں اور چچا زاد بہن بھی اس لئے ہم تم سے زیادہ معزز اور آں حضرت کے مقرب ہیں۔" اس کے بعد آنحضرت گھر میں تشریف لائے تو حضرت صفیہ نے شکایت کی اور سارا ماجرا کہہ سنایا، آپ نے فرمایا "صفیہ! تم نے انھیں یہ جواب کیوں نہیں دیا کہ تم مجھ سے زیادہ معزز کیوں کر ہو سکتی ہو! میرے شوہر محمدؐ ہیں میرے باپ موسیٰؑ اور چچا ہارونؑ تھے"۔ ظاہر ہے کہ اس واقعہ میں حضرت صفیہؓ کو آں حضرتؐ کی تلقین کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اسلام میں نسب پر فخر کرنا اور دوسروں کے مقابلہ پر اپنی اس طرح برتری جتانا جائز ہے۔ بلکہ یہ صرف ایک طرح کی چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک تھی اور اس کو بس اسی حد تک محدود رہنا چاہئے، حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ اور حضرت صفیہؓ کی گفتگو تھی۔ اور حضرت صفیہؓ سے آنحضرتؐ کا ارشاد بحیثیت شوہر کے تھا ——

"کوئی تو بات ہنسی کی نکلے" زندگی کا ہر وقت سنجیدہ بنا رہنا بھی آخر کیا زندہ رہنا ہے۔

اسلام میں تعدد ازدواج مباح اور جائز ہے لیکن اس اباحت سے مسلمانوں نے من حیث القوم اسلام کی تعلیمات کی اصل اسپرٹ کے خلاف کس قدر ناجائز فائدہ اٹھایا ہے اس کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کیجئے کتنی بڑی بڑی اور عظیم الشان سلطنتیں تھیں جو محض تعدد ازدواج اور اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ شادی کے باعث مٹ گئیں چنانچہ یہ ہی وجہ تھی کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کو ایک صحابی کے

صحابی کے متعلق معلوم ہوا کہ انہوں نے ایک کتابیہ عورت سے شادی کرلی ہے تو شرعاً اس کے جواز کے باوجود آپ سخت برہم ہوئے اور آپ نے انہیں حکم دیا کہ فوراً طلاق دو اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر تم لوگ اسی طرح ان عورتوں سے شادی بیاہ رچانے لگے تو یہ عرب کی دوشیزہ لڑکیاں کہاں جائیں گی۔ بہرحال تعدّدِ ازدواج اگرچہ مباح ہے لیکن حضرت علیؓ کے نکاح ثانی کے ارادہ پر آنحضرتؐ کی تقریر اس امر پر بھی متنبہ کررہی ہے کہ اس اباحت سے اس وقت فائدہ اٹھانا چاہیئے جب کہ اس کی واقعی کوئی ضرورت ہو۔ اگر حضرت علیؓ کا ایسا ارادہ تھا تو انہیں بتانا چاہیئے تھا کہ حسن وجمال، جوانی اور تندرستی، اخلاق وفضائل، سلیقہ شعاری اور سگھڑاپا، شوہر کی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری۔ اولاد کی حسنِ تربیت اور ان کی نگرانی اعلیٰ حسب اور نسب ان میں سے آخر کون سے جوہر کمال کی حضرت فاطمہؓ میں کمی تھی جس کے باعث وہ ابوجہل کی بیٹی سے شادی کرنے چلے تھے تعددِ ازدواج مباح اور جائز ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ بیوی سے ذرا ناراضگی ہوئی اور شوہر نے جھٹ اس کے چھاتی پر مونگ دلنے کے لئے ایک سوکن لابٹھائی۔ یہ مذہب کے ہمہ گیر احکام کی وسعتوں کی آڑ میں وہ ہوس رانی ہے جس کے خلاف چارہ جوئی قانونی عدالتوں میں نہ ہوسکے تو نہ ہو۔ اللہ اور اس کے پیغمبر کے سامنے پروان نہیں چڑھ سکتی۔

علاوہ بریں آنحضرتؐ نے ابوجہل کی بیٹی اور حضرت فاطمہؓ کا موازنہ کرتے ہوئے جو ارشاد فرمایا غور کیجئے تو اس میں ایک نہایت دقیق اور غامض حقیقت کی طرف اشارا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ اسلام میں تعددِ ازدواج کی جو اجازت ہے وہ مطلقاً نہیں ہے بلکہ دونوں میں عدل قائم رکھنے کی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس عدل کا مطلب عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ دونوں بیویوں میں کھانے پینے اور لباس وغیرہ کے معاملات میں برابری قائم رکھنا اور بس! لیکن آنحضرتؐ کا یہ ارشاد اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عدل بین الزوجتین صرف مذکورۂ بالا اشیاء میں مساوات قائم رکھنا ہی نہیں ہے۔ بلکہ عدل کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ دونوں بیویاں حسب ونسب اور خاندانی اعزاز ووقار کے لحاظ سے برابر ہوں۔ ورنہ فرض کیجئے ایک شوہر کی پہلی بیوی بہت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور اس بنا پر نہایت مہذب۔ شائستہ اور سلیقہ مند عورت ہے۔ اب اگر شوہر اس پر کسی ایسی عورت کو سوکن بنا کر لائے جو سر جھاڑ منھ پھاڑ ہو۔ بدسلیقہ اور بداطوار ہو۔ اور کسی پیچ

خاندان سے ہو تو یہ عدل کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے شوہر گویا پہلی بیوی کے سینہ میں ایک ایسا خنجر بھونک دے رہا ہے جس کی خلش زندگی بھر وہ محسوس کرتی رہے گی اور آخر گھٹ گھٹ کر مرجائے گی۔ جو عورتیں اعلیٰ خاندانوں کی ہوتی ہیں ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر ان کے خاندانی وقار کو صدمہ نہ پہنچے تو موٹا جھوٹا کھاپی کر بھی وہ خوش رہتی ہیں۔ لیکن اگر ان کا خاندانی وقار مجروح ہوتا ہے یا ان کے حسبی ونسبی شرف ومجد کو ٹھیس لگتی ہے تو آپ ان کو لاکھ سونے اور چاندی کے لقمے کھلائیے پھر بھی وہ خوش نہ ہوں گی۔ اس بنا پر آنحضرتؐ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ نکاح ثانی کرتے وقت دونوں عورتوں کی نسبی اور خاندانی مساوات کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے اسی وجہ سے آنحضرتؐ نے اس تقریر میں فرمایا کہ اچھا اگر علیؓ ایسا ہی ابوجہل کی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتے ہیں تو فاطمہؓ کو طلاق دے دیں اور پھر جو چاہیں کریں۔

آپ کے سوالات کے جوابات ختم ہوئے۔ اب آخر میں اتنا اور کہنا ہے کہ یہ آپ نے ایمان میں خلل پڑنے کی ایک ہی کہی۔ اگر خدانہ کرے آپ کا ایمان ایسا ہی خام ہے کہ کسی کتاب میں دوچار سطریں دیکھیں یا کسی سے ادھر ادھر کی دو ایک باتیں سنیں تو اس میں خلل پڑنے لگا تو بس آپ کے ایمان کا خدا ہی والی اور نگہبان! اس وقت بے ساختہ آزاد سبحانی کی ایک غزل جو کبھی بچپن میں کہیں سنی یا پڑھی تھی اس کا ایک شعر یاد آگیا ہے آپ بھی سن لیجئے!

مزاجِ لاابالی اور جوانی!

خدا حافظ ہے ناموسِ حیا کا!

آپ کو سورج کے سورج ہونے کا یقین ہے اور اس پر آپ کا ایمان ہے۔ پھر اگر آپ کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ سورج کی شعاعیں ٹیڑھی ترچھی کیوں پڑتی ہیں۔ سیدھی کیوں نہیں پڑتیں اور نیز یہ کہ ان کا رنگ بنفشئی کیوں ہے۔ سفید کیوں نہیں۔ زمین سورج کے گرد کیوں گھومتی ہے۔ سورج زمین کے گرد کیوں نہیں گھومتا تو سورج پر آپ کے ایمان میں کیوں خلل نہیں پڑتا۔

ادبیات

رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم

جناب روش صدیقی

وہ نذرِ عقیدت و محبت جو لکھنؤ کے حالیہ جشنِ عید میلاد میں بارہ ۱۲ ربیع الاول شریف کو صبح صادق کے انوار کے ساتھ بہ صد ہزار ادب و احترام بارگاہِ رسالت میں پیش کی گئی۔

مرادِ کعبۂ اہلِ وفا، سلام علیک
امامِ قافلۂ انبیا سلام علیک
مکینِ مسندِ عرشِ خدا سلام علیک

بہ ہر شمارِ نفس صد ہزار بار سلام
بہ روحِ پاک تو ہر لمحہ بیشمار سلام

بشر کو تجھ سے تجلّیِ حسنِ ذات ملی
ترے ظہور سے کونین کو حیات ملی
حیات کو ترے قدموں میں کائنات ملی

بلند چشمِ دو عالم سے ہے مقام ترا
مگر فروغِ دو عالم ہے لطفِ عام ترا

گماں کو خوابِ پریشاں بنا دیا تو نے
یقیں کو دل کا نگہباں بنا دیا تو نے
خدا کے دین کو آساں بنا دیا تو نے

فنا کو حسنِ بقا تیرے آستاں سے ملا
جو دو جہاں کو ملا تیرے آستاں سے ملا

تری نگاہ تھی بیداریٔ ضمیرِ حیات
تری نگاہ ازل آفریں، بشیرِ حیات
تری نگاہ ابد تک ہے دستگیرِ حیات
تری نگاہ نے ایسے بشر کئے پیدا
کہ جن کی گرد نے گردوں میں در کئے پیدا

فضیلتِ دلِ صدیقؓ جاوداں تجھ سے
کمالِ عدلِ عمرؓ ہے ابد نشاں تجھ سے
حریم جامعؓ قرآں، ہے ضو فشاں تجھ سے
جلالِ مرتضویؓ میں جمال ہی تیرا
کمالِ خلقِ صحابہؓ کمال ہے تیرا

حیات خاک نشیں کو لباسِ نور دیا
دلوں کو نور دیا، روح کو سرور دیا
جسے سرور دیا، ظرف بھی ضرور دیا
یہ اعتراف رہے گا ضمیرِ امکاں کو
کہ تو نے محرمِ یزداں کیا ہے انساں کو

صہیبِ رومؓ و ابوذرؓ کی تشنگی کیا تھی
بلالؓ و قرنیؓ و سلمانؓ کی بے خودی کیا تھی
رضائے دوست کی صورت تھی زندگی کیا تھی
انھیں زمیں پہ فلک بارگاہ ہونا تھا
ادا شناسِ رسالت پناہ ہونا تھا

ہوائے دامنِ خلقِ عظیم کیا کہئے!

قدم قدم پہ بہشتِ نعیم کیا کہئے!
مقامِ شانِ رؤف الرحیم کیا کہئے!
بشر کے درد کا بارِ گراں اٹھائے ہوئے
امینِ رحمتِ یزداں ہی سر جھکائے ہوئے

عجم کے دیر پرستوں کو دیں پناہ کیا
عرب کے دشت نوردوں کو خضرِ راہ کیا
دلوں کو محرمِ اسرارِ لا الٰہ کیا
غلام آنکھ ملاتے تھے بادشاہوں سے
فقیر کام نہ رکھتے تھے کجکلاہوں سے

وہ درگذر، کہ جفا کار جھک گئے آخر
وہ رحمتیں، کہ دل آزار جھک گئے آخر
وہ حسنِ خیر، کہ اشرار جھک گئے آخر
عدو کمال ترحم سے شرمسار ہوئے
کبھی جو دشمنِ جاں تھے وہ جاں نثار ہوئے

نسیمِ خلد سے بدلا گیا مزاجِ سموم
جو راہ زن تھے، بنے خضرِ کاروانِ علوم
ترے کرم نے غلاموں کو کر دیا مخدوم
یہ فیضِ رحمتِ خیر الانام دیکھ لیا
کہ امیوں کو جہاں کا امام دیکھ لیا

وہ شفقتیں، کہ غریبوں کو اوجِ بخت پہ ناز
وہ حسنِ خلق، کرم میں بھی عجز کا انداز

ملا نہ دہر کو تجھ سا کوئی غریب نواز
جواب میں کسی سائل کو "لا" کہا نہ گیا
درِ کریم سے خالی کوئی گدا نہ گیا

وہ بزمِ شب، وہ تہجد، وہ نورِ بیداری
بیادِ امتِ عاصی، وہ گریہ و زاری
وہ سوزِ دل، وہ تقاضائے رحمتِ باری
وہ سیلِ اشک، سیہ کار خطا شعاروں کا
مقام چشمِ کرم میں گنہگاروں کا

تمام لطف و کرم، تمام فضل و عطا
تمام شفقت و رحمت، تمام جود و سخا
ترے کرم پہ فدا اے حبیبِ خلقِ خدا
بروں کو چشمِ کرم میں چھپا لیا تو نے
بہاروں کو پیار سے اپنا بنا لیا تو نے

متاعِ سینۂ مومن ہے پیام ترا
قریبِ مسندِ رب مجید ہے مقام ترا
نگینِ خاتمِ سرِ خدا ہے نام ترا
بنامِ پاک تو ہر لمحہ بے شمار سلام
بہ بے شمارِ نفس صد ہزار بار سلام

شئون علمیہ

برقی شیشہ

شیشہ اب تک برق کے لئے غیر موصل سمجھا جاتا ہے یعنی شیشے میں سے برق نہیں گزر سکتی لیکن اب ایسا شیشہ ایجاد ہوا ہے جو برق کے لئے موصل ہے۔ چونکہ برق کے گذرنے سے حرارت پیدا ہوتی ہے اس لئے اس شیشے سے ریڈیئٹر اور کافی تیار کرنے کے برتن بنائے جا سکتے ہیں۔

ایک دوسرا کام اس شیشے سے یہ لیا جا سکتا ہے کہ موٹروں میں ہوا روک شیشہ اس شیشے سے بنایا جائے گا۔ اس میں سے برق گذرے گی جس سے اتنی حرارت پیدا ہو جائے گی کہ بارش کے قطرے اس شیشے پر ٹھیرنے نہ پائیں گے۔ عملاً ابھی چند رکاوٹیں دور کرنا باقی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خود شیشہ موصل برق نہیں ہے بلکہ اس پر ایک تہہ شفاف مادے کی چڑھا دی جاتی ہے۔ یہی تہہ دراصل برق کو گذرنے دیتی ہے۔ یہ تہہ ہوا روک شیشے کی بیرونی جانب ہوتی ہے اس لئے موٹر چلانے والا برقی رو کے اثر سے محفوظ رہتا ہے۔ اس لئے اس شیشے کو اندر کی جانب چھوا جا سکتا ہے۔ اس طرح کافی تیار کرنے کا جو برتن ہوتا ہے اس میں یہ مسالہ اندر کی طرف ہوتا ہے لہٰذا اس کو باہر سے ہاتھ لگایا جا سکتا ہے۔

برقی شیشے سے ایک نیا لمپ تیار کیا گیا ہے جس میں نور بردار اشیاء (LUMINOPHORS) استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ اشیاء کم وولٹیج (برقی دباؤ) والی رو کو درست نور میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ ان اشیاء کو ۱۹۴۱ء میں دریافت کیا گیا تھا۔ چنانچہ شفاف کاربورنڈم کی قلمیں سفید روشنی میں دمکنے لگتی ہیں جب متبادل رو (ALTCRRATING CURRCNT) ان میں گذاری جاتی ہے۔

دس برس ادھر کاربورنڈم لمپ ایک تجربہ کے طور پر دکھلائے جاتے تھے۔ باریک تار کے دو جالوں کے درمیان کاربورنڈم کی قلمیں دبا کر بھر دی جاتی تھیں۔ اور ان جالوں کو شیشے کی دو تختیوں کے درمیان مہر بند کر دیا جاتا تھا۔ برقی رو ایک جال سے دوسرے جال تک ان قلموں پر سے ہو کر جاتی تھی۔ یہ لمپ عرض و طول میں کئی گز لمبے تھے۔ ۲۰۰ والٹ کی متبادل رو کی ضرورت تھی۔ روشنی ہلکی دمک کی شکل میں نمودار ہوتی تھی۔

آج اس لمپ کو دوبارہ زندہ کیا گیا ہے لیکن اب برقی شیشہ اور نور بردار اشیاء استعمال کی جاتی ہیں ان اشیا کو غیر موصل پلاسٹک کے ساتھ ملا کر شیشے کی سطح پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ پھر دھات کا ایک پتلا ورق ان اشیاء پر پھیلا دیا جاتا ہے۔ پھر متبادل رو ورق سے شیشے تک ان اشیاء پر سے گذاری جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ اشیاء خوب روشنی دینے لگتے ہیں۔ یہ لمپ بھی چوکور ہے جس کا عرض طول کئی فٹ کا ہوتا ہے۔ اس کی روشنی بھی شیشے والے رخ سے آتی ہے۔ اس لئے تجویزیں ہو رہی ہیں کہ اس شیشے کو مکانوں کی دیواروں اور چھتوں میں استعمال کیا جائے لیکن اس میں ابھی صرفہ بہت ہے۔ اسی طرح چوروں سے حفاظت کے خیال سے اس کو کھڑکیوں میں بھی لگانے کی تجویز ہے۔ کھڑکیوں میں یہ شیشہ باہر کی جانب ہوگا۔ رات کے وقت سب کھڑکیوں میں رو دوڑے گی۔ چونکہ برقی شیشہ گرم بھی ہو جاتا ہے اس لئے جو چور بھی ہاتھ لگائے گا وہ جل ہی جائے گا اور اسے جھٹکا بھی پہنچے گا۔

شیشے کا آدمی

کولون کے عجائب خانہ صحت میں ۲۰ جرمن سائنس دانوں، ڈاکٹروں، مستریوں اور فن کاروں کی ایک جماعت ایسا سامان تیار کر رہی ہے جو آج تک کہیں نہیں بنایا گیا۔ یعنی وہ جسم انسانی کے مختلف اعضاء اور حصے ہر قسم کے اور مختلف اشیاء سے تیار کر رہے ہیں حتیٰ کہ گوشت اور ہڈی سے بھی۔

وہ لوگ بڑے فخر کے ساتھ ایک "شیشے کا آدمی" دکھلاتے ہیں۔ اس کی ہڈیاں ڈھلے ہوئے ایلومینیم کی ہیں اور اس کی جلد ایک خاص قسم کے شیشے کی ہے۔ اور اس کے سب اعضاء نیم شفاف پلاسٹک کے ہیں۔ سب کے سب صحیح پیمانے پر ہیں۔ دماغ سے لے کر شانے تک کے اعضاء اندر سے منطقی ترتیب میں روشن ہوتے ہیں اور یہ "شیشہ زادہ" ہر عضو کی غرض و غایت خود ہی بتلاتا ہے۔ اس کے اندر ۲۰ میل کے رنگین تار ہیں جو ہر نس، شریان، اعصاب وغیرہ کا صحیح مقام روشن کر کے بتلاتے ہیں ساتھ ہی ان کی حیثیت اور ان کا فعل بھی واضح کرتے ہیں۔

کولون کے اس عجائب خانے نے "شیشہ کی عورت" بھی تیار کی ہے جس کی قیمت تقریباً ۲۰۰۰ روپیہ ہے۔

REGISTERED NO. D. 183

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسن خاص جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین جو حضرات پچیس روپئے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلا کسی معاوضہ کے پیش کیا جائیگا

۳۔ معاونین :- جو حضرات اٹھارہ روپئے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا انکی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپئے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ احبّاء نو روپئے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبّاء میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دیجائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ بُرہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہوجاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہیئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپئے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپئے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کراکر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مُرتّب

سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنّفین دہلی کی مذہبی اور تاریخی مطبوعات

ذیل میں ندوۃ المصنفین دہلی کی چند اہم دینی، اصلاحی اور تاریخی کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے،
مفصل فہرست جس میں آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی دفتر سے طلب فرمائیے۔

اسلام میں غلامی کی حقیقت جدید ایڈیشن
جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی
کیے گئے ہیں قیمت سے، مجلد للعہ

سلسلہ تاریخ ملت مختصر وقت میں تاریخ اسلام
کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے یہ سلسلہ نہایت
مفید ہے اسلامی تاریخ کے یہ حصے مستند و معتبر
بھی ہیں اور جامع بھی۔ انداز بیان نکھرا ہوا اور شگفتہ

نبی عربی صلعم (تاریخ ملت کا حصہ اول) جس میں
سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص
ترتیب سے نہایت آسان اور دل نشین انداز میں
یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت ۸؍ مجلد ۱۲؍

خلافتِ راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ)
عہد خلفائے راشدین کے حالات و واقعات کا
دل پذیر بیان قیمت ۸؍ مجلد ۱۲؍

خلافت بنی امیہ (تاریخ ملت کا تیسرا حصہ)
قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ مجلد تین روپے بارہ آنے

خلافت ہسپانیہ (تاریخ ملت کا چوتھا حصہ)
قیمت دو روپے۔ مجلد دو روپے چار آنے

خلافت عباسیہ (جلد اول) (تاریخ ملت کا
پانچواں حصہ) قیمت ۱۲؍ مجلد للعہ

خلافت عباسیہ (جلد دوم) (تاریخ ملت کا
چھٹا حصہ) قیمت للعہ، مجلد صہ

تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ (تاریخ ملت کا ساتواں حصہ)
مصر اور سلاطین مصر کی مکمل تاریخ صفحات ۳۰۰
قیمت تین روپے چار آنے۔ مجلد تین روپے آٹھ آنے

خلافت عثمانیہ تاریخ ملت کا آٹھواں حصہ مجلد ۸؍

فہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم
اضافے کئے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو
مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت ۸؍ مجلد ۸؍

غلامان اسلام اسی سے زیادہ غلامان اسلام
کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی
بیان۔ جدید ایڈیشن قیمت ۸؍ مجلد ۸؍

اخلاق و فلسفۂ اخلاق علم الاخلاق پر
ایک مبسوط اور محققانہ کتاب۔ جدید ایڈیشن جس میں
غیر معمولی اضافے کئے گئے ہیں۔ اور مضامین کی
ترتیب کو زیادہ دل نشین اور سہل کیا گیا ہے۔
قیمت ۶؍ ، مجلد معہ

قصص القرآن جلد اول تیسرا ایڈیشن۔
حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰ و ہارونؑ کے حالات و
واقعات تک۔ قیمت ۶؍ ، مجلد معہ

قصص القرآن جلد دوم حضرت یوشعؑ سے
حضرت یحییٰؑ کے حالات تک تیسرا ایڈیشن قیمت ۳؍ مجلد للعہ

قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات
کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت صہ مجلد ۶؍

بُرہان

جلد سی ام — شمارہ نمبر ۲

فروری ۱۹۵۳ء مطابق جمادی الاوّل ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

ارباب علم دوستوں اور بزرگوں کی طرف سے آئے دن ایسے خطوط ملتے رہتے ہیں جن میں برہان کے مضامین و مقالات کی نسبت حوصلہ افزا کلمات ہوتے ہیں۔ لیکن ان کو شائع کرنا تو کجا ان کا ذکر تک بھی نہیں کیا جاتا۔ لیکن آج ایک خاص مقصد کے پیش نظر ہم ایک خط شائع کرتے ہیں جو برہان کی اشاعت گذشتہ کے ایک مقالہ "حضرت علیؓ کا نکاح ثانی" کے متعلق وصول ہوا ہے یہ عنایت نامہ سردار صاحب ماسٹر جگت سنگھ کا ہے جو اردو کی صحافتی برادری کے ایک نہایت دیرینہ اور بڑے ہی مخلص رکن ہیں جناب موصوف ایک نصف صدی سے "رہنمائے تعلیم" مجلہ کے ذریعہ اردو زبان اور اخلاق و تعلیم کی مفید خدمات بڑے استقلال و ہمت و پامردی کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔ اصل وطن مالوف لاہور ہے ۱۹۴۷ء کے انقلاب سے ترک وطن پر مجبور ہو کر دہلی میں آبسے اور رہنمائے تعلیم اب دہلی سے ہی نکل رہا ہے جناب موصوف سے اس حیثیت کے ساتھ مجھ کو تعارف بچپن سے ہے لیکن افسوس ہے کہ ملاقات کا موقع آج تک ایک مرتبہ بھی نہیں مل سکا۔

بہر حال اس مختصر تعارف کے بعد اب خط کا مضمون سنیئے

"مجھے معاف کیجئے میں آپ کے بے حد قیمتی وقت کا ذرا سا حصہ اس کارڈ کے پڑھنے کے لئے لینے کی جسارت کر رہا ہوں۔ میں مجبور ہوں اور اپنے جذبہ کو پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں کیوں کہ "ہر کس بخیال خویش خبطے دارد" واقعہ یہ ہے کہ میں آپ کے تازہ "برہان" کے مطالعہ سے اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ خواہ مخواہ اس کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔ یوں تو آپ ہر مضمون کو ہی نہایت وضاحت اور صاف دماغی کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور ہمیشہ یہی ہوتا رہتا ہے مگر میں تازہ پرچہ کے مضمون "حضرت علیؓ کا نکاح ثانی" از صفحہ ۴۹ تا صفحہ ۵۸ کو پڑھ کر تو کہہ نہیں سکتا کہ کس درجہ متاثر ہوا ہوں۔ بہن آمنہ عفت کے سوالات کا جواب جو آپ نے دیا ہے وہ نہایت واضح مدلل اور واقعات و

حوالہ جات کی بناء پر دیا ہے۔ مذہبی نقطۂ نگاہ کے علاوہ آپ کے مضمون میں اخلاق کو بھی بہت زیادہ وقار حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ مجھے آپ کے طرز بیان اور بیان کے ذہن نشین کرنے کے طریق پر نہایت مسرت ہو رہی ہے۔ آخر میں بہن محترمہ کی تسلی و تشفی کے لئے سورج والی مثال ہی کافی ثبوت ہے کہ وہ اپنے اعتراضات کو فوراً واپس لے لیں بلکہ غلط فہمی کی بناء پر انھوں نے جو مشکوک صورت حال پیدا کردی ہے اس سے توبہ کرلیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اس مضمون کو اپنے رسالہ "رہنمائے تعلیم" میں درج کرکے بہت سے پڑھنے والوں کو اس اخلاقی سبق سے عبرت حاصل کرنے کا موقع دوں"

جگت سنگھ ۲۰ر جنوری ۵۳ء

اس خط سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ کوئی بات خواہ کیسی ہی مذہبی ہو لیکن انصاف دیانت اور سچائی سے کہی جائے تو اس کا اثر ہر مذہب کے پیرو پر ہوتا ہے بشرطیکہ اس کا دل تعصب کے زنگ سے پاک و صاف ہو، دوسری بات جو بہت زیادہ خوش آیند ہے وہ یہ ہے کہ آمنہ عفت کے بعض الفاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اقدس میں جو کسی قدر گستاخی کا پہلو نکلتا تھا معلوم ہوتا ہے کہ جناب سردار صاحب موصوف کے دل کو ان سے ایسی ہی تکلیف پہنچی ہے جیسی کہ کسی عاشقِ رسول مسلمان کو پہنچ سکتی ہے۔ بلاشبہ موصوف کا یہ جذبہ آپ کی نیک دلی اور نیک طبعی کا سب سے بڑا ثبوت اور لائقِ صد تحسین ہے ہماری موجودہ نسل کو سردار صاحب جیسے بزرگوں کی نیک دلی اور بلند اخلاقی سے سبق لینا چاہئے۔

اب چونکہ ذکر آگیا ہے تو اگرچہ میں طبعاً اس کی اشاعت پسند نہیں کرتا تھا تاہم سردار صاحب اور ان جیسے دوسرے حضرات کی اطلاع کے لئے لکھتا ہوں کہ میں نے عزیزہ آمنہ عفت کو ان کے خط کا جواب اکتوبر ۵۲ء میں ہی لکھ دیا تھا اور میرا ارادہ ہرگز نہیں تھا کہ اسے "برہان" میں شائع کروں۔ لیکن آں عزیزہ نے خط کے اس حصہ کی "برہان" میں اشاعت پر اس قدر اصرار کیا کہ میں مجبور ہوگیا۔ بہرحال ان پر میرے خط کا کیا اثر ہوا اس کا اندازہ ان کے خط کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوگا جو میرے خط کے

جواب میں اکتوبر میں یہ آیا تھا:۔

"نہ جانے آپ نے خط کس گھڑی اور کس دل سے لکھا تھا کہ پڑھتے ہی حالت غیر ہو گئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے سینہ میں خنجر بھونک دیا ہے۔ تین چار دن تو یہ کیفیت رہی کہ جہاں حضور پُر نور یا خاتون جنت حضرت فاطمہؓ کا نام نامی زبان پر آیا اور بے ساختہ آنسو رواں ہو گئے اور ہچکی بندھ گئی گویا میری حالت ہو بہو اس شعر کا مصداق ہو گئی۔

جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے

اب اگرچہ وہ کیفیت نہیں ہے تاہم یہ گنہگار دل حب نبوی و حب اہل بیت کی غیر معمولی سی روشنی سے منور ہے اور میں اکثر درود و سلام پڑھتی رہتی ہوں۔"

امید ہے کہ اس اقتباس کے بعد سردار صاحب اور دوسرے حضرات کو اطمینان ہو جائے گا

جہاں تک اس ناچیز کا تعلق ہے بس یہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر اس کی تحریر سے کسی ایک دل میں بھی عشق و محبت نبوی کا کوئی چراغ روشن ہو سکا ہے تو "شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم"

وَکَفٰی بِہٖ فَخْراً

غلامان اسلام

اسی کے قریب ان صحابہ، تابعین، تبع تابعین، فقہا اور محدثین اور ارباب کشف و کرامات اور اصحاب علم و ادب کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و تدقیق سے جمع کئے گئے ہیں جنہوں نے غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود ملت کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں جنہیں اسلامی سوسائٹی کے ہر دور میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اور سماجی کارنامے اس قدر شاندار اور اس قدر روشن ہیں کہ ان کی غلامی پر آزادی کو رشک کرنے کا حق ہے اور بجا ہے۔ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی محققانہ دلچسپ و معلومات سے بھرپور کتاب اس موضوع پر اب تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی اس کے مطالعہ سے غلامان اسلام کے حیرت انگیز اور شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے دوسرا ایڈیشن صفحات ۶۰۸ بڑی تقطیع قیمت پانچ روپے آٹھ آنے مجلد سے ؏

حکیم سنائیؒ

مترجم

(جناب انعام اللہ خاں صاحب ناصر)

ایڈیٹر روزنامہ الجمعیۃ ۔ دہلی

افغانستان کے مشہور ادیب خلیل اللہ خلیلی نے کئی سال ہوئے حکیم سنائی رحمۃ اللہ علیہ کے سوانح حیات بڑی ہی جانفشانی اور کاوش سے فارسی میں مرتب کئے تھے، انعام اللہ خاں صاحب ناصر نے جو ایک کہنہ مشق اخبار نویس اور پختہ قلم مصنف ہیں اس "محققانہ تذکرے" کو اردو کا قالب دیا اور حق یہ ہے کہ ترجمہ کا حق ادا کر دیا آج اس اہم اور مفید علمی مقالے کے حصہ حصہ حصے "برہان" میں شائع کئے جا رہے ہیں،

ایڈیٹر

نام | تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ سنائی کا نام مجدود تھا اور خود سنائی کے اقوال سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے چنانچہ حدیقے میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

شعر را بلفظ منظوم ۔ زاں قبل نام گشت مجدودم

دوسری جگہ فرماتے ہیں

گو ہی ایں اعتقاد مجدود است ۔ جملہ ہر گفتش آنچہ مقصود است

ایک قصیدے میں ارشاد ہوتا ہے

کہ نام کہن گرد د مجدود سنائی را		نو نو چو بہار آید در وصف تو دیواں ہا

حدیقے کے دیباچۂ منثور میں لکھا ہے کہ میں مجدود بن آدم سنائی ہوں۔ (کہ یہ دیباچہ حکیم سنائی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے) اور بعض لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ سنائی کا نام حسن تھا یہ بات کچھ بے اصل سی معلوم ہوتی ہے اول تو اس لئے کہ سنائی نے ہر جگہ اپنا نام مجدود بتایا ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ ان

کے معاصرین اور بعد کے مورخین میں سے کسی نے سنائی کو حسن کے نام سے یاد نہیں کیا۔ تیسرے اس سبب سے کہ سنائی کی لوحِ مزار پر بلفظ مجدود لکھا ہوا ہے

کنیت | سنائی کی کنیت جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں اور عروضی نے چار مقالہ میں حمداللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ میں اور جامی نے نفحات میں لکھا ہے ابوالمجد تھی۔ چنانچہ حدیقہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں۔

ہر کہ او کشتہ طالبِ مجد است — شفی او ز قول بو المجد است

تخلص سنائی تھا (سنا بمعنی نور و روشنی) حکیم صاحب نے اپنے قصائد اور مثنویات میں یہ تخلص اختیار کیا۔ اور معاصرین اور ان کے اخلاف نے انھیں اسی تخلص سے یاد کیا ایک جگہ خود فرماتے ہیں

سنائی ار تو خدا ترسی و خدائے شناس ترا — سنائی اگر تو خدا سے ڈرتا ہے اور

زمیر چہ باک و ز از شاہ چہ غم — خدا شناس ہے تو تجھے کسی امیر سے کیا خوف اور بادشاہ کی کیا پروا۔

حدیقہ میں کہا ہے:

اے سنائی چو یافتی امکان۔ بنمائی اندر ایں — اے سنائی اگر تجھے قدرت ہے تو اس کلام کو مدلل کر

سخن برہان

مختاری کہتا ہے

سنائی را صلت ہا بخش تا او ہم چناں مدحے — بپردازد کہ ہمتا نیست اندر شعر اقرانش

سنائی کو سیلے بخش تا کہ وہ بھی مدح کرے۔ فن شعر میں کوئی دوسرا اس کا حریف نہیں ہے

مولانا جلال الدین بلخی نے کہا ہے

عطار روح بود و سنائی دو چشم او — ما از پے سنائی و عطار آمدیم

عطار روح تھے اور سنائی ان کی دو آنکھیں۔ ہم ان دونوں کے بعد آئے۔

سلمان نے کہا ہے

سنائی گر مرا دیدے ز ننگ و نام کے گفتے — مسلمانی ز سلمان جوئی و درد دیں زبو دردا

سنائی اگر مجھے دیکھتے تو شرم سے ہرگز یہ نہ کہتے ۔کہ اسلام کی حقیقت سلمان سے معلوم کرو اور دین کا درد بودرداکے دل میں ڈھونڈ۔

لقب سنائی اپنے زمانے میں حکیم کے لقب سے ملقب تھے ۔جیساکہ وہ خود فرماتے ہیں

خاک غزنی چو من نزاد حکیم آتشے باد خوار و آب ندیم

از ہمہ شاعران بہ اصل و بہ فرع من حکیم بقول صاحب شرع

غزنی کی سرزمین میں میری مانند کوئی حکیم پیدا نہیں ہوا ۔اس آگ کی طرح جو ہوا کھاتی ہو اور پانی کو دوست رکھتی ہو۔

تمام شعرا میں اصل اور فرع کے اعتبار سے بھی بقول صاحب شرع حکیم ہوں

جامی لطف علی بیگ ۔آرزو شبلی صاحب خزینۃ الاولیا انھیں حکیم کے لقب سے یاد کرتے ہیں مولانا جلال الدین بلخی کبھی انھیں حکیم اور کبھی شیخ کبیر کے نام سے یاد کرتے ہیں دولت شاہ سمرقندی نے انھیں شیخ العارف کا لقب دیا امین احمد رازی نے انھیں استاذ الحکما لکھا ہے

مولانا یعقوب صرخی نے انھیں اپنی تفسیر میں شیخ کا لقب دیا ۔محمد بن علی اقام اور عبداللطیف عباسی نے حکیم سے ملقب کیا ہے۔

مولد ان کا انھیں کے قول کے مطابق نیز باتفاق مورخیں غزنی تھا ۔ایک جگہ فرماتے ہیں۔

گرچہ مولد مرا ز غزنین است نقش شعرم چو نقش ماچین است

اگرچہ میں غزنی میں پیدا ہوا ہوں ۔لیکن میرا شعر نقش چین کی مانند دل فریب ہے

اور دوسری جگہ ایک معاصر کو مخاطب کرکے کہتے ہیں

شاد باش از من واز خود کہ اندر نظم و نثر نہ خراساں چو توئی زاد است نہ غزنی چو من

مجھ سے اور اپنے سے خوش رہ اس لئے کہ نہ خراسان میں تیری مانند کوئی نثر نگار پیدا ہوا اور نہ غزنی میں میری مانند کوئی شاعر

سنائی کے والد کا نام تمام مورخین کے قول کے مطابق آدم تھا ۔حکیم کے اشعار سے بھی معلوم ہوتا ہے

کہ ان کے والد اپنے زمانے کے بزرگوں میں سے تھے۔ اوران کا خاندان شرافت ونجابت میں ممتاز تھا سنائی نے کہا ہے

پدرے دارم از نژاد کرام از بزرگے کہ ہست آدم نام[1]

میرے والد ایک شریف خاندان کے فرد ہیں اور ان کا نام آدم ہے۔

حکیم ص حسب کارنامہ بلخ میں ثقتہ الملک سے خطاب کرتے ہوئے اپنے والد کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ اہل قرآن ہیں اور تمہارے واسطے اس سے بہتر وسیلہ نہیں ہوسکتا کہ اہل قرآن تمہارا دبیر اور ملازم ہو

نیست زیں بہ وسیلتے بر تو اہل قرآں دبیر و چاکر تو

مذکورہ بالا شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم نہ صرف اپنے زمانے کے شرفاء میں شمار ہوتے تھے بلکہ علماء و دانشمندوں میں بھی انھیں محسوب کیا جاتا تھا اور وہ ثقتہ الملک جیسے وزیر کے دبیر تھے۔ سنائی نے دوسری جگہ اپنی کم آزاری اور شرافتِ نسبی پر فخر کرتے ہوئے یہ کہا کہ یہ خصلت شرافت ونجابت کا نتیجہ ہے

کم آزار و بے رنج پاکیزہ عرضم کہ پاک است الحمد للہ نژادم

میں کسی کو آزار نہ پہنچانے والا اور نیک خو ہوں ۔ الحمد للہ کہ میری نسل شریف ہے

ایک اور قصیدے میں ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے اپنے والد کو صفِ شعراء میں شمار کرتے ہیں اور فرماتے ہیں۔

خاصہ از جودِ تو دارد پدرم طوقے از منت اندر گردن

میرے والد کی گردن میں آپ کے احسان کا طوق ہے

ہمہ مہر تو نگارد برواں ہمہ مدح تو سر آید بہ سخن

ان کے دل میں آپ کی محبت ہے اور زبان پر آپ کی مدح

کارنامہ بلخ سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم سلطان مسعود بن ابراہیم کے زمانے تک بقیدِ حیات تھے لیکن ان کا بڑھاپا پریشانی وتنگدستی میں گذر رہا تھا[2] ثقتہ الملک کو اپنے والد کے متعلق لکھتے ہیں۔

---

[1] کارنامہ بلخ [2] ثقتہ الملک سلطان مسعود بن ابراہیم کا وزیر تھا۔

رطب کام نبش کردہ ز عمر   ریش چوں قلب خویش کردہ زعمر

عمر میں بہت تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ اور ڈاڑھی کو اپنے دل کی طرح سفید کرلیا ہے

از برائے چو تو نکو خوئے   بد نباشد چنو دعا گوئے

آپ کی مانند ایک نیک خصلت انسان کے واسطے ایک دعاگو برا نہیں

گنج کس از سخا دژم نشود   چوں خزینہ خدائے کم نشود

کسی کا خزانہ سخاوت سے خالی نہیں ہوتا جس طرح خدا کا خزانہ خالی نہیں ہوتا۔

اخلاق حکیم سنائی حلقۂ صوفیا میں شامل ہوکر گویا نئی زندگی کے دروازے میں داخل ہوگئے۔ نئی زندگی کا مقصد بنی نوع کو فائدہ پہنچانا۔ غریبوں کو مدد دینا اور محتاجوں کی دستگیری کرنا۔ کنج تنہائی میں بیٹھنا عشق حقیقی اختیار کرنا اور اس مادی دنیا سے تعلق توڑ کر دوسرے جہان سے ربط قایم کرنا

رستہ ز ترکیب زمان و مکان   جستہ ز ترتیب شہور و سنین

زمان اور مکان کی ترکیب سے الگ۔ اور ماہ و سال کی ترتیب سے جدا

پائے نہ و چرخ بزیر قدم   دست نہ و ملک بزیر نگیں

پاؤں نہیں لیکن آسمان زیر قدم ہے۔ ہاتھ نہیں اور ملک زیر نگیں ہے۔

اور یہی وجہ تھی کہ سلوک میں قدم رکھنے کے بعد اُن کی تمام عمر ترک و تجرید میں گذری۔ مخلوق کی تعریف سے زبان روک لی ترجمانی حقیقت کے سوا کوئی بات نہ کی۔ امرا اور بادشاہوں کے دربار میں جانا چھوڑ دیا۔ ضمیر کے بادشاہ کے واسطے گریبان سے تاج بنایا اور دامن سے تخت تیار کیا۔

اے سنائی جہد کن تا بہر سلطانِ ضمیر   از گریباں تاج سازی و ز بنِ دامن سریر

اے سنائی کوشش کر کہ سلطان ضمیر کے واسطے۔ اپنے گریبان سے تاج اور دامن کے گوشے سے تخت بنا سکے

علم حقیقی کے طالب ہوئے یہاں تک کہ علم نے ان سے انھیں لے لیا۔ عزت نفس اور بلندی ہمت کو اپنی تکیہ گاہ بنایا غلامی تن سے چھوٹ کر آقائے جان بن گئے۔

علم کز تو ترا نہ ستاند   جہل زاں علم بہ بود بسیار

وہ علم جو تجھ سے تجھ کو نہ لے سکے تو اس سے جہل بہت اچھا
ان کا مرتبہ یہاں تک بلند ہوا کہ محمود غزنوی کا پوتا بہرام شاہ باآں ہمہ مجد و حشمت اپنی بہن کو ان کے حبالۂ عقد میں دینا چاہتا اور وہ معذرت کرتے تھے۔

اے سنائی خواجۂ جانی غلام تن مباش　　خاک را چوں دوست داری پاک را دشمن مباش

اے سنائی تو خواجۂ جان ہے تن کا غلام نہ بن۔ اگر خاک (جسم) کو دوست رکھتا ہے تو پاک کا دشمن نہ بن (روح)

ایک قصیدے میں کہتے ہیں

من نہ مرد زن و زر و جاہم　　بہ خدا گر کنم وگر خواہم

میں زن و زر و جاہ کے طلبگاروں میں نہیں ہوں

گر تو تاجِ دہی ز احسانم　　بہ سرِ تو کہ تاج نستانم

اگر تو احسان کا تاج بھی عطا کرے تو تیرے سر کی قسم میں اس تاج کو قبول نہ کروں

انھیں مخلوق کی تعریف سے نفرت ہو گئی تھی اور اس بات کو سخت مذموم اور معیوب سمجھتے تھے۔ کہ عزت و دولت حاصل کرنے کے لئے تملق و چاپلوسی کے طور پر خوشامد کی باتیں کی جائیں۔ بہرام شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اے ز من خوش مرا مکن ناخوش　　کہ مکافاتِ آں نباشد ایں

اگر تو مجھ پر مہربان ہے تو مجھے ناخوش نہ کر۔ کہ اس کا بدلہ یہ نہیں

زین و مرکب ترا مرا بگذار　　تا شوم ز ایں پیادہ گی فرزیں

زین اور گھوڑا تجھے مبارک رہے مجھے میرے حال پر چھوڑ تاکہ میں پیادہ سے فرزیں (وزیر) بن جاؤں

شہپرِ جبرئیل مرکب اوست　　چہ کند جبرئیل مرکب و زین؟

اس کا مرکب شہپر جبرئیل ہے۔ اور جبرئیل کو مرکب و زین سے کیا سروکار؟

عقل نامہ میں ایک جگہ فرماتے ہیں

مستا بندہ را کہ بد باشد　　مدحِ مخلوق ذم خود باشد

بندہ کی تعریف نہ کر۔ اس لئے کہ مخلوق کی مدح اپنی مذمت ہے۔

چہ کشاید ز بینوائے چند چہ تواں خواست از گدائے چند[1]

بے نواؤں سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے اور گداؤں سے کیا چیز طلب کی جا سکتی ہے؟

گوشہ گیری اور قناعت کو ہر چیز پر ترجیح دیتے تھے۔ نااہلوں کی صحبت سے بھاگتے تھے۔ اُن کی ہمتِ عالی کے سامنے یہ مادّی دنیا کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتی تھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں

خلق را جملہ صورتی انگار ہیچ از ہیچ خلق طمع مدار[1]

مخلوق کو محض صورت سمجھ۔ کسی سے کسی چیز کی امید نہ رکھ

زحمت خود ز اہل عصر بکاہ ہر چہ خواہی ز خالقِ خود خواہ[1]

اہل عصر کو کوئی تکلیف نہ دے۔ جو کچھ طلب کرنا ہوا پنے خالق سے طلب کر

چوں ستانی نوال او خوشتر[2] بخشش بے زوال او خوشتر

اگر تجھے لینا ہے تو اس کی بخشش کا لینا اچھا۔ اور اسی کی بخششِ بے زوال اچھی۔

بختِ من زاں چنیں ز زند افتاد[3] کہ مرا ہمتِ بلند افتاد[3]

میرا نصیب اس لئے خراب ہے۔ کہ میری ہمت بلند واقع ہوئی ہے

دست در رشتۂ حقایق زن پائے بر صحبت خلائق زن[4]

حقائق کی جستجو کر۔ اور صحبتِ خلق سے کنارہ کر

سنائی ریاکاری اور ان علمائے ریاکار سے سخت بے زار تھے جو علم کو اپنی اغراضِ شخصی کی پیش برد اور دوسروں کی ایذا رسانی کا ذریعہ بناتے ہیں ایک قصیدے میں فرماتے ہیں۔

عالمت خفتہ است و تو خفتہ خفتہ را خفتہ کے کند بیدار

تیری دنیا بھی سو رہی ہے اور تو بھی سو رہا ہے۔ سوتے ہوئے کو سویا ہوا کب جگا سکتا ہے

غول باشد نہ عالم آنکہ ازو بشنوی گفت و نشنوی کردار

---

[1] حدیقہ [2] عقل نامہ [3] کارنامہ [4] طریق التحقیق

وہ شخص عزل بیابانی ہے عالم نہیں۔ جو گفتار رکھتا ہو اور کردار نہ رکھتا ہو۔

نہ بداں لعنت است برابلیس کہ نداند ہمے یمین ز یسار

شیطان پر لعنت اس وجہ سے نہیں کہ وہ داہنی بائیں کو نہیں جانتا

بل بداں لعنت است کاندر دیں علم داند بعلم نکند کار

بلکہ لعنت اس وجہ سے ہے کہ وہ اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کرتا

اور یا اس بیت میں

حسرت آں را کہ بود کز دخمہ زی دوزخ برند حسرت آں را کش بدوزخ از سر منبر برند

حسرت اس کو نہیں ہوسکتی جسے قبرستان سے دوزخ کی طرف لے جائیں حسرت اس کو ہوتی ہے جسے منبر سے دوزخ کی طرف لے جائیں

اور پھر اس شعر میں

چو علمت است خدمت کن چو دانایاں کہ زشت آید گرفتہ چینیاں احرام و خفتہ مکی در بطحا

اگر تجھے علم ہے تو داناؤں کی طرح خدمت کر۔ یہ بات اچھی نہیں معلوم ہوتی کہ چینی تو احرام باندھے ہوں اور مکہ کا باشندہ سو رہا ہو۔

سنائی کا شمار شعرائے اجتماعی میں ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ تمام مسلمانوں کو بہ نگاہ مساوات دیکھتے تھے اور تمام انسانوں کو (بندہ گان یک داغ و میوہ یک باغ) جانتے تھے۔ تفرقہ انگیزی اور دورنگی سے انھیں سخت نفرت تھی۔

تو کئی گر کسے فگندہ اوست با ہمہ عیب بندہ بندہ اوست

اگر کسی کو اس نے پشت کر دیا ہے تو تجھے کیا؟ تمام عیبوں کے باوجود بندہ اسی کا بندہ رہتا ہے۔

چند تفسیر بے بیاں کردن چند تکفیر بندگاں کردن

بیان کے بغیر تفسیر کب تک کرے گا۔ اور کب تک بندگان خدا کو کافر ٹھہرائے گا۔

گر دلت را درا بینے بودے از دو رنگئی فراغتے بودے

اگر تیرے دل میں دانش ہوتی تو۔ دورنگی سے پاک ہوتا۔

ہمہ در بندگی یک داغند ہمہ گان میوہ ہائے یک باغند

سب ایک ہی آقا کے غلام ہیں اور سب ایک ہی باغ کے میوے ہیں۔

حدیقہ میں امام اعظم اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کی منقبت سے فارغ ہو کر دونوں مذہب کے پیروؤں کو اتحاد کی دعوت دیتے ہیں اور تلقین کرتے ہیں کہ جزئیات کی بناء پر باہم نفاق اور بے گانگی پیدا نہ کریں۔ سنائی دائرۂ حیاتِ سیاسی کے اندر داخل نہ ہونے اور بادشاہوں کے درباروں میں بکثرت آمد و رفت رکھنے کے باوجود کمزوروں اور مظلوموں کی طرفداری کرتے تھے اور اپنے زمانے کے امرا کو عدل و انصاف کا درس دیتے تھے۔ حدیقہ میں فرماتے ہیں

خوش بود خاصہ از جہانگیراں رحمت طفل و حرمت پیراں

بچوں پر مہربانی اور بزرگوں کی تعظیم اچھی ہے اور بادشاہوں کے لئے خصوصیت سے زیادہ اچھی

ہست نزد خدای و خلق اے شاہ شکر نعمت قبول عذر گناہ

اے بادشاہ خدا اور خلق کے نزدیک۔ گناہ کا عذر قبول کرنا ہی شکر نعمت بجالانا ہے

چوں بہ از خلقت آفرید خدای تو بہ از خلق بندگیش نمای

چوں کہ خدا نے تجھے خلقت میں بہتر پیدا کیا ہے اس لئے تو خلق سے بہتر اس کی بندگی کر

طالب شاہ عادل است جہاں تو عدالت کن و جہان بستان

جہان منصف بادشاہ کا طالب ہے۔ تو انصاف کر اور جہان کو تسخیر کرلے

عدل کن ز آنکہ در ولائیت دل در پیغمبری زند عادل

انصاف کر کہ دل کی ولایت میں منصف پیغمبری کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے

اے بسا رایت عدو شکناں ریز ریز از دعائے بیوہ زناں

دشمنوں پر غالب آنے والوں کے جھنڈے۔ بیوہ عورتوں کی بد دعاؤں سے پارہ پارہ ہو گئے

آنچہ یک پیرہ زن کند بہ سحر نکند صد ہزار تیر و تبر

صبح کے وقت ایک بڑھیا جو کچھ کرسکتی ہے۔ وہ ایک لاکھ تیر و تبر بھی نہیں کرسکتے

و آنچہ در نیم شب کند زالے نکند چوں تو خسروے سالے

ایک بوڑھیا جو کچھ رات بھر میں کر سکتی ہے۔ وہ تجھ ایسا بادشاہ سال بھر میں بھی نہیں کر سکتا۔

سنائی کی نظر میں دنیا کے ٹھاٹھ اور ظاہری تجمل کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ ان کا خیال تھا کہ بزرگی اور حشمت انسان کو فروتن اور متواضع بناتی ہے اور خود پرستی اور خود ستائی کے خیال کو اُس کے پاس بھی نہیں پھٹکنے دیتی۔

دولت آں را مداں کہ داوندت　　بیش از ابنائے جنس استظہار

اس کو دولت نہ سمجھ کہ تجھے دوسروں سے زیادہ شان و شوکت دی گئی ہے

تا ترا مایۂ دولت است نئی　　در جہانِ خدائے دولت یار

جب تک تو زر کو دولت سمجھتا رہے گا۔ اس وقت تک جہان میں بختیار نہ ہوگا

چوں ترا از تو پاک بستاند　　دولت آں دولت است و کار آں کار

دولت اور کام وہی ہے جو تجھ کو تجھ سے لے سکے

مُلکِ دنیا مجو و حکمت جو　　زانکہ ایں اندک است و آں بسیار

دنیا کا ملک طلب نہ کر حکمت ڈھونڈ۔ اس لئے کہ یہ تھوڑا ہے اور حکمت بہت ہے

سنائی کا خیال ہے کہ شاہ راہِ حقیقت کو ظاہری وسائل سے طے نہیں کیا جا سکتا اور بے درد لوگ طریقت کی منزلِ مقصود کو نہیں پہنچ سکتے اس کے لئے درد کو رہنما اور سوز و گداز کو رفیقِ طریق بنانے کی ضرورت ہے۔

کے تواں آمد براہ حق ز راہ حلق و خلق　　درد باید خلق سوز و حلق دوز و حق گداز

حلق و خلق کے راستے سے منزلِ حق نہیں ملتی۔ اس کے لئے خلق سوز، حلق دوز اور حق گداز درد کی ضرورت ہے

عقل نامہ میں عارفوں کی تعریف کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

تا نباشند عاشق جاں باز　　درمیاں کے نہند با او راز

جب تک عاشق جان پر نہیں کھیلتے۔ محبوب ان کو رازدار نہیں بناتے۔

سوزِ دل ہاست شمع ایں مجلس　　آہ و درد است محرم و مونس

اس مجلس کی شمع سوزِ دل ہے۔ اور آہ و درد محرم اور مونس ہیں۔

عاشقاں از جگر کباب خورند و زخمِ دیدہ خوں چو آب خورند

عاشق جگر کے کباب کھاتے ہیں۔ اور آنکھوں کے زخم سے خون پانی کی طرح پیتے ہیں۔

در خراباتِ عشق مردانند کہ زمیں چوں فلک بگردانند

میخانۂ عشق میں ایسے ایسے لوگ ہیں جو زمین کو آسمان کی طرح گردش دے دیں۔

اور یہ درد بھی پوشیدہ اور مخفی ہو ظاہر اور بدیہی نہ ہو

از برائے غیرتِ معشوق در شہرِ ضمیر اے دریغا ہائے خون آلود پنہاں داشتن

محبوب کی غیرت کے خیال سے دل کے شہر میں۔ خون آلود آہ کو پوشیدہ رکھنا پڑتا ہے

مذہب سنائی مذہب اہل سنت رکھتے تھے جنہوں نے اس کے خلاف سمجھا ہے انھیں کچھ غلط فہمی ہوئی۔ اس لئے کہ اول تو سنائی نے حدیقہ اور اپنے تمام قصائد اور مثنویات میں خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مدح و منقبت کی ہے۔ دوسرے خلفاء کے درمیان مذہب اہل سنت کے مطابق مدارج کی ترتیب ملحوظ رکھی ہے یعنی اول حضرت صدیق اکبرؓ اس کے بعد حضرت فاروق اعظمؓ اس کے بعد حضرت عثمانؓ اس کے بعد حضرت علیؓ (رضوان اللہ تعالےٰ علیہم اجمعین) کی مدح کی ہے چنانچہ اپنے مکتوبِ منثور میں جو بہرام شاہ کے نام لکھا ہے ظاہر پرستوں کے اعتراض کو دفع کرتے ہوئے مدح صحابہ کے مسئلے کو اپنے دعوے کے ثبوت میں بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔ مکتوب مذکور میں لکھا ہے کہ " کہتے ہیں کہ آل مروان کی مذمت کی اور امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کی فضیلت پر گرویدہ ہے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ان کو صدیق اکبرؓ کے بعد بلکہ فاروق اعظمؓ اور ذی النورینؓ کے بعد رتبہ دیا۔ جیسا کہ دوسرے ائمہ سلف نے دیا۔ تیسرے حکیم سنائی ابو یعقوب یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ جو مشہور صوفی اور خواجہ بہاء الحق نقشبندؒ کے پیر طریقت تھے۔ چوتھے سنائی نے ابو حنیفہ اور شافعی رحمۃ اللہ علیہما کی تعریف کی اور ان کے مذہب کو مذہبِ حق کہا۔ ابو حنیفہ کی تعریف میں کہتے ہیں۔

دین چو بگذشت از ایں جواں مردان خلق در دین شدند سرگردان

جب دین ان جواں مردوں سے گذر گیا۔ تو مخلوق دین سے سرگرداں ہو گئی۔

ہمہ را باز رائے نعمانی آشتی داد با مسلمانی

سب کو نعمانی کی رائے نے۔ پھر اسلام کی راہ دکھائی۔

بود در زیر گنبد ازرق حجتِ صدق در محبت حق

بوحنیفہ اسی گنبد نیلگوں کے تلے۔ حق کی محبت میں برہان صداقت تھے۔

بر روانش ز ما درود و سلام باد ہم حشر کن بدار سلام

ان کی روح پر میری طرف سے درود اور سلام ہو۔ اور خدا جنت میں میرا حشر ان کے ساتھ کرے

امام شافعیؒ کی تعریف میں فرماتے ہیں

بود در راہِ دیں امام بحق کہ امامت ورا سزد مطلق

دین کی راہ میں امام برحق تھے منصب امامت مطلق انہی کو زیبا ہے

دین از او یافت زینت و رونق در تبع متفق شدند فرق

دین نے ان سے زینت اور رونق پائی۔ ان کے اتباع میں مختلف گروہ متفق ہو گئے

پانچویں۔ اپنے قصائد میں چند مقامات پر اس مسئلے کی طرف اشارہ کیا ہے

ز چار سوی ملامت بشاہراہ نجات چہار یار پیمبر بسند راہبرم

ملامت کی چار اطراف سے الگ۔ نجات کی شاہراہ میں پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے چار یار میری رہنمائی کے لئے کافی ہیں

دوسری جگہ فرماتے ہیں

سنّی دیندار شو تا زندہ مانی زانکہ ہست ہر چہ جز دیں مردگی و ہر چہ جز سنت حزن

سنی دیندار بن جا تاکہ زندہ رہ سکے۔ اس لئے کہ دین کے سوا جو کچھ ہے مردگی ہے اور سنت کے سوا جو کچھ ہے غم ہے

ایک اور مقام میں فرماتے ہیں

دیدہ در چشم سنائی چوں سنانے باد تیز گر زمانے زندگی خواہد سنائی بے سنن

سنائی کے حلقہ چشم میں ڈھیلے سنان کی طرح تیز ہو جائیں اگر وہ سنت کے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ رہنے کی خواہش کرے

ہندوستان کے عربی شعراء پر ایک نظر
(ایک مضمون کا جائزہ)

از

(جناب مولانا ابو محفوظ الکریم معصومی لکچرر تاریخ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

مارچ ۵۰ء کے معارف میں میرا مضمون "ہندوستان کے عربی شعراء پر ایک نظر" چھپا تھا۔ مضمون اس وسیع موضوع پر آغازِ بحث کا پہلا قدم تھا اور بس؛ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ۵۱ء میں پے در پے دو مقالے اسی موضوع سے متعلق نظر نواز ہوئے۔ مولانا مجتبیٰ حسن صاحب کامون پوری کا مقالہ جمہور علی گڑھ (نمبر ۱) میں اور جناب اختر تلہری کا مفید مضمون مجلہ معارف (ج ۶۷/۳) میں۔ خاص طور پر مولانا کامون پوری کے مضمون سے میری دلچسپی کی ایک وجہ یہ ہے کہ موصوف نے راقم السطور کی بعض مسامحتوں کی طرف بھی توجہ فرمائی ہے؛ مسامحت کا وقوع عقلاً یا عادۃً کچھ محال نہیں، آئے دن ایک سے ایک دلچسپ یا یہ کہئے کہ اعلیٰ قسم کی مسامحتیں ہمارے مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں، جن سے طبقۂ علیا کے فضلاء بھی براءت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اور اگر مسامحت واقعۃً صحیح ہو تو اسے قبول کرنا کچھ باعث ننگ و عار نہیں۔ راقم جیسے بے بضاعت سے اگر مسامحت یا صریح لفظوں میں یہ کہئے کہ کوئی غلطی سرزد ہی ہو گئی تو اس پر مجھے تعجب نہیں اور فراخدلی کے ساتھ غلطی کا تسلیم کر لینا اپنا فرض سمجھتا ہوں بشرطیکہ وہ غلطی واقعی ہو؛ سطور ذیل میں قارئین کو ان مسامحتوں کا حال معلوم ہوگا ساتھ ہی جمہور کے فاضل مضمون نگار کے مضمون میں سے بعض اہم نقاط بھی زیر بحث آ گئے ہیں۔

مولانا کامون پوری کے مضمون کی طرف توجہ سے پہلے ناظرین کی توجہ میرے مضمون مطبوعہ معارف کی تمہیدی عبارات کی طرف مبذول ہونی چاہئے۔ اپنے مضمون میں بطور تمہید جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ قدیم عربی اسلوب، مولّد اور عجمی شعراء کے کلام میں مفقود ہے۔ اسی نقطۂ خیال کو میں نے ہر ممکن اختصار کے ساتھ ظاہر کیا ہے، چونکہ یہ تمہید ہی نہایت مختصر مضمون کی تھی لہذا اس میں اختصار

پسندی بھی بے جا نہ تھی میں نے اپنے خیال کی ترجمانی وضاحت سے نہیں کی۔ یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی میرا دعویٰ ہے کہ اس خیال کا سمجھنا اہلِ نظر کے لئے کچھ دشوار نہ تھا۔

ابن خلدون کی عبارت بر محل نہ سہی بے محل کیسے ٹھہری جب کہ قارئین کی نگاہ مخضرمین و مولدین سے گذرتی ہوئی اہلِ عجم کے طبقہ تک پہنچتی ہے اور جب کہ تاریخ ادبیات عرب کے جاننے والے جانتے ہیں کہ اہل عجم پر مولدین و محدثین ہی کا اثر براہ راست ہوا اور اس اعتبار سے مولد شعراء کی حیثیت اگر استاذ و امام کی ہوئی تو کیوں نہ ہم ان کے مقلدین اور معنوی شاگردوں یعنی اہل عجم کی خامی ثابت کرتے ہوئے ان کے اساتذہ ہی کی خامی سے استدلال کریں، بعینہ یہی صورت ہوئی ہے کہ مولدین کے بعد جب ہم نے عجمی ادباء و شعراء کا ذکر کیا تو ان کے سبک و اسلوب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ابن خلدون کی مندرجہ ذیل عبارت بھی نقل کر دی۔

" بهذا الاعتبار كان الكثير ممن لقينا من شيوخنا فى هذه الصناعة الادبية يرون ان نظم المتنبى والمعرى ليس هو من الشعر العربى فى شئ لانهما لم يجريا على اساليب العرب "	اسی اعتبار سے فن ادب کے اکثر شیوخ جن سے میری ملاقات ہوئی یہ رائے رکھتے تھے کہ متنبی و معری کی نظمیں کسی حیثیت سے بھی شعر نہیں اس لئے کہ یہ دونوں اسالیبِ عرب پر نہیں چلے " (معارف مارچ ۱۹۶۲ء)

مجھے کیا علم تھا کہ اس اختصار پسندی کا یہ نتیجہ ہو گا کہ بعض قارئین غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ان عبارتوں کی ظاہری ترتیب سے متنبی و معری کا عجمی النسل ہونا اخذ کریں گے۔ عبارتیں خواہ اپنی اپنی جگہ پر مستقل قطعۂ کلام ہوں لیکن جب سلسلۂ کلام ایک ہے تو ان عبارتوں کے معنوی تعلق و ارتباط کو ملحوظ نہ رکھنا کہاں کی دانشمندی ہے مولانا نے محض ترتیبِ عبارات سے جو کچھ اخذ کیا وہ قطعاً تعسف پر مبنی ہے؛ کاش ہم اسے تسلیم نہیں بلکہ اپنی ایک عظیم غلطی تسلیم کر لینے کی معقول وجہ سمجھ سکتے۔ اس کا اعتراف ضرور ہے کہ مولانا نے ذہنِ رسا پایا ہے اور آگے دیکھئے کہ آپ کی ذہانت کیا گل کھلاتی ہے۔

فرماتے ہیں:- "اسی طرح اس مضمون میں یہ بھی دلچسپ انکشاف ہے کہ ابوریحان بیرونی ہندوستان کا عربی شاعر ہے" (جمہور ص۶ ۔ عامود ۳)

سبحان اللہ کیا دقیق استنباط ہے؛ یہ مغز نغز ہے ہماری تمہید ہی کی ایک عبارت کا جس کے رموز و نکات کا سمجھنا مولانا کی طبع وقادہی کا حصہ تھا؛ ہماری وہ عبارت جس میں آپ کو مذکورہ بالا "انکشاف" نظر آیا حسب ذیل ہے:-

"ہندوستان کی تاریخ سے اگر سندھ کی عربی حکومت کو الگ کر دیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہاں عربی ان مسلم فاتحین ہی کے ذریعہ آئی جن کے درباروں میں حسن بن اسحٰق فردوسی ملک الشعراء، احمد عنصری، ابوالحسن رودکی، فرخی، علی عنرنی وغیرہ کا طوطی بول رہا تھا انہی درباروں میں قفال مروزی، ابونصر عراق، ابوریحان البیرونی ابوالحسن الخمار جیسے حکماء بھی ملیں گے جنہوں نے اپنی قیمتی تحقیقات و معلومات سے عربی زبان کو مالا مال کیا (معارف مارچ ۱۹۵۸ء)

البیرونی کا نام پورے مضمون میں صرف ایک جگہ اسی عبارت میں آتا ہے۔ اب یہ سوچنے کی بات ہے کہ مولانا نے ہمارے جس "انکشاف" کا انکشاف فرمایا اس کا احساس ہمیں پہلے کیوں نہیں ہوا یا اب بھی کیوں نہیں ہوتا۔ ذہن کی الجھن اور دوچند ہو جاتی ہے جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا کے اجتہادِ مطلق نے ایک البیرونی پر کیوں قناعت کی جبکہ ایک طویل فہرست اسماء و اعلام کی ہماری عبارت میں موجود تھی اگر مولانا چاہتے تو اپنے اجتہاد کا دائرہ اور وسیع کر دیتے اس طرح نہ صرف یہ کہ ایک "انکشاف" بلکہ بہت سارے انکشافات کا علم انھیں حاصل ہوتا اور دنیا ان کے "اختراعات فائقہ" پر آفریں کہتی؛ بہر حال اس ایک اختراع پر بھی مولانا مستحق تحسین و ستائش ہیں؛

عجبتُ لمن له قدٌّ وحدٌّ وينبو نبوة القضم الكهام

آیئے تھوڑی دیر مولانا کے "ذوق ادب" کا بھی مطالعہ کریں، اس سلسلہ میں آپ کا مضمون "ہندوستان میں عربی شاعری" —— جس کا تعلق نفس موضوع سے واجبی ہی ہے —— ایک اہم دستاویز ہے جس کے بلند آہنگ دعاوی کی روشنی میں اگر ان کے "حسن مذاق" کا جائزہ لیا جائے تو شاید بے جا نہ ہوگا۔ زیر بحث

ابن خلدون کی عبارت منقولہ بالا ہے، کہ اس عبارت میں ابن خلدون نے اپنے شیوخ ادب کے حوالہ سے متنبی و معری کے بارہ میں جس خیال کا اظہار کیا ہے وہ کہاں تک صحیح اور کس حد تک اختلاف کے قابل ہے۔ ہمارے مضمون مطبوعۂ معارف میں اس بارہ میں کوئی ایسا جملہ نہیں جس سے یہ سمجھا جائے کہ ہمارے نقطۂ خیال سے ابن خلدون کا بیان حرف بحرف صحیح اور ناقابل اختلاف ہے، البتہ ہمیں ابن خلدون کے بیان سے بڑی حد تک اتفاق ضرور ہے ابن خلدون نے جس خیال کا اظہار کیا ہے اسی کا اعادہ ان لفظوں میں بھی کرتا ہے کہ :-

ولہذا کان شیوخنا رحمہم اللہ	ہمارے شیوخ اندلس کے مشہور شاعر ابوبکر بن خفاجہ
یعیبون شعر ابی بکر بن خفاجۃ	کی شاعری پر اسی لئے نکتہ چینی کرتے تھے کہ اس کے ایک
شاعر الاندلس لکثرۃ معانیہ وازدحامہا	ہی بیت میں معانی کی کثرت ہوتی ہے۔ متنبی اور معری
فی البیت الواحد کما کانوا یعیبون	کے کلام میں بھی ان شیوخ کو یہی عیب نظر آتا تھا کہ ان
شعر المتنبی والمعری بعدم النسج	کے کلام میں اسالیب عرب کی کمی ہے لہذا ان دونوں
علی الاسالیب العربیۃ کما مرّ فکان	کا کلام منظوم، شعر عربی کے معیار سے نیچا ہے اور اس
شعرھما کلاماً منظوماً نازلاً عن	فیصلہ کا تعلق ذوق ادب سے ہے۔
طبقۃ الشعر والحاکم بذلک	
الذوق (مقدمہ ص۵۵۰)	

ابن خلدون کے مقابلہ میں مولانا کا مون پوری۔ قاضی جرجانی کے مکتب خیال سے وابستہ ہی نہیں بلکہ اس سے بھی دو چار قدم آگے بڑھے ہوئے ہیں، معلوم نہیں آپ کس ادبی و شعری مکتب کے تربیت یافتہ ہیں کہ آپ کے زعم میں ابن خلدون نے جو کچھ لکھا ہے وہ صرف اس کی اپج ہے لغو محض ہے اور اس کے قول کو واقعیت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اور اس کی بات صحیح بھی کیسے ہوسکتی ہے جب کہ وہ عربی ادب کا نقاد نہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ اس کا قول بہ قول مولانا موصوف "عربی ماحول میں تسلیم نہیں کیا گیا" (جمہور ص ماحود ص۳) اور یہ عربی ماحول جہاں ابن خلدون کو باریابی نہیں ہوسکتی ہمارے مولانا ہی کے دماغ کی تخلیق ہے

یا یہ متنبی کے شراح و مفسرین کا ماحول ہے جس کے متعلق آپ رقمطراز ہیں کہ :۔

" صرف ابن خلکان کے ایک شیخ کو متنبی کی چالیس شرحوں کا علم تھا؛ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ علما کا یہ شغف کسی اور شاعر کے کلام سے ظاہر نہیں ہوا گویا علمائے ادب نے اسے غلطی سے اپنی پسندیدگی کا مرکز بنایا۔ ابن خلدون کے بیان کے مطابق تو متنبی کی نظم کو شعر ہی نہیں کہہ سکتے۔ یہ ابن خلدون کی اپج تھی اور ابن خلدون کی اس طرح کی اپج ان کے خاص موضوع تاریخ نگاری میں بھی جگہ جگہ پر نمایاں ہے۔" (جمہور ص۲ عامود ۳)

واقعی یہ ابن خلدون کی سراسر زیادتی تھی کہ اس نے مولانا کامون پوری جیسے فاضل یگانہ کے محبوب تر شاعر "متنبی" کے اعجاز بیان سے مسحور ہونے کے بجائے اس کی ایسی توہین کی اور یہ جانتے ہوئے کہ متنبی کو علماء وادباء اپنی پسندیدگی کا مرکز بنا چکے ہیں اور اس کے دیوان کے شارحین و مفسرین کی تعداد "لا تعد ولا تحصیٰ" ہے ابن خلدون کی یہ جرأت کہ متنبی اسالیب عرب پر نہ چلا لہٰذا اس کا کلام منظوم شعر کے حکم میں نہیں ہرگز قابل معافی نہیں،

یہ تو خیر ابن خلدون کی اُپج تھی اور وہ بھی اس کی اپنی نہیں بلکہ شیوخ ادب سے مستعار جسے نقل کرنے کا وہ گنہگار ہے لیکن ستم بالائے ستم یہ ہے کہ متنبی کے شراح جن کے اغتناء و شغف کا حال مولانا نے ابن خلکان کی زبانی سنایا انھی میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو شرح کرتے ہیں متنبی کے کلام کی اور تفسیر بیان کرتے ہیں اس کے افکار بدیعہ و مطالب سنیہ کی لیکن جب متنبی کے کلام کی طرف رجحان عامہ کے اسباب پر روشنی ڈالتے ہیں تو ان میں سے ایک سبب ادبی ذوق کی پستی ہی کو قرار دیتے ہیں؛ الواحدی جس کی شرح سے بہتر یہ مشکل کوئی دوسری شرح ہوگی اور جس کی تعریف و توصیف میں ابن خلکان رطب اللسان ہے وہ اپنی شرح کے خاتمہ میں رقمطراز ہے کہ :۔

واتما دعانی الی تصنیف هذا الکتاب	" باوجودیکہ فن ادب کا زوال ہے اس کتاب کی تصنیف
مع خمول الادب وانقراض زمنه	کا سبب لوگوں کا یہ اتفاق اس دیوان کو پسند کرنا، اس
اجتماع اهل هذا العصر قاطبة علی	کے حفظ و روایت میں ان کا انہماک، اور جمیع اشعار
هذا الدیوان وشغفهم بحفظه ورو۲ شته	عرب یعنی جاہلی و اسلامی شعراء کے کلام سے ان کی رو

وانقطاعهم عن جميع اشعار العرب جاهليتها واسلامها الى هذا الشعر حتى كان الاشعار كلها فقدت وليس ذلك الالتراجع الهمم وخلو الزمان عن الادب وقلة العلم بجوهر الكلام ومعرفة جيده من رديه	گردانی ہے؛ (ان کا شغف دیوان متنبی سے اس حد تک ہے) کہ کلام عرب کا ذخیرہ گویا مفقود ہو چکا ہے؛ اس عام رجحان کا سبب ہمتوں کی پستی، زمانہ کا ادب اور ادبا سے خلو، جوہر کلام کی پرکھ اور جید ورد ی کی شناخت کی کمی ہے،

(کشف الظنون ج ۳ / ۳۰۹، فلوگل)

خدارا کوئی یہ بتائے کہ الواحدی کی یہ شکایت کیوں تھی؟ اور اس کا سبب کیا تھا بجز اس ادبی انحطاط کے کہ دنیا صرف افکار و معانی کو منتہائے کمال سمجھ کر متنبی کے دیوان سے کامل اعتناء ظاہر کر رہی تھی اور جمیع اشعارِ عرب خواہ وہ جاہلی دور کے ہوں یا اسلامی دور (صدر اول) کے جو لسانی اعتبار سے قیمتی جواہر تھے، یہی برباد ہو رہے تھے: واحدی اگر اس پر بھی بس کرتا تو مولانا کے لئے تاویل کی گنجائش باقی تھی لیکن وہ تو صاف طور پر کہہ رہا ہے کہ یہ ذہنی فطور، یہ ادبی انحطاط اور اسی قسم کے سارے انقلابات کیوں تھے؟ صرف اس لئے کہ ہمتیں پست ہو چکی تھیں، زمانہ میں ادب کا قحط نمایاں تھا اور جوہر کلام کی شناخت مفقود ہو رہی تھی اچھے برے کا امتیاز مٹ رہا تھا غرض ایسے انقلاب کے عالم میں متنبی کے کلام کا عالمگیر ہو جانا اور عام ذہنیتوں پر اس کی شعریت کا تسلط یہ تو ثابت نہیں کرتا کہ متنبی کا دیوان کلام عرب کے اصل جوہر کے اعتبار سے بھی شاہکار ہے اور اس پر نکتہ چینی غلط، متنبی کے شارحین کی کثرت اور اس کے کلام کی طرف رجحانِ عام کا ثبوت مہیا کر کے مولانا نے بزعم خود گویا یہ بھی ثابت کر دیا کہ متنبی کا کلام بحیثیت "عربیت" یا باعتبار سبک و اسلوب" ابن خلدون کی تنقید سے بالاتر ہے؛ مولانا کا یہ جملہ گویا علمائے ادب نے اسے غلطی سے اپنی پسندیدگی کا مرکز بنایا۔ ان کے اس حسنِ ظن پر مبنی ہے کہ علماء غلطی نہیں کر سکتے یا غلطی کرنا شانِ علم کے منافی ہے لیکن ان کا یہ حسن ظن امام واحدی کے بیان کی روشنی میں انتہائی بے خبری کا پتہ دیتا ہے۔

مولانا صاحبِ نظر ہیں؛ عربی ادبیات سے ذوق رکھتے ہیں، کلامِ عرب کے ناقدین کی آراء و اہواء

سے بھی ان کو ضرور واقفیت ہوگی اگر وہ ابن خلدون کے بیان پر غور فرماتے تو یقیناً اسی نتیجہ تک پہنچتے کہ ابن خلدون کے یہ الفاظ صرف اس کے اپنے خیال کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس کا یہ خیال ادباء متقدمین کی ایک بڑی جماعت کے اقوال سے ماخوذ و مستفاد ہے؛ لیکن انھوں نے بلا تامل ابن خلدون کے قول کو بے اصل قرار دیا اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس کے موضوع تاریخ نگاری پر بھی آپ حملہ آور ہو گئے: اور آپ نے اس کے قول کے متعلق بحیثیت قاضیٔ عادل یہ فیصلہ بھی صادر فرما دیا کہ اس کا قول عربی ماحول میں تسلیم نہیں کیا گیا۔

کیا ابن عباد، محمد بن الحسن الحاتمی، ابن وکیع، ابن جنی وغیرہ کے تمام ترموا خذات بے معنی تھے، مکابرہ و تعسف پر مبنی تھے؟ یا کچھ اصلیت بھی ان میں پائی جاتی تھی: اور ابو ہلال عسکری جس کی ادبیت و علمیت مسلّمہ ہے اس کے یہ الفاظ شاید واقعیت سے بہت دور ہیں؟ کہ

"ولا اعرف احدا كان يتتبع العيوب فيأتيها غير مكترث لها الا المتنبي فانه ضمن شعره جميع عيوب الكلام ما اعدم منها شيئا"

(الصناعتین: ص ۱۵۲ طبع ثانیہ)

میری دانست میں متنبی کے سوا کوئی اور ایسا نہیں جو سارے عیوب کا تتبع کرتا ہو اور بے پروائی کے ساتھ ان عیوب کو اختیار کرتا ہو، یہ صرف متنبی ہے جس نے اپنے کلام میں جملہ عیوب کو جمع کیا اور شاید ہی کوئی عیب اس کے دائرہ سے خارج رہا ہو۔

سوال یہ ہے کہ مولانا جس "عربی ماحول" کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں وہ ان ائمہ ادب کے ماحول سے بھی بالاتر کوئی چیز ہے؟ اگر کوئی ایسی ہی چیز ہے تو اس کا وجود شاید مولانا ہی کے ذہن و دماغ کے "خلیہ" میں مصروف نمو ہوگا ورنہ ہمارے پیش کردہ ماحول سے ارتقاء دائمی کوئی اور ماحول تو ادبیات عرب کی تاریخ میں بظاہر موجود نہیں، ہم یہ سمجھتے ہیں اور بجا سمجھتے ہیں کہ ابن خلدون کا بیان نہ اس کی اپنی اُپج ہے اور نہ اس کے شیوخ ادب ہی کا اختراع بلکہ یہ انہی ائمہ ادب کی رائے کا پرتو اور انہی کے اقوال کی بازگشت ہے؛ اور اگر عسکری، حاتمی، ابن عباد و ابو القاسم المرتضیٰ وغیرہ کے ماحول کو ادبی ماحول نہ مانیں تو اس مکابرہ کا کیا جواب؟ غرض یہ منکشف حقیقت ہے کہ ابن خلدون نے اپنے الفاظ میں جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ طرز اول کے "ادبی ماحول" میں تسلیم شدہ ہے! ——— یہ باتیں تو رہیں ایک طرف، خود متنبی کا یہ حال ہے کہ کم از کم اپنے

آخری دور کے کلام میں نقص و فتور کا اعتراف صریح لفظوں میں کرتا ہے:۔

قد تجوزت فی شعری واعضیت | یعنی آل حمدان کی مفارقت کے بعد شعر و شاعری میں بھی
طبعی واغتنمت الراحۃ مذ فارقت | باقی نہیں رہا طبیعت پر زور ڈالنا بھی ترک کر دیا اور اب
آل حمدان" (الشرتیشی ص ۱۵) | راحت ہی غنیمت معلوم ہوئی"۔

اس بحث کو مزید طول دینے کے بجائے ہم متنبی اور معری کے متعلق اپنے تاثرات کو مختصر لفظوں میں پیش کر دینے پر اکتفاء کرتے ہیں کہ متنبی بے شک معجز نگار شاعر تھا اس کی عظمت ادبی حلقوں میں جانی پہچانی ہے اور اس کے محاسن کا اعتراف نہ کرنا صریح تعدی ہے لیکن ہم اس کے عیوب و مساوی کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اسی طرح معری کی جلالتِ شان بھی محتاج تشریح و بیان نہیں۔ ابن خلدون کا بیان اس سلسلہ میں ممکن ہے کہ تشدد آمیز ہو، بے اصل اور ہیچ ہرگز نہیں اور اس کے متعلق مولانا کا یہ فرمانا کہ اس کا قول عربی ماحول میں تسلیم نہیں کیا گیا، کمالِ تجاہل ہے؛

مولانا کو ابن خلدون سے خاص طور پر کد ہے فرماتے ہیں کہ "وہ خالص عرب نہیں" گویا ہم نے اپنے مضمون میں ابن خلدون کو خالص عرب قرار دیا تھا کہ مولانا کو اس کے حسب و نسب سے تعرض کرنے کی ضرورت پڑی یا آپ کا یہ مقصد ہے کہ چونکہ وہ خالص عرب نہیں لہذا اس کا قول ادبی حلقہ میں مستند و معتبر نہیں۔ اگر مولانا کا یہی مقصد ہے تو سمعانی و حموی کے اقوال سے استناد کہاں تک صحیح ہے؟ بہر حال ابن خلدون کے جاننے والے اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ اصلاً و نسلاً حضرمی عرب تھا رہی مولانا کی موشگافی تو یہ قابلِ التفات نہیں؛

آپ کا ایک اور حملہ ابن خلدون کے متعلق یہ ہے کہ "وہ عربی ادب کے نقاد نہیں ہیں" حالانکہ ابن خلدون سے واقفیت رکھنے والے عموماً یہ بھی جانتے ہیں کہ کتاب الاغانی کے اشعار، الاعلم کی کتاب الحماسہ اشعار عرب کے دفاتر ستہ، خود متنبی کے کلام کا ایک حصہ اور بھی اشعار و قصائد اس کی نوک زبان پر تھے اس نے ادب اور علوم اللسان کی تحصیل اپنے عہد کے مشاہیر سے کی تھی، ان تمام باتوں کا ذکر وہ اپنے خود نوشت ترجمہ میں کرتا ہے کلام عرب سے اس کو جیسی مزاولت و ممارست حاصل رہی ہے وہ اس کے اپنے

بیان کے علاوہ وزیر لسان الدین ابن الخطیب کے الفاظ سے ظاہر ہے؛ اور ابن الخطیب جیسا بلند پایہ ادیب اس کے کلام منظوم و منثور کا معرف ہی نہیں بلکہ اس کے نقاد ہونے کی شہادت دیتا ہے (نفح الطیب ج ۴، کتاب العبر ج ۷)

مولانا نے ابن خلدون کی تاریخ نگاری پر جو حملہ کیا ہے اس کا سبب ہماری سمجھ میں نہیں آتا، اگر وہ اپنے اس دعوی کے ثبوت میں بھی کچھ مواد اپنے مضمون میں فراہم کر دیتے تو حقیقت حال واضح ہوجاتی؛ گمان غالب یہ ہے کہ مولانا کا یہ دعویٰ ابن خلدون کے مقدمۂ تاریخ کے بعض مخصوص ابواب ہی سے متعلق ہوگا بہرحال صرف ظن کی بنا پر ہم کچھ مزید کہنا نہیں چاہتے؛

خاتمۂ کلام میں مولانا کے مضمون کی آخری عبارت کی طرف توجہ ضروری ہے وہ عبارت حسب ذیل ہے

"جس طرح اہوازی، تنوخی ابراشہری نے ہندی علوم و فنون پر توجہ کے سلسلے میں ہندی کے بہت سے اصطلاحات و الفاظ عرب کو تحفہ میں دیئے جس طرح مسلمان تاجر ابوزید سیرافی، مسعودی، بلاذری، ابن خرداذبہ ابودلف ینبوعی، بزرگ بن شہریار، اصطخری ابن حوقل، بشاری مقدسی نے ہند کی سیاحت سے فائز ہوکر یہاں کے خیالات کے لئے ہندی زبان سے الفاظ کا بڑا ذخیرہ عربی زبان کو دیا اسی طرح مولانا فضل حق نے بھی اپنی نظم و نثر میں اردو ہندی کے الفاظ عربی تصرفات کے ساتھ استعمال کئے ہیں دراینہ جمع کبان خطوط الامان ر و ا ز ن (روزن) تکا کمرہ (ٹھاکر) اور ایسی ہی دوسری مثالیں آپ کے کلام منظوم و نثور میں پائی جاتی ہیں" (جمہور عشہ عامود ۲)

یہ عبارت اپنی جگہ پر مفید اور ایک دلچسپ لغوی بحث کا آغاز ہے مولانا نے جو کچھ بیان کیا وہ روشن حقیقت ہے یقیناً علامہ فضل حق خیرآبادی کی نظم و نثر میں اردو ہندی الفاظ عربی تصرفات کے ساتھ مستعمل ملیں گے چنانچہ چند الفاظ علامہ خیرآبادی ہی کے استعمال کردہ بطور مثال پیش کئے گئے لیکن ان الفاظ کے سلسلہ میں اگر مولانا کا موں پوری تحقیق سے کام لیتے تو قارئین کو زیادہ فائدہ پہنچتا اور ان کے مضمون کی قیمت بھی دوبالا ہوجاتی یا کم از کم یہی ثابت ہوتا کہ الفاظ مذکورہ علامہ خیرآبادی ہی کے تصرف و استعمال سے عربی زبان میں داخل ہوئے ہیں تو بھی اک بات ہوتی؛ ان الفاظ میں سے صرف خطوط الامان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس مرکب

صورت میں علامہ خیرآبادی ہی کے تصرف کا نمونہ ہے بقیہ الفاظ اگر علامہ کے کلام میں ملتے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں؛ ضرورت تو اس بات کی تھی کہ ایسے الفاظ چھانٹ کر پیش کئے جاتے جن کو مولانا خیرآبادی سے پیشتر کسی نے استعمال نہ کیا ہو؛ فاضل مضمون نگار کا بھی یہی مقصد تھا لیکن ایک لفظ کے سوا باقی الفاظ کی تاریخ استعمال کا انھوں نے خیال نہ کیا؛ واقعہ یہ ہے کہ "خطوط الامان" کے ماسوا لفظوں کا استعمال عربی زبان میں زمانۂ قدیم سے رہا ہے "التکاکرہ" کا استعمال مشہور مورخ البلاذری کی کتاب فتوح البلدان میں موجود ہے بلاذری کے یہ الفاظ ہیں؛ ولقیہ محمد والمسلمون وھو علی فیل وحولہ الفیلۃ ومعہ التکاکرۃ (ص ۴۳۸، س ۱۱، طبع دی خویہ، ۱۸۶۶ء) اسی طرح لفظ "روزن" جمع و مفرد بہر صورت عربی معاجم میں اس کا وجود قدیم ہے ابن سیدہ اور الازھری جیسے ائمہ لغت اس سے اچھی طرح واقف ہیں چنانچہ لسان کی عبارت ہے:۔ الروزنۃ: الکوۃ، وفی المحکم: الخرق فی اعلی السقف؛ التھذیب، یقال للکوۃ النافذۃ، الروزن. قال واحسبہ معربًا وھی الرواذن تکلمت بھا العرب (ج ۱۷/۳۹) دربان یا دربانیہ سے عرب جاہلیت بھی واقف تھے المثقب العبدی جسے ابن قتیبہ "جاہلی قدیم" کہتا ہے اسی کا ایک شعر ہے کہ:۔

فابقی باطلی والجد منھا کدکان الدرابنۃ المطین

سلسلہ تاریخ ملت نبی عربی صلعم

جس میں متوسط درجہ کی استعداد کے بچوں کے لئے سیرت سرور کائنات صلعم کے تمام اہم واقعات کو تحقیق، جامعیت اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ جدید ایڈیشن جس میں اخلاق سرور کائنات صلعم کے اہم باب کا اضافہ کیا گیا ہے اور آخر میں ملک کے مشہور شاعر جناب ماہر القادری کا سلام بہ درگاہ خیر الانام بھی شامل کر دیا گیا ہے کورس میں داخل ہونے کے لائق کتاب ہے زبان بہت ہی ہلکی اور صاف ہے قیمت ۶ؔ مجلد ۸ؔ

مکتبۂ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی

مسلمان حکومتوں کی موجودہ زبوں حالی

(ایک امریکن سیاح کے قلم سے)

از

(مولانا محمد ظفیر الدین صاحب پورنوی مفتاحی دارالعلوم دیوبند)

ابھی چند دن ہوئے کہ نگار سالنامہ ۱۹۵۸ء مولوی محمد یحییٰ صاحب ندوی کے ذریعہ ملا، یہ سالنامہ ایک امریکن سیاح کی ڈائری ہے، سیاح موصوف نے مشرق وسطیٰ کی ۱۹۵۷ء میں سیاحت کی ہے اور مسلمان حکومتوں کی اقتصادی زبوں حالی کا نقشہ پیش کیا ہے، اور بتایا ہے کہ ان ممالک میں مزارعین کی حالت کس قدر ناگفتہ بہ ہے، اور صنعت و حرفت کے اعتبار سے یہ اسلامی ممالک کتنے پیچھے ہیں، اور پھر اس نے ان حکومتوں کو مشورہ دیا ہے کہ اگر ابھی سے اس نے کسانوں اور مزدوروں کے حالات پر توجہ نہ دی اور ان کے مطالبات کو پورا نہ کیا تو ایک خونی انقلاب کا ہونا ضروری ہے۔

میں نے مناسب سمجھا کہ اس کے بعض ضروری اقتباسات ناظرین برہان کی خدمت میں پیش کر دیئے جائیں تاکہ یہ بھی جان لیں کہ ہم کتنے پیچھے ہیں اور ہم کو کیا کرنا چاہئے اور زمانہ کے مقتضیات سے چشم پوشی موت کے مرادف ہے۔ (ظفیر صدیقی)

امریکن سیاح مارس ھنڈس اپنی کتاب "ایک مستقبل کی تلاش میں" جو اس کا سفرنامہ ہے اس کے "پیش لفظ" میں ایشیا کے افلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ آنجہانی ولکی نے ایک دفعہ دوران ملاقات میں مجھ سے ایشیائی ملکوں کی پستی کے متعلق کہا

"ان کروڑوں کسانوں کے پاس اگر صرف اتنی زمین ہوتی کہ وہ سال میں ایک جوڑا کپڑوں کا۔ ایک جوڑا جوتا مع دو بنیان،

---

* اصل کتاب انگریزی میں ہے، اس کا ترجمہ اور تلخیص ہے "ایک مستقبل کی تلاش میں" یہ ترجمہ جناب لطیف الدین احمد کیا ہوا ہے ترجمہ بہت شگفتہ اور سلیس ہے ۱۲

دو قمیص اور دو موزے ہی خرید سکتے تو خیال کرو کہ ہم ان کے ساتھ کتنی بڑی تجارت کر سکتے تھے۔"

عرب کا افلاس | عرب کے افلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے

"میں ایک اسرائیلی گاؤں دیکھنے گیا تھا اور جب میں اس کے سرسبز کھیتوں میں گھوم رہا تھا، میں نے دیکھا کہ سیاہ چادریں اوڑھے عرب عورتوں اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے عرب بچوں کے ہجوم نے ایک یہودی کی گاڑی پر ہلہ بول دیا ہے میں نے اسے فرقہ واری بلوہ سمجھ کر گاؤں کے سکریٹری سے سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا، کہ بلوہ نہیں ہے، بلکہ جب کوڑے کی گاڑی آتی ہے تو یہ لوگ اس میں سے کچھ کارآمد چیزیں ڈھونڈھنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں اور گوبر وغیرہ چن لے جاتے ہیں"

طہران اور اس کا افلاس | سیاح موصوف نے اپنا سفر ایران سے شروع کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ طہران، ایران کا ایک بڑا اور خوش وضع شہر ہے اس کی آبادی ساڑھے سات لاکھ ہے۔ مگر یہاں ہوائی جہازوں کی آمد و رفت بہت کم ہے کیونکہ مسافروں کا آنا جانا اتنا کم ہے کہ ہوائی کمپنیاں اپنے اڈوں کے مصارف نہیں نکال سکتیں ——— طہران کی زبوں حالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے

"اس شہر کے حال و مزاج کا اندازہ یہاں کے فقیروں اور کتوں سے ہوتا ہے، افریقہ و ایشیا کے سارے فقیروں میں طہران کا فقیر بڑا مسکین و خوش مزاج فقیر ہے۔ یہاں ہر موڑ پر، ہر گلی کوچے میں میلے کچیلے، لنگڑے، لولے نظر آتے ہیں، کوئی میلا کچیلا پڑا رہا ہے تو کوئی سکڑا ہوا بیٹھا ہے، کوئی بے ٹانگوں کے گھسٹ رہا ہے، تو کوئی درخت یا دیوار کا سہارا لئے کھڑا ہے، ان کو کھانا راستے اور رخت یا تھ ہیں، جہاں بیٹھے ہیں وہیں سو جاتے ہیں، اور سوتے وقت اپنی ٹوپی الٹی کر کے رکھ دیتے ہیں تاکہ گذرنے والے خیرات کی یاد نہ بھولیں۔"

پھر طہران شہر کی سڑکوں اور بازاروں کا ذکر ہے، اور نئی ترقی جو شروع ہوئی ہے اس کا بیان ہے چنانچہ اس کو ختم کرتے ہوئے لکھتا ہے

"کہ طہران کا چہرہ جوان اور جسم بوڑھا ہے اور یہ کارنامہ ہے رضا شاہ پہلوی کا۔"

رضا شاہ کے کارنامے | اس کے بعد سیاح موصوف نے رضا شاہ پہلوی کے کارناموں کو بتایا ہے، جن کے متعلق وہ لکھتا ہے

"ایرانیوں نے صدیوں سے زندگی میں اتنا تیز انقلاب نہیں دیکھا تھا کہ سروں کی پگڑیاں، دم بھر میں ہیٹ کی صورت اختیار کرلیں اور لمبی عبائیں کوٹ، پتلون بن جائیں، ایرانیوں کے خواب میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ نقاب پوش خاتونیں دیکھتے دیکھتے نقاب ترک کر کے میم بن جائیں گی"

۱۹۳۶ء میں ایرانی عورتیں ریسٹوران اور سنیما گھروں میں داخل ہوئیں اور پھر ۱۹۳۶ء میں طہران گرل ہائی اسکول کی لڑکیوں نے ورزش کی نمائش کی، جس میں رضا شاہ خود اپنی ملکہ اور شہزادیوں کے ساتھ مغربی لباس میں تشریف لائے، آگے چل کر سیاح مذکور لکھتا ہے

طہرانی انسان اوسطاً ایرانی چھریرے بدن کا مستقل مزاج انسان ہوتا ہے، موٹا آدمی یہاں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے اور جب نظر آجاتا ہے تو انگلیاں بھی اٹھ جاتی ہیں ایک یونیورسٹی کے پروفیسر نے باتوں باتوں میں کہا کہ "ہمارے سب موٹے آدمی پارلیمنٹ میں ہیں" اس کا مطلب یہ تھا کہ الیکشن میں زیادہ تر تاجر اور زمیندار ہی چنے جاتے ہیں جن کو عمر بھر کوئی کام نہیں کرنا پڑتا، اور عیش و آرام آدمی کو موٹا بنا ہی دیتا ہے"

سیاح موصوف کہتا ہے کہ میں نے ایک طہرانی ادیب سے سوال کیا، کیا آپ کے ملک میں لوگ خودکشی بھی کرتے ہیں؟ اس نے جواب دیا۔

"ہاں، مگر بہت کم، کیونکہ ہماری قوم بڑے بڑے دشوار حالات سے گذر چکی ہے، اور نوہ (؟) صحرا نے ہماری زندگی کو صعب دشوار بنا دیا ہے اس لئے کوئی مصیبت ہمیں مایوس نہیں کرتی، ہم ہر حالت میں جئے جاتے ہیں"

جفاکشی اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ طہران میں لوگ رات دن کام میں مشغول رہتے ہیں قاہرہ میں دیکھا لوگ کھانے پکانے میں منہمک ہیں مگر یہاں اس کے بالکل الٹا معاملہ ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے

"لیکن جب میں طہران کے گلی کوچوں میں گھوما تو وہ سوال الٹا ہو گیا یعنی ایرانی زراعت و آرام کس وقت کرتا ہے؟ گرمی کے موسم میں طہران کی تمام دکانیں زیادہ دیر تک بند رہتی ہیں اس وقفے کے علاوہ میں نے ایرانیوں کو ہر وقت مصروف اور کام کرتے دیکھا، شاید کام کرتے رہنا ایرانی خون میں داخل ہے، ہر ایرانی جو طبقۂ اشراف میں شمار نہیں ہوتا، ہر وقت مصروف نظر آنے لگا"

ایرانی اشراف کی غلط ذہنیت ایرانی اشراف تاجر، زمیندار اور تعلیم یافتہ طبقہ کی غلط ذہنیت کی نشان دہی کرتے

ہوئے لکھتا ہے

"اشراف ایرانی بے شک اپنے ہاتھ سے کام کرنے کو ذلیل سمجھتے ہیں، تاجر و زمیندار کی طرح اہل فن (مثلاً انجینئر وغیرہ) بھی اس بیماری میں مبتلا نظر آتے ہیں، اور اپنے ہاتھ سے کوئی کام نہیں کرتے، ہر کام کے لئے نوکر کی ضرورت پڑتی ہے ایرانی سرمایہ داروں میں آپ کو کوئی ایسا آدمی نہ ملے گا، جو امریکی سرمایہ دار کی طرح ضرورت کے وقت آستینیں چڑھا کر کام میں لگ جائے، جنگ کے زمانہ میں جب ایران میں امریکی فوجوں کے افسر راستے میں خود اپنی موٹر درست کرنے لگتے تو اس منظر سے ایرانی شرفا کو حیرت ہوتی تھی":

سیاح نے ان حالات پر اپنے تاسف کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ تعلیمات کے پیش نظر ان کا یہ غلط رویہ حیرت انگیز ہے، کوئی شبہ نہیں کہ ان کی یہ روش اس دور میں بے حد حیرت انگیز ہے جب کہ دنیا کا نعرہ ہے کہ "جو کمائے گا سو کھائے گا" اور اسلامی نقطۂ نظر سے جتنا غلط ہے اس کی تو کوئی مثال نہیں،

ایرانیوں کا عیب | ایرانی پارلیمنٹ کے ایک ممبر علی دشتی کا یہ قول جو سیاح نے نقل کیا ہے سننے کے لائق ہے

"ہمیں خودستائی کا مرتکب نہ ہونا چاہئے، اگر کسریٰ نے کسی عہد میں ساری دنیا فتح کر لی تھی، تو کیا، آج تو حالت یہ ہے کہ جتنے غدار و خائن ایران میں ملیں گے، کسی دوسری قوم میں نہیں ملیں گے، اور جس طرح ایران میں ایسے لوگ قانون کی زد سے محفوظ ہیں، ویسے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہوں گے":

ایرانیوں کے جھوٹ بولنے کے متعلق بھی سیاح نے وہاں کے تعلیم یافتہ کے اقوال نقل کئے ہیں چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ طہران پہنچنے کے چند ہی دن بعد مری ایک انگریزی تعلیم پائے ہوئے سے ملاقات ہوئی، اس نے مجھ سے کہا

"ایرانیوں کے متعلق پہلے تمہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ بہت جھوٹے ہیں":

ایک جگہ اور اس نے لکھا ہے کہ

"ایران کی سیاست میں ریشہ دوانیوں اور دروغ بافیوں نے ایران کے سنجیدہ لوگوں کو اس قدر بے زار کر دیا ہے کہ مجلس کے ایک ممبر نے دوران گفتگو میں مجھ سے کہا کہ "مرا کتہ البتہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا":

ایران میں سماجی خرابیاں | ایران کی سماجی زندگی میں سیکڑوں خرابیاں ہیں، چنانچہ سیاح موصوف کہتا ہے کہ وہاں زمینداروں کا تسلط ہے اور وہ کبر و نخوت کے پتلے ہیں، کوئی سیاح ان کے یہاں جاتا ہے تو وہ یہ کہہ کر خوش ہوتے ہیں کہ آپ "مرے گاؤں میں تشریف لائے" ان کے پاس کافی گاؤں ہوتے ہیں، اور وہ اس پر فخر کرتے ہیں، اس نے ایک زمیندار کا واقعہ لکھا ہے کہ اس سے جب میں نے پوچھا آپ کے پاس کتنے گاؤں ہیں تو اس نے بتایا کہ وہ بائیس گاؤں کا مالک ہے، سیاح کہتا ہے کہ "ایران میں اسی فیصدی زمین زمینداروں کی ملکیت ہے، اس لئے ان کے اندر ملکیت کا شعور جڑ پکڑ گیا ہے، یوں تو کسانوں پر کوئی پابندی نہیں، اس کو اختیار ہے جہاں چاہے جا سکتا ہے اور اونچے سے اونچے مرتبے تک پہنچ بھی سکتا ہے، مگر ایران کا دیہاتی اپنی تمام نارسائیوں کے باوجود اپنی جگہ نہیں چھوڑتا اور الیکشن میں زمیندار کی مرضی کے مطابق پارلیمنٹ کا ممبر منتخب کرتا ہے۔

ایران میں اول اور تیسرے درجہ کے لوگ ہیں درمیانی درجہ کا پتہ نہیں، یعنی کچھ لوگ تو ضرورت سے زیادہ مالدار ہیں اور بڑی تعداد نان شبینہ کو محتاج۔ چنانچہ سیاح لکھتا ہے۔

"ایران میں اگرچہ ہندوستان کی طرح نیچے اونچے نہیں ہیں، لیکن اول درجے اور تیسرے درجہ کے لوگ ایرانی سماج میں بھی ہیں، دوسرے درجہ والے اول تو وہاں ہیں نہیں، اور اگر چند نفوس ہیں، تو وہ آسانی سے اول یا تیسرے درجہ میں رکھے جا سکتے ہیں اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ایرانی سماج میں درمیانی کڑی غائب ہے۔"

دارالسلطنت کا حال | طہران کے متعلق لکھتا ہے گو بڑا شہر ہے، مگر کارخانے اور قابلِ ذکر فیکٹریاں نہیں ہیں، ہاتھوں اور سادہ اوزاروں سے البتہ چیزیں بنائی جاتی ہیں اور عمدہ اور نفیس بنائی جاتی ہیں، اور خود ہی بناتے ہیں اور خود ہی اسے بازار میں فروخت کرنے کے لئے لاتے ہیں

تعلیم کے متعلق اس کا بیان ہے کہ

"ایران میں جبریہ و لازمی تعلیم کا قانون جاری ہے، لیکن یہ عام تعلیم آج کی حقیقت نہیں کل کی آرزو ہے، وزیر تعلیم ڈاکٹر صادق کے قول کے مطابق ۱۹۲۶ء میں ساڑھے تین لاکھ سے کم بچے اسکولوں میں جاتے تھے اور اب بارہ لاکھ سے کم نہیں جاتے۔"

اخبار اور پریس کے متعلق اس کا بیان ہے

"ایران کی راجدھانی میں سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار" اطلاعات" ہے لیکن اس کی اشاعت بھی تیس ہزار سے زیادہ نہیں چار ہزار کی اشاعت والا اخبار بھی کامیاب سمجھا جاتا ہے۔"

وہاں کے ادبی ذوق کے متعلق لکھتا ہے کہ ایران غیر ملکی مطبوعات کا بھوکا ہے لیکن اسے افسانوی ادب سے کوئی لگاؤ نہیں، پچھتر سال ہوئے کہ ناصر الدین شاہ قاچار نے یورپ کا سفر کیا تھا اس وقت سے یورپ خاص کر فرانس کے مستند ادیبوں کی دو ہزار کتابوں کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے، نیا ایرانی نئے زمانہ کو سمجھنا چاہتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اس کو اس زمانہ اور اس کے لوازمات سے مفر نہیں، گو وہ اس سے بچنا اور اسے بدلنا بھی چاہتا ہے۔

شیراز کی خصوصیات شیراز کو اس سیاح نے "عقل و دانش کا مسکن" کہا ہے اور وہ لکھتا ہے کہ شیراز کا نام اہل ملک بڑی عزت سے لیتے ہیں، عیب جوئی دوسرے شہروں کی تو کر سکتے ہیں، مگر اس شہر شیراز کی نہیں، حافظ و سعدی جو ملک کے محبوب و مقبول شاعر تھے، یہ بزرگ شیراز ہی میں مدفون ہیں اور ان کے مزار صدیاں گذر جانے کے بعد بھی زیارت گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں، خاص کر جمعہ کے دن یہاں مزار پر کافی ہجوم رہتا ہے، اور چائے بنتی ہے اور لوگ غزلیں گاتے اور سنتے ہیں، شیراز میں تقریباً سب شاعری کا ذوق رکھتے ہیں۔

شیراز کی آبادی ایک لاکھ ہے، افلاس ایران میں یوں تو عام ہے مگر شیراز میں افلاس اور بھی زیادہ ہے با ایں ہمہ یہ ایک زندہ دل شہر ہے اور ادبی اور کلچری مستقر ہے، سیاح نے اس کی خوبصورتی اور دل آویزی کی کافی تعریف کی ہے،

شیراز کی عورتیں شیراز کی عورتوں کے متعلق لکھا ہے کہ بہت خوبصورت اور حسین ہوتی ہیں تعلیم سے محروم ہیں مگر نقاب ڈالنے کو عیب سمجھتی ہیں ہر قسم کی روشن خیالی سے محرومی کے باوجود برقعہ اوڑھنے پر راضی نہیں، یہاں کی عورتیں بلا تکلف اور کسی جھجک کے بغیر دوکانداری کے فرائض انجام دیتی ہیں یہاں کی عورتیں بکثرت سگریٹ بھی پیتی ہیں، پیشہ ور عورتیں بھی ہیں اور بڑی بے جھجک ہیں لوگوں کو بڑی دلیری

سے مخاطب کرتی ہیں، بالکل ویسی ہی جیسے یورپ کے بڑے شہروں میں،

صوبہ فارس کی حالت | پورے صوبہ فارس کی آبادی بیس لاکھ ہے، اور ملک کا یہ علاقہ بڑا زرخیز اور ہرا بھرا ہے زمین ہمہ قسم کی صلاحیت رکھتی ہے مگر آبپاشی کا انتظام نہیں، رکناباد کو خشک ہوتے دیکھ کر کنواں کھودنے کی طرف توجہ دی جا رہی ہے، ایک یورپی انجنیر نے ایک کنواں کھودا تو فی گھنٹہ بیس ہزار گیلن پانی دینے لگا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی زمین کے نیچے پانی کا بڑا ذخیرہ ہے،

بھکاریوں کا چھتہ | سیاح لکھتا ہے

"شیراز کو بھکاریوں کا چھتہ کہنا مبالغہ نہیں، ایران کے دوسرے شہروں میں اپاہج اور ناکارہ لوگ بھیک مانگتے نظر آتے ہیں، مگر شیراز میں کینے کے کینے یہی پیشہ کرتے ہیں، بوڑھے، جوان، مرد اور بچے ٹولیاں بنا کر مانگتے ہیں"

مزدوروں کی تعداد اور بیکاری | شیراز میں مزدوروں کی تعداد پچاس ہزار سے کم نہیں، جس میں سے فیکٹریوں میں جو کام کرتے ہیں ان کی تعداد صرف دو ہزار ہے، سرکاری محکموں میں تین ہزار آدمی مصروف ہیں، مگر ان میں نصف تعداد فالتو ہے، پینتیس ہزار ایسے ہیں جو گھر میں رہ کر کچھ نہ کچھ کرتے ہیں اور اتنا حاصل کر لیتے ہیں جو ان کی چلتی سانس کو باقی رکھ سکے، یعنی بھر پیٹ کھانا، ضرورت کے مطابق کپڑا اور دوسری ضروریات کے لئے یہ ترستے ہیں باقی دس ہزار کے متعلق سرکاری رپورٹ ہے کہ بالکل بے کار اور بے روزگار ہیں

جہالت | گو شیراز ذوقِ شاعری میں سب سے آگے ہے مگر باایں ہمہ یہاں کی نوے فیصدی آبادی بے پڑھی لکھی ہے صرف دس فیصدی تعلیم یافتہ ہیں، اس شہر میں اخبار آٹھ نکلتے ہیں لیکن ان کی مجموعی اشاعت تیس ہزار سے زیادہ نہیں، ان میں سے ایک اخبار بھی روزانہ نہیں ہے اس پوری آبادی میں صرف دو ہائی اسکول ہیں، کالج اور یونیورسٹی ایک بھی نہیں ہے،

مذہبی حالات کا اس ایک واقعہ سے اندازہ لگائیے، جو وہاں کے ایک نوجوان مجسٹریٹ کا بیان ہے

"آپ جانتے ہیں کہ میں ایک اچھا مسلمان ہوں، مگر مسجد میں کبھی نہیں جاتا اس لئے کہ مجھے ملا سے سخت نفرت ہے، . . . . میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں، کہ میں ترکِ وطن کا ارادہ کر رہا ہوں، کیونکہ وطن کے اندر حالات سخت حوصلہ فرسا اور مایوس کن ہیں"

جو لوگ باہر جا چکے ہیں وہ بھی اور دوسرے بھی چاہتے ہیں کوئی عوامی تحریک اٹھے جس میں غیر ملکیوں کا ہاتھ نہ ہو

قبیلہ کاشغئی | صوبہ فارس میں ایک پہاڑی علاقہ قبیلہ کاشغئی کا مسکن ہے، اس کے متعلق امریکن سیاح رقمطراز ہے۔

"یہ علاقہ سورج کی گرمی سے جھلسا ہوا بیابان ہے، اور جہاں تہاں خیموں اور جھولداریوں کی بستیاں آباد، بھیڑوں کے گلے ہیں اور یہی ان لوگوں کا ذریعہ معاش ہے، اونچے پہاڑوں کے بیچ میں وسیع وادی کا یہ علاقہ، قبیلے کے بانی نے غالباً جنگی مصلحتوں کی بنا پر منتخب کیا ہوگا، اس علاقہ پر اچانک حملہ ہو جانا ناممکن ہے"

پھر آگے لکھتا ہے

کاشغئی لوگوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے، جفاکش، دلیر، شہ سوار اور بلا کے نشانہ باز ہیں ان کا رہنا سہنا خیموں کے اندر ہے قالینوں کا استعمال انتہائی آرام و راحت کی دلیل ہے، قدامت سے محبت ہے اور جدید روشنی اور ان کی برکات سے نفرت"

کاشغئی لوگ شکار و سیر کے دلدادہ ہیں، ان کے اکثر افراد گھوڑے پر سوار اور کندھے پر بندوق دھرے دکھائی دیں گے، ہر گھر میں ایک بندوق اور ایک گھوڑے کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے،

مذہبیت اور دلیری | کاشغئی قبیلے کی عورتیں بھی بہادر اور دلیر ہیں، یہ بھی شہ سواری کرتی ہیں، ان میں پردہ نہیں ہے بالکل آزاد ہیں، مردوں اور عورتوں میں بڑی حد تک مساوات ہے مگر یہ باہر کہیں نہیں جاتیں، گھر کے کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔

اس قبیلہ کے مرد عورت سب کٹر مسلمان ہیں، ایمان و عقیدہ میں بہت پختہ ہیں، ایمان اور اسلام کے نام پر جان قربان کر سکتے ہیں، ایک خاص بات یہ ہے کہ ان کی گردنوں میں قرآن حمائل نظر آتا ہے اور ان کا عقیدہ ہے کہ اس سے بلائیں پاس نہیں آتی ہیں، یہ شراب بالکل نہیں پیتے،

عموماً یہ لوگ ایک ہی بیوی رکھتے ہیں، ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کے واقعات شاذ ہیں طلاق کی نوبت تقریباً کبھی نہیں آتی، یہ ان کے یہاں بڑا عیب ہے، اسی وجہ سے یہ اپنی لڑکیاں غیر کاشغئی سے

نہیں بیلتے، کہ شاید وہ طلاق دے دے، سولہ سال سے پہلے ہی لڑکی کی شادی کردی جاتی ہے البتہ مرد جلدی شادی نہیں کرتے، ان کے یہاں جب شادی ہوتی ہے تو بندوقیں داغی جاتی ہیں،

صحت اور مسئلہ تعلیم | اس قبیلہ کی صحت قابلِ رشک ہے، یہ ملیریا، چیچک، ٹائیفائڈ اور دوسری وبائی بیماریوں سے محفوظ ہیں، یہاں کبھی خودکشی کے واردات نہیں ہوتے، ہاں اس علاقہ میں اسپتال، اسکول، ریڈیو اور سینما وغیرہ نہیں ہیں، جو لوگ خوش حال ہیں وہ معلم رکھ کر اپنے بچوں کو تعلیم دلاتے ہیں، شاعری کا شوق یہ لوگ بھی رکھتے ہیں، گو علم میں بہت پیچھے ہیں،

ایران کی ایک کروڑ ساٹھ لاکھ آبادی میں اندازہ ہے کہ قبائل کی تعداد تین یا چالیس لاکھ کے درمیان ہے

سردار قبیلہ کی رائے | سیاح مذکور کا بیان ہے کہ میں نے علاقہ سے واپس آکر اس قبیلے کے سردار سے پوچھا کہ اپنے مستقبل کے متعلق کیا خیال ہے ؟ تو اس نے جواب دیا،

"آپ ہمارے علاقے میں گھوم کر آئے ہیں آپ نے دیکھا ہوگا کہ باقی تمام ایرانیوں کے مقابلہ میں ہم لوگ بہتر زندگی گذار رہے ہیں، ہم آزاد ہیں ہم نے اپنی عورتوں کو دبا کر نہیں رکھا ہے، ہماری صحت سارے ایرانیوں سے بہتر ہے، ہمیں نہ زمیندار کا ڈر ہے نہ جندرمہ (پولیس) کا خوف،

جب ہمارا ملک ایران ترقی کی اس منزل پر پہنچے گا کہ تمام کاشتکاروں کے پاس فولادی ہل ہوں، دیہات میں بجلی پہنچ جائے، ڈاکٹر دستیاب ہونے لگیں، اسپتال کافی بن جائیں، لوگوں کے رہنے کو کافی مکان ہیں، پینے کو صاف اور عمدہ پانی ملے، اور پولیس کے جبر و تشدد کا خاتمہ ہو، اس وقت کاشغئی خانہ بدوشی ترک کرنے پر سوچ سکے گا۔

سیاح کہتا ہے میں نے توجہ دلائی کہ

"آپ مانیں گے کہ کاشغئی لوگ اس سے بہت زیادہ کر سکتے ہیں، جتنا وہ کر رہے ہیں، اور ان کی بڑی قوت ضائع ہو رہی ہے، انھوں نے مویشیوں کے چرانے کے لئے لاکھوں ایکڑ اراضی کو چراگاہ بنا رکھا ہے جہاں غلہ بھی اور ترکاریاں پیدا ہو سکتی ہیں، اسی طرح اس پر بھی غور کیجئے کہ صحیح علاج دستیاب نہ ہونے سے کتنے مویشی ضائع ہو جاتے ہیں"

اس نے جواب میں کہا مجبوری کی وجہ سے بے شک ایسی بات ہے مگر ہمارے علاقہ میں کوئی بھکاری تو نہیں ہے،

علاقہ بحر قزوین | بحر قزوین کے علاقہ میں سیاح پہنچا تو سب سے پہلے یہ ایرانی اخلاق سے متاثر ہوا، چنانچہ وہ سب سے پہلے ایک یورپی مصنف کا قول نقل کرتا ہے جو کافی مدت ایران میں قیام کر چکا ہے مصنف لکھتا ہے

"ایرانیوں کو خلق و تواضع کی تعلیم درکار نہیں، یہ وہ ماں کے پیٹ سے ساتھ لاتے ہیں"

اس قول کو نقل کر کے سیاح کہتا ہے کہ اس قول کی تصدیق جہاں بھی میں ایران میں گیا ہوئی، بحر قزوین کا یہ علاقہ گیلان کہلاتا ہے، یہاں کے مکانات بہت خوبصورت ہیں، رہن سہن پاکیزہ ہے یہ علاقہ زرخیز اور شاداب ہے مگر ملیریا کا گھر ہے، یہاں گھروں میں چٹائیوں اور قالینوں سے کام لیا جاتا ہے ان کے علاوہ یہاں گھروں میں اور کوئی فرنیچر نہیں،

حالات | سیاح کہتا ہے کہ یہاں کی عورتوں کے اخلاق اور سلیقہ مندی سے میں بے حد متاثر ہوا، یہاں کی عورتیں بہت پاکیزہ رہتی ہیں، پردہ یہاں بھی نہیں ہے مگر ہیں یہ مسلم عورتیں، کاشتکاری کا سارا بوجھ غریب عورتوں نے اپنے کندھوں پر لے رکھا ہے، کاشتکاری پرانے طرز پر ہوتی ہے، لکڑی کا ہل ہے، بوجھ سر پر اٹھا کر لاتے ہیں، ٹھیلہ گاڑی کا پتہ نہیں، یہاں عموماً ایک ہی بیوی کا رواج ہے، ایک گیلانی نے ایک سوال کے جواب میں کہا وہ کوشش تو یہی کرتی ہے کہ دوسرا نکاح نہ ہو، میکے بھی چلی جاتی ہے لیکن پھر آجاتی ہے یہاں طلاق کی نوبت بہت کم آتی ہے،

یہاں سڑکیں کم ہیں، چنانچہ بعض موسموں میں یہ علاقہ شہر سے کٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے، گاؤں والے طبی امداد سے قطعاً محروم ہیں، ـــــ گیلان میں بٹائی کا طریقہ رائج ہے، آدھا غلہ کسان کو مل جاتا ہے اور کچھ اور رعایتیں بھی حاصل ہو جاتی ہیں، گھر کے ساتھ ایک باغیچہ ہوتا ہے، جس میں ضروریات کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، جیسے پھل، ترکاریاں، ٹماٹر، کھیرے، خربوزے اور لہسن پیاز وغیرہ یہاں پہنچکر سیاح لکھتا ہے

زراعتی پستی | ۰۰ ایران کی زراعتی پستی موت کے پنجہ کی طرح پورے ملک پر چھائی ہوئی ہے، اس کے خوش حال گاؤں میں ہل تو بے شک جانور کھینچتے ہیں، باقی تمام کام صرف ہاتھ سے انجام پاتے ہیں، گیلان کا پورا علاقہ چاول کی کاشت کرتا ہے . . . . . . اوسطاً ہر خاندان ڈھائی ایکڑ سے زیادہ کاشت نہیں کرتا، کیونکہ دھان کی فصل بہت محنت چاہتی ہے، اس میں سے کسان کو آدھا چاول ملتا ہے جو تیس چالیس بوشل کے درمیان ہوتا ہے، قرض ادا کرنے اور ضرورت کی چیزیں خرید نے کے بعد اس کے پاس موسم بہار کے ختم ہونے سے پہلے غلہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ نیا قرض لینے پر مجبور ہوتا ہے، قرض کا سود دو گنا ہوتا ہے، اس مخصوص گاؤں کے بھی سب کسان مقروض رہتے ہیں، اس گاؤں کے لوگوں کی خوش پوشاکی امریکہ سے آئے ہوئے پرانے اور استعمالی کپڑوں کی بدولت تھی، سیاح کہتا ہے کہ ایک شخص نے کہا" سڑکیں نہ ہونا، قرض اور بخار ایران کی تین لعنتیں ہیں، خود اس گاؤں کے نوے (۹۰) فی صدی باشندے ملیریا کے شکار تھے، اور ان میں صرف چند ایسے تھے جنہیں کونین نصیب تھی"

اتحاد اور پاکیزگی | یہاں کے میلہ کا تذکرہ کر کے سیاح کہتا ہے، کہ عوام کو میں نے بڑا خوش دیکھا اور آپس میں یہ بہت گھلے ملے، یورپ کی طرح یہاں شراب کا نشہ نہیں دیکھنے میں آیا، یہاں شراب کی کوئی دکان بھی نظر نہ آئی، چونکہ یہ مسلمان ہیں شراب حرام سمجھتے ہیں، زیادہ سے زیادہ چائے کا دور چلتا ہے سینما کا کوئی نام بھی نہیں جانتا، پوری زندگی میں ان لوگوں نے ایک مرتبہ سینما دیکھا ہے اور وہ بھی جنگ کے زمانہ میں، جب برٹش قونصل کی طرف سے انتظام ہوا تھا،

زمینداروں کا تسلط | زمیندار بڑی تعیش کی زندگی گذارتے ہیں، عوام کو معمولی سواری بھی میسر نہیں ہے مگر زمیندار موٹر پر دوڑے پھرتے ہیں، ان زمینداروں کے کارندے بڑے ظالم ہوتے ہیں، وہ ان سے پناہ مانگتے ہیں، عوام میں زمینداروں کے خلاف جذبات بہت کافی ہیں، کیونکہ ان کے کارندے سراپا ظلم ہیں حد یہ ہے کہ پانی بند کر دیتے ہیں، سیاح کہتا ہے کہ میرے ایک ساتھی نے کہا

"ہمارے علاقے میں چاول، چائے، تمباکو، اور ریشم کی قیمتی پیداوار ہوتی ہے اور اس کو ہم بڑھا بھی سکتے ہیں آراضی کی استعداد بھی بہت بڑھائی جا سکتی ہے لیکن زمینداروں کو پروا نہیں، اور کسان میں اتنی نہیں، چاول

کی کاشت میں مشینوں سے اسی طرح کام لیا جا سکتا ہے، جیسے امریکہ میں لیتے ہیں، لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے ہم ملیریا کو بھی ناپید کر سکتے ہیں، لیکن نہیں کرتے، حکومت کے پاس پیسہ نہیں اور کسان قلاش ہے اور زمیندار اپنی دولت غیر ملکوں میں عیاشی کی زندگی بسر کرنے میں خرچ کر رہا ہے"۔ ——— حل پوچھنے پر جواب دیکر بیٹھ گئے۔

تبریز اور اس کے حالات | آذر بائیجان کا مستقر تبریز ہے۔ یہاں کے لوگ شاعری کے شیدا ہیں، ..... یہ لوگ بہت خود دار ہیں، یہ غیر سے بھیک نہیں مانگتے، یہاں لوگ اعلیٰ درجہ کے دستکار ہیں، تبریز کی آبادی ڈھائی لاکھ ہے، سارے شہر میں ایک لائبریری ہے کل ۴۳۰ ٹیلیفون ہیں، ایک روزانہ اخبار ہے جس کی اشاعت ہزار سے بھی کم ہے، دوسرا سہ روزہ ہے اس کی اشاعت اور بھی کم ہے، ایک اور اخبار نکلتا ہے مگر اس کا کوئی وقت نہیں، ماحصل یہ ہے تعلیم کا نظم ناکافی اور برائے نام ہے۔

تبریز میں سب سے حیرت انگیز یہ بات نظر آئی کہ یہاں کی مسلمان عورتیں حد درجہ محتاط اور شریف ہیں رضا شاہ نے اپنے وقت میں پردہ ترک کرا دیا تھا مگر انھوں نے پھر اختیار کر لیا، عورتیں باہر سیاہ برقعہ میں آتی ہیں رمضان میں کوئی کھانے کی دکان کھلی نہیں رہ سکتی، مسلم کی ہو یا غیر مسلم کی، مذہبی لوگوں کا یہاں بہت کافی اثر ہے، آذر بائیجان کا دوسرا بڑا شہر رضائیہ ہے، اس کی آبادی ۴ لاکھ ہے یہاں کسانوں کی اکثریت ہے اور اچھی بات یہ ہے کہ ان کی اکثریت خود زمین کی مالک ہے، یہ ایران کے لئے غلہ فراہم کرتا ہے، یہاں انگور کشمش اور خوبانیاں بکثرت ہوتی ہیں، ناسپاتیاں خاص کر بہت عمدہ پیدا ہوتی ہیں ترکاریاں بھی ہوتی ہیں اور بکثرت،

مزدور اور کسان کی حالت زار | اس علاقے میں فصل پانچ حصوں میں بانٹی جاتی ہے، ایک حصہ زمین کا، دوسرا پانی کا تیسرا بیج کا، چوتھا بیل کا اور پانچواں کسان کا، جس کسان کے پاس اپنا ہل ہے وہ چالیس فی صدی پالیتا ہے ورنہ بیس فیصدی پر قناعت کرنا پڑتی ہے، بیج بالعموم زمیندار ہی سے لینا پڑتا ہے، کیونکہ اپنا غلہ تو وہ کھا چکتا ہے..... کسان بدستور فاقہ زدہ ہے" زمیندار اور پولیس کے مظالم بے انتہا ہیں وہ غریب کسان سے بغیر کسی قانون کے اپنے لئے دو سو ریال وصول کر لیتے ہیں، ایک ایرانی مصنف کا قول سیاح نقل کرتا ہے کہ اس نے مجھ سے کہا

"ہمارا ملک اس آدمی کی طرح ہے جو سونے کے تخت پر بیٹھا ہو، مگر بھوکا ہو" ———

پھر اس کے قول پر سیاح لکھتا ہے

"بلاشبہ آذربائیجان کی حالت اس قول کی شرح و تفسیر ہے، جدید آلات سے کام لیا جاتے تو یہ علاقہ فی الواقعی سونا اگلے، لیکن زمیندار ترقی کرنے کی خاطر روپیہ لگاتے، اور بغاوت ہو جائے تو اس کی دولت گئی! یہ خطرہ ہر وقت زمیندار کے سامنے ہے اس لئے وہ طہران میں بیٹھا چین کر رہا ہے"

سیاح موصوف نے تودہ پارٹی کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے اس نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام دیتے اور کہا ہے کہ اب بھی اس کے اثرات دماغوں میں موجود ہیں مگر وہ اپنی سیاحت کے زمانہ کے متعلق کہتا ہے

"تبریز خاموش تھا، زندہ دلی کے آثار مفقود تھے، اقتصادی بدحالی شدید تھی، دن بھر کی مزدوری چھ تومان (ایک سکہ ہے) تھی حالانکہ گدھے کا کرایہ دن بھر کے لئے سات تومان ہوتا ہے، کاروبار سرد تھا، کیونکہ سرمایہ دار کو ڈر تھا کہ روس صرف اسی میل پر ہے"

عوام کی بے اطمینانی | سیاح کہتا ہے عوام میں اطمینان نہیں، "سوویت کے خیالات پھیل رہے ہیں، جن اسباب نے پہلا انقلاب کرایا، ان کی جڑیں زمین کے اندر ہیں، اور وہ اب بھی جیسے کے تیسے موجود ہیں اور حکومت طہران صرف امریکہ کا آسرا تک رہی ہے لیکن امریکہ کی امداد گولے برسا کر آبادیاں تو تباہ و مسمار کر سکتی ہے بھوکوں کا پیٹ نہیں بھر سکتی، ایرانی عوام کے لئے روٹی مہیا کرنا تو طہرانی حکومت ہی کا کام ہے اور وہی کر بھی سکتی ہے"

امسار اور اس کی خوبصورتی | شمالی صوبہ مازندان کے شہر "امسار" کی سیاح بڑی تعریف کرتا ہے، یہ شہر رضا شاہ نے اپنی جیب خاص سے روپے خرچ کر کے بنوایا تھا، بہت حسین اور جدید تمدن سے آراستہ ہے، سیاح اس کی جاذبیت سے متاثر ہو کر کہتا ہے "ایران تو کیا غالباً سارے ایشیاء میں (ایسا شہر) میسر نہ ہو گا" ایک دوسری جگہ کہتا ہے کہ یہ شہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کا کوئی شہر اٹھا کر یہاں بسا دیا گیا ہے "یہاں کے ہوٹل کی بڑی تعریف کی ہے اور اس کے دلکش حسن کا منظر کھینچا ہے، امسار کے ایک ایرانی سائنسداں کی بات

نقل کرتا ہے کہ اس نے کہا

رضا شاہ سے عقیدت | "ہمارے ملک میں دولت کی کمی نہیں، ہم فرانس سے زیادہ متمول ہیں، ہمارے زرعی وسیلے جرمنی سے زیادہ ہیں، لیکن رضا شاہ کی معزولی کے وقت سے ہم بے حس و حرکت کھڑے ہیں کچھ کر نہیں رہے ہیں"

رضا شاہ اصفہان آیا، اس نے وہاں سرمایہ داروں کو مجبور کیا کہ مل قائم کریں چنانچہ کپڑے کی ملیں قائم ہو گئیں اور ان سے کافی نفع ہو رہا ہے پھر بھی ان ملوں کے لئے ترقی کی گنجائش ہے،

تساہل اور عدم توجہی | سیاح کہتا ہے کہ ایران امریکہ کے آسرے پر جی رہا ہے، حالانکہ خود ایرانی زمیندار عقل سے کام لیں تو ملک بڑی آسانی سے ترقی کر سکتا ہے، امریکہ کے قرض کی نوبت بھی نہ آئے۔

ایران کے ارباب حکومت بھی چوری کرتے ہیں چنانچہ ایک پروفیسر کا بیان ہے

"ہمارے ملک میں لوگ صرف زمینداری اور تجارت ہی سے روپیہ نہیں کماتے بلکہ سیاست کو بھی نفع بخش بنالیتے ہیں" ایک ممتاز وکیل نے اعتراض کیا کہ "وہ دو کھاتے رکھ کر انکم ٹیکس کی چوری کرتے ہیں" مگر سیاح یہ بھی کہتا ہے کہ اگر تنخواہ بڑی دی جائے تو یہ چیز ختم ہو سکتی ہے اور اس سلسلہ میں نیشنل بنک کے ملازموں کا حوالہ دیتا ہے جو چالیس ہزار ملازموں کو مشاہرہ دیتا ہے اور دوسری رعایتیں بھی دیتا ہے، بنک کا گورنر ابوالحسن ابتہاج ہے، سیاح نے اس کا یہ قول نقل کیا ہے۔

"اگر اسٹیٹ بنک کے چار ہزار ملازم کامل دیانت اور وفاداری کے ساتھ کام کر سکتے ہیں تو چار لاکھ کو بھی ایسا بنایا جا سکتا ہے بشرطیکہ انھیں خدمت کا معاوضہ اتنا دیا جائے، کہ وہ لالچ کا شکار نہ بن سکیں"

ایران میں چائے بہت پی جاتی ہے، چار ہزار ٹن خود بھی چائے پیدا کرتا ہے، کچھ چائے باہر سے آتی ہے سیاح کہتا ہے "بحر قزوین کے علاقہ میں بیس ہزار ایکڑ زمین ایسی پڑی ہے جہاں چائے کی کاشت کی جا سکتی ہے"

اخیر میں سیاح کہتا ہے

"بہرحال دو باتیں اٹل ہیں۔ اس مشینی عہد کے زمانہ میں ایران کا جمود عرصہ تک قایم نہیں رہ سکتا اور ترقی و خوش حالی کے لئے جو پروگرام بھی بنایا جائے گا، اس کی ابتدا زمین اور کاشت کی اصلاح سے ہوگی"

قاہرہ اور اس کی حالت | ایران کے بعد سیاح مصر پہنچا ہے وہ قاہرہ میں اترتا ہے تو دیکھتا ہے زمانۂ جنگ کی ہما ہمی

ختم ہے، اور پھر پہلی سی کاہلی، چیخ و پکار اور عام پوشی ہے، گداگروں کی کثرت میں بھی کوئی کمی نہیں، خوانچہ فروشوں کی بہتات ہے اور زمانہ جنگ کی خوش حالی عنقا۔ ہوٹل خالی پڑے ہیں، بازار سامان سے بھرا پڑا ہے مگر کوئی خریدنے والا نہیں، دوکاندار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ——— سامان کی فراوانی سے سیاح متاثر ہے، وہ کہتا ہے

"یورپ کی فاقہ کشی کے بعد قاہرہ میں کھجور اور انجیروں کے انبار، کیلے، امرود کے ڈھیر، آموں کی افراط دیکھ کر حیرت ہوتی ہے"

قاہرہ کے متعلق سیاح کا بیان ہے، کہ قاہرہ میں عیش و عشرت کا بڑا سامان ہے، اتنا سامان کہ زیورچ اور جنیوا میں بھی جہاں ڈالر کی بے عد ارزانی تھی میسر نہیں، "شبینہ کلب، رقص گاہیں، خلنے اور سینما نہایت خندہ پیشانی سے سیاحوں کا خیر مقدم کرنے کو ہمہ وقت تیار تھے، ہر قسم کی عیاشی دسترس کے اندر تھی اور اس کے مہیا کرنے والے موٹر پر سیاحوں کا پیچھا کرنے کو موجود تھے۔

سیاح کہتا ہے یہ عجیب شہر ہے ایک طرف شدید بے روزگاری، دوسری طرف ہر طرح کے سامان کی افراط، ایک طرف قدیم اہرام اور عالی شان مسجدیں اور دوسری طرف نئے ڈیزائن اور جدید وضع کی دلکش کوٹھیاں، اور پھر تیسری طرف جھونپڑیوں کا جھرمٹ' ایک طرف شاندار موٹریں اور دوسری طرف اونٹوں اور گدھوں کے قافلے،

افلاس اور تباہی یہاں افلاس انتہا کو پہنچا ہوا ہے گو اس افلاس نے ان کے اخلاق و عادات کو پست نہیں کیا ہے، عورتیں بے نقاب بھی ہیں اور نقاب پوش بھی' یہاں لوگ بآسانی کئی زبانیں بول لیتے ہیں' کچھ لوگ سنجیدہ بھی ہیں مگر عموماً یہاں بلند آواز سے بولتے ہیں، سیاح کہتا ہے

"اسکندریہ کے شپرڈ ہوٹل سے پانچ منٹ چلئے تو آپ کو دنیا کی حقیر ترین بستیاں اور جھونپڑیاں دکھلائی دیں گی جہاں کی گندگی اور بو دماغ پریشان کر دے گی، جہاں بچوں کی اکثریت آنکھوں کی بیماری میں مبتلا نظر آئے گی، گداگر فٹ پاتھ پر لاشوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے نظر آئیں گے، مصر کی اوسط اموات ساری دنیا سے زیادہ ہے، ایک سال کے ہر چار بچوں میں سے ایک مرجاتا ہے"

قاہرہ کی بنیاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ۲۵ھ قبل مسیح میں پڑی تھی ۱۹۰۷ء میں اس کی آبادی چھ لاکھ سے کچھ زیادہ تھی مگر اب اس کی آبادی تقریباً بیس لاکھ ہے، اس شہر میں بے شمار شاندار مسجدیں ہیں اور ایک ہزار سالہ قدیم یونیورسٹی ہے جس کا نام "ازھر" ہے یہاں سترہ ہزار طلباء تعلیم پاتے ہیں، ان میں سے چھ ہزار دوسرے ملکوں کے ہیں، بقول ایک مصری عالم "قاہرہ اسلامی دنیا کا دھڑکتا ہوا دل ہے"۔

اخوت اسلام | قاہرہ میں ایک جماعت "اخوت اسلام" کے نام سے قایم ہے جو ہر نئی تحریک کی مخالف ہے اگریکلچر کالج کے طلبہ وطالبات اور پروفیسروں نے مل کر ایک "محفل رقص وسرود قایم کر رکھی ہے، جہاں بادۂ ارغواں کے دور بے تکلف چلتے ہیں، اخوت اسلام والے اس کی مخالفت کرتے ہیں، اخوت اسلام والے اسلام کا مذاق اڑانے والوں کے خلاف احتجاج کرتے رہتے ہیں —— سیاح اپنا ایک واقعہ لکھتا ہے

ایک عبرتناک واقعہ | "قاہرہ یونیورسٹی کے ایک طالب العلم نے ایک شام بدیعہ میں مدعو کیا، بدیعہ ایک نہایت فیشن ایبل اور مشہور ریسٹوران ہے، جہاں الازھر اور اخوت کی طاقت واثر کے باوجود نوجوان لڑکیاں ناچتی گاتی ہیں، اس مجلس میں شریک ہونے سے پہلے، میں تصور میں نہ لا سکتا تھا، کہ مسلم تماشائی ایسے منظر کو گوارا کر سکتے ہیں، خاص کر جس شہر میں جامعہ ازھر قایم ہو —— میں نے اپنے میزبان دوست سے سوال کیا کہ مسلمانوں کے اتنے بڑے مجمع میں اسلامی تعلیم کی یہ پامالی کیوں کر ممکن ہے —— تو اس نے کہا "یہ قاہرہ ہے"

سیاح مصر کی تضادِ طبیعت کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے "کہ ایک طرف مصر جو ڈالر کا بھوکا ہے یہ بھی چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ غیر ملکی سیاح یہاں آئیں ---- مگر دوسری طرف . . . غیر ملکیوں کے خلاف مظاہرے بھی کراتا رہتا ہے"۔

رشوت وغیرہ | سیاح مصر میں رشوت ستانی کی شکایت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "رشوت کا یہ عالم ہے کہ جو غیر ملکی مصر میں کاروبار کرتے ہیں وہ اپنا کام کسی دوسرے ملک میں منتقل کرنے کی فکر میں ہیں" قاہرہ کے متعلق کہتا ہے کہ جو یہ کرتا ہے وہی پورا مصر ملکہ عرب دنیا کا اکثر حصہ کرنے لگتا ہے۔ مصر میں کسانوں کی حالت نہایت خراب ہے، مگر کوئی پروا نہیں،۔

(باقی آئندہ)

مدرسہ عالیہ کلکتہ کی مختصر تاریخ

از

(جناب محمد عبداللہ صاحب ایم۔اے۔استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ)

" پچھلے دنوں مغربی بنگال کی حکومت کے محکمۂ نشر و اشاعت کی فرمائش پر جناب سعید احمد اکبر آبادی ایم۔اے پرنسپل مدرسہ عالیہ نے بنگال کی اس اہم اور قدیم تاریخی اسلامی درسگاہ کی مختصر تاریخ پر ایک مقالہ انگریزی زبان میں لکھا تھا جو حکومت مغربی بنگال کے آرگن "ویسٹ بنگال ویکلی" کی اشاعت مورخہ ۲۶ دسمبر ۱۹۵۲ء میں بڑے جلی عنوانات اور خاص اہتمام اور مدرسہ کی چند تصاویر کے ساتھ شائع ہوا اور اس کے بعد متعدد انگریزی اخبارات و رسائل نے اس کو اپنے ہاں نقل کیا۔ اب اردو خواں طبقہ کے افادہ کی غرض سے ہم اس کا اردو ترجمہ "برہان" کے ذریعہ پیش کرتے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کے لئے دلچسپی اور معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

(محمد عبداللہ)

کلکتہ مدرسہ ایک قدیم درسگاہ ہے جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں قایم کیا۔ اس کی ابتدائی تاریخ بورڈ آف ریونیو کی کارگذاری مورخہ ۱۷ اپریل ۱۷۸۱ء میں محفوظ ہے جسے اس وقت کے گورنر جنرل اور اس ادارہ کے بانی لارڈ وارن ہیسٹنگس نے قلمبند کیا ہے۔

گورنر جنرل موصوف کے بیان کے مطابق کلکتہ مدرسہ کے قیام کی سب سے بڑی وجہ ذیل کا واقعہ ہے

"ستمبر ۱۷۸۰ء میں چند مسلمان اکابرین اور اہل قلم حضرات ایک وفد کی شکل میں میرے پاس آئے اور ایک عرضی پیش کی جس میں یہ درخواست کی گئی تھی کہ ایک تعلیمی ادارہ کے قیام کے لئے میں مولانا مجدالدین نامی ایک شخص کو جو کہ حال ہی میں وارد صوبہ ہوئے تھے، اس پر آمادہ کروں کہ وہ یہاں رہ کر نوجوان طالب علموں کو قوانین اسلامی و دیگر علوم جو مسلم اداروں میں سکھائے جاتے تھے سکھائیں اور یہ کہ مولانا موصوف کی شخصیت علمی اعتبار سے عدیم المثال ہے۔ اراکین وفد نے اس پر زور دیا کہ مدرسہ یا کالج کے قیام کے لئے

یہ ایک نہایت مناسب موقع ہے اور مولانا مجدالدین جیسے لائق وفائق بزرگ اس کی تشکیل اور صحیح رہنمائی کے لئے نہایت موزوں ثابت ہوں گے۔"

وفد نے آگے چل کر یہ بھی واضح کیا کہ مجوزہ مدرسہ سے کمپنی کو اس کے انتظامی امور کی انجام دہی میں بڑی سہولتیں حاصل ہوں گی کیونکہ یہاں سے ایسے قابل اور معاملہ فہم لوگ پیدا ہوں گے جو حکومت کے محکمۂ عدل میں حاکم فوجداری و حاکم دیوانی جیسے اہم عہدوں کو بخوبی سنبھال سکیں گے۔ وارن ہیسٹنگس نے ان سے اتفاق رائے کرتے ہوئے مولانا مجدالدین کو طلب کیا اور مجوزہ عہدے کی پیش کش کی چنانچہ مدرسہ کی ابتداء اوائل اکتوبر ۱۷۸۰ء سے ہوئی۔ وارن ہیسٹنگس نے اس کے سارے مصارف جن کی کل رقم ۶۲۵ روپئے تھی خود ہی پورا کرنے کا وعدہ کیا۔

مدرسہ کے کام کاج میں مولانا نے جو سرگرمی دکھائی اور مدرسہ کو جو خاطر خواہ کامیابی و شہرت حاصل ہوئی ان سے خوش ہو کر وارن ہیسٹنگس نے "شہر کے ایک علاقہ پدو پوکھر میں بیٹھک خانہ کے قریب ایک مناسب قطعۂ زمین خریدا جہاں ہندوستان کے مختلف حصوں کی عمارت کے نمونہ پر مدرسہ کے لئے ایک وسیع عمارت کی بنیاد ڈالی۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ مدرسہ کے سارے اخراجات کا بار اس وقت تک وارن ہیسٹنگس کی جیب خاص ہی پر تھا۔

۱۸ اپریل ۱۷۸۱ء کو ہیسٹنگس نے اس کا (یعنی مدرسہ کا) معاملہ بورڈ آف ریونیو کے سامنے ان تجاویز کے ساتھ رکھا کہ اس وقت تک جس ادارے کو وہ اپنے ذاتی خرچ سے چلا رہے تھے حکومت اسے براہ راست اپنی نگرانی میں کرے اور ۱۵ ہزار روپئے کے خرچ سے اُس زمین پر اس کے لئے ایک عمارت بنائے جسے انھوں نے اس مقصد کے لئے انتخاب کر رکھا تھا۔ گرچہ بورڈ نے ان تجاویز کو منظور کر لیا اور اپنی سفارشات کے ساتھ کورٹ آف ڈائرکٹرس" کے سپرد کر دیا لیکن ماہ اپریل ۱۷۸۲ء سے پہلے مدرسہ کے اخراجات کے لئے خزانۂ عامہ سے کوئی رقم منظور نہیں کی گئی۔ اس وقت وارن ہیسٹنگس ہی مدرسہ کے کل مصارف برداشت کرتے رہے۔ اس معاملے میں غالباً اسی وجہ سے تاخیر ہوئی کہ ان دنوں ہیسٹنگس کسی ضرورت سے بنارس گئے ہوئے تھے۔

۱۸۲۰ء میں چونکہ ۱۰ اپریل والی تجویزوں پر کوئی کاروائی نہیں کی گئی تھی اس لئے ہیسٹنگس نے اس معاملہ کی طرف بورڈ کی توجہ دوبارہ مبذول کرائی۔ انھوں نے مصارف کی ایک تفصیل پیش کر کے ۱۵۲۵۱ روپے مدرسہ کے اخراجات کے لئے اور ۱۴۵۶ روپے اس کی زمین کے لئے سرکاری خزانہ سے حاصل کر لیے ساتھ ہی ساتھ بورڈ نے مدرسہ کی بقاء و تحفظ کے لئے مدرسہ محال کی آمدنی سے مزید ۱۲۰۰ روپے ماہانہ دینا منظور کر لیا۔

جون ۱۸۲۳ء میں حکومت نے کلکتہ سنسکرت کالج کے طرز پر مدرسہ کی عمارت بنوانے کا منصوبہ کیا اس کی ضرورت اس لئے محسوس کی گئی کہ مدرسہ کی عمارت کافی شکستہ حال ہونے کے علاوہ شہر کے ایک ایسے علاقہ میں تھی جہاں "طلبا کی دماغی، اخلاقی اور جسمانی صحت کا برقرار رہنا ممکن نہ تھا" بنا بریں ۱۴۰۵۳۷ روپے اور زمین کی خریداری اور نئے کالج (مدرسہ) کی تعمیر کے لئے منظور کئے گئے، اور اسی جگہ کا انتخاب عمل میں آیا (یعنی ویلسلی اسکوائر کے متصل مسلمانوں کی کثیر آبادی کے درمیان) جہاں مدرسہ کی عمارت آج بھی موجود ہے اس کا سنگ بنیاد ضروری تکلفات کے ساتھ ۱۵ جولائی ۱۸۲۴ء کو رکھا گیا اور ۱۸۲۷ء میں جب اس کی تعمیر مکمل ہو گئی تو مدرسہ کو باقاعدہ یہاں منتقل کر دیا گیا۔

کچھ ہی دنوں کے بعد اس ادارہ میں شعبۂ عربی (جو کہ ایک کالج کی حیثیت رکھتا ہے) کے علاوہ ایک اور شعبہ کا اضافہ کیا گیا جسے "اینگلو پرشین ڈیپارٹمنٹ" کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

کلکتہ مدرسہ کا قیام دراصل اس مقصد کے ساتھ عمل میں آیا کہ مسلمان نوجوانوں کو عربی و فارسی ادب کے علاوہ علوم اسلامی کی تعلیم دوسرے مدارسِ اسلامیہ کے طرز پر دی جائے۔ انگریزی زبان کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا بلکہ کچھ عرصہ کے بعد فارسی کی طرح شاید اسے بھی ایک اختیاری مضمون قرار دیا گیا۔

کلکتہ مدرسہ وقتاً فوقتاً سرکاری تحقیقاتی کمیٹیوں کی توجہات کا مرکز رہا ہے جو ضروری اصلاحات اور دیگر تبدیلیوں کے متعلق حکومت کے سامنے اپنی سفارشات پیش کرتی رہی ہیں۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں جو تعلیمی نصاب مقرر کیا گیا تھا وہ اوائل ۱۹۲۸ء تک جاری رہا۔ اس نصاب کے مطابق انگریزی ادب کو فارسی ادب کی طرح ایک اختیاری مضمون بنا دیا گیا اور اس کا معیار امتحان میٹرک (کی انگریزی) کے مساوی کر دیا گیا اور ٹائیٹل کے موجودہ درجۂ حدیث و تفسیر کا اجرا کیا گیا۔

فی الحال کلکتہ مدرسہ دو شعبوں پر مشتمل ہے (۱) شعبۂ عربی (۲) شعبۂ انگریزی و فارسی (یا اینگلو پرشین ڈیپارٹمنٹ)

شعبۂ عربی میں کل ۱۲ جماعتیں ہیں — ۶ جونیر اور ۶ سینیر کی۔ جونیر جماعتوں میں کوئی امتحان ایسا نہیں ہوتا جس میں خارجی طلباء (یعنی جو طلباء کلکتہ مدرسہ کے باضابطہ طالب علم نہیں ہیں) شامل ہو سکتے ہوں برخلاف اس کے عالم، فاضل اور ممتاز (ٹائٹیل) کے امتحانات ایسے ہیں جن میں خارجی طلبا بھی شریک ہو سکتے ہیں لیکن مذکورہ امتحانات میں شرکت کے لئے دو تعلیمی سالوں کی پابندی ضروری ہے۔ ممتاز (ٹائٹیل) جماعت میں فقہ اور حدیث و تفسیر کے دو مختلف گروپ ہوتے ہیں، جونیر جماعتوں میں ذیل کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں:۔

۱۔ عربی قواعد اور صرف و نحو (۲) فارسی (۳) اردو (۴) بنگلہ (۵) انگریزی (۶) ریاضی (۷) منطق (۸) تاریخ (۹) جغرافیہ (۱۰) عربی ادب (۱۱) فقہ (۱۲) تجوید

سینیر کی مختلف جماعتوں میں ذیل کے مضامین کی تعلیم ہوتی ہے:۔

(۱) فقہ اور اصول (۲) عربی ادب (۳) تاریخ اسلام (۴) منطق یونانی (۵) انگریزی یا فارسی (اختیاری) (۶) اردو (۷) حدیث (۸) تفسیر اور (۹) فلسفہ (یونانی)

اپنے مخصوص نصاب تعلیم اور امتحانات کے لحاظ سے "اینگلو پرشین ڈیپارٹمنٹ" کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی کے ساتھ ہمیشہ رہا ہے لیکن جدید انتظام کی رو سے اس ڈیپارٹمنٹ کا الحاق اب صوبہ کے سکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے ساتھ ہے۔

تقسیم صوبہ کے ساتھ ساتھ کلکتہ مدرسہ کا شعبۂ عربی، ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) منتقل ہو چکا ہے۔ اس کی وجہ سے ملک کو بڑا نقصان پہنچا اور جلد ہی اس کے دوبارہ قیام کی ضرورت بشدت محسوس کی گئی:۔

بہرحال ۲۰ / دسمبر ۱۹۴۸ء کو حکومت مغربی بنگال نے ذیل کا آرڈر جاری کیا:۔

سپریشن کا ونسل کے فیصلہ کے مطابق کلکتہ مدرسہ کے شعبۂ عربی کو اگست ۱۹۴۷ء میں تقسیم صوبہ کے ساتھ مشرقی پاکستان میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ کے اندر، حکومت سے درخواست

گئی کہ وہ اسے دوبارہ جاری کرنے کے لئے ضروری اقدام کرے۔ حکومت کے پاس مسلمان رہنماؤں اور عالموں کی طرف سے اور بھی درخواستیں پہنچیں جن میں یہ کہا گیا تھا کہ ثقافتی اور تعلیمی اسباب کے پیش نظر کلکتہ مدرسہ کو دوبارہ کھول دینا چاہئے کیونکہ اس صوبہ کے مسلمان اس ادارہ کے مشرقی پاکستان میں منتقل ہو جانے کی وجہ سے اعلیٰ مذہبی تعلیم کے حصول سے محروم ہو گئے ہیں اور اس کا نصاب تعلیم وہی رکھا جائے جو تقسیم ملک سے پہلے رائج تھا۔

۴ راپریل ۱۹۴۹ء کو مدرسہ کا دوبارہ قیام عمل میں آیا۔ عوام کا خیال تھا کہ مغربی بنگال میں مدارس کی تعلیم کا انتظام و انصرام از سرِنو اس طور پر کیا جائے گا کہ یہاں کے محصلین عربی ادب و علومِ اسلامی کے ساتھ ساتھ ادب اور سائنس کے دوسرے مضامین سے بھی کماحقہٗ واقف ہوں گے۔ نیز یہ بھی محسوس کیا گیا کہ مولوی حضرات اپنی زندگی کا بیشتر حصہ مدارس عربیہ میں صرف کر دیتے ہیں اس کے باوجود عام طور پر ان میں عربی وفارسی میں بات چیت کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی اور جدید عربی وفارسی میں گفتگو کرنے سے تو وہ قطعاً نا آشنا ہوتے ہیں کیونکہ ان کا انھیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ مدارس عربیہ کے متعلق ان خامیوں اور کمزوریوں کا احساس کوئی اچھی بات نہ تھی چنانچہ یہ مناسب سمجھا گیا کہ کلکتہ مدرسہ کے شعبۂ عربی کے دورِ نو کی بنیاد جدید طرزِ تعلیم پر رکھی جائے۔

ان مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے کلکتہ مدرسہ کے دوبارہ قیام کے فوراً ہی بعد اس میں تین انجمنیں قائم کردی گئیں:۔

النادیۃ العربیہ: یہ انجمن ایک ایسے شخص کی زیرِ نگرانی اپنے فرائض انجام دے رہی ہے جو عربی زبان وادب کے استاذ ہونے کے علاوہ جامعہ ازہر قاہرہ کے فاضل ہیں۔ عربی میں بلا تکلف بول چال کرسکتے ہیں اور جدید عربی زبان وادب کے ماہر بھی ہیں۔ اس انجمن کی ماہانہ دو نشستیں ہوا کرتی ہیں جن میں طلباء صرف عربی میں مضامین پڑھتے ہیں، تقریریں کرتے ہیں اور بحث وتمحیص میں حصہ لیتے ہیں۔

دوسری دو انجمنیں یعنی بزم ادب اردو و بنگلہ، النادیۃ العربیہ کے تتمے ہیں جو علی الترتیب زبان اردو و

بنگلہ کی ترویج و ترقی کے لئے مصروفِ عمل ہیں۔

کلکتہ مدرسہ ان داخلی سرگرمیوں کے علاوہ ایک مدرسہ بورڈ (بنام مغربی بنگال مدرسہ ایجوکیشن بورڈ) کا بھی مرکز ہے جسے حکومتِ مغربی بنگال نے صوبہ کے جملہ ہائی مدرسہ، سنیئر اور ٹائیٹل امتحانات کی انجام دہی و دیگر امور متعلقہ کے نظم کے لئے ۲۹ ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو قایم کیا اور پرنسپل کلکتہ مدرسہ جس کے (اکس آفیشیو) رجسٹرار ہیں۔ اس بورڈ نے وجود میں آنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد پرانے نصابِ تعلیم پر نظرِ ثانی کرنے اور اس میں جدید فلسفہ، سائنس، ادب، انگریزی اور دوسرے مضامین کے اضافہ پر غور و خوض کے لئے ایک "سب کمیٹی" بنائی تاکہ ایک طرف قدیم اور جدید طرزِ تعلیم والے مدارس میں یکسانیت پیدا ہو جائے اور دوسری طرف مدارسِ عربیہ کے محصلین صوبائی و مرکزی حکومتوں میں خدمات عامہ کی ملازمتوں کے اہل بن سکیں۔ اس "سب کمیٹی" نے مارچ ۱۹۵۱ء میں اپنے کاموں کی تکمیل کر لی ہے اور ایک نیا نصابِ تعلیم حکومت کی منظوری کے لئے پیش کر چکی ہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد صوبہ میں اسلامی تعلیم کی نشر و اشاعت کی طرف سے چند لوگوں کے دلوں میں کچھ پیدا ہو چکی تھی لیکن کلکتہ مدرسہ اور دوسرے ہائی اور سینیر مدارس (جو کہ صوبہ میں جا بجا قائم ہیں) میں طلباء اور مغربی بنگال ایجوکیشن بورڈ کے امتحانات میں شریک ہونے والے امیدواروں کی تعداد کے پیشِ نظر یہ قیاس کرنا کہ ان حضرات کا وہم و خوف بے جا تھا کوئی غلط بات نہ ہوگی۔

سیرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

جس میں آسان اور دل نشین انداز میں سیرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اہم واقعات کو بیان کیا گیا ہے دورِ حاضر کی مختلف سیرت نبوی کی کتابوں میں جامعیت کے اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتی ہے

قیمت مجلد ۶ روپے   بلا جلد ۵ روپے

حالاتِ حاضرہ

کینیا اور اُس کے باشندوں کی قومی تحریک

از

اسرار احمد صاحب آزاد

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد دنیا کی تمام محکوم اور نیم محکوم اقوام میں اپنی اقتصادی و معاشی بدحالی کی بدولت قومی آزادی اور خود مختاری کی ضرورت کا جو احساس پیدا ہوا ہے "تاریک براعظم" کے باشندوں کا ذہن بھی اس احساس سے خالی نہیں رہا اور آج براعظم افریقہ کے ایک چھوٹے سے خطے کینیا کے باشندے بھی نہ صرف اپنے وطن کی آزادی اور خود مختاری کی جدوجہد میں مصروف ہیں بلکہ برطانوی مستعمرین کے وحشیانہ مظالم کے شکار بھی بنے ہوتے ہیں۔ کینیا براعظم افریقہ کے مشرقی ساحل پر واقع ہے۔ افریقہ کے دوسرے بہت سے ملکوں خطوں اور علاقوں کی طرح ہمیں کینیا کے متعلق بھی کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں تھیں لیکن ۱۹۵۲ء کے آخری چار ماہ میں دفعتہً کینیا نے دنیا بھر کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرلیا اور ایک بار پھر یہ حقیقت بے نقاب ہوگئی کہ جمہوریت پسندی کے بلند بانگ دعووں کے باوجود برطانوی استعمار پسند کسی محکوم قوم کی خواہشِ حریت خواہی کی پذیرائی کے لئے تیار نہیں۔

عام حالات

کینیا کا رقبہ دو لاکھ پچیس ہزار مربع میل ہے اور اس طرح یہ ملک فرانس سے بڑا واقع ہوا ہے ۱۹۴۸ء کی مردم شماری کے مطابق کینیا کی مجموعی آبادی ۵۲۰۳۷۰۸ افراد پر مشتمل ہے جن میں ۵۲۱۸۲۳۲ حبشی ۹۰۵۲۸ ہندوستانی اور ۲۹۶۶۰ یورپین شامل ہیں۔ اس ملک کا تقریباً ۳/۵ حصہ نیم ریگستان واقع ہوا ہے اور چونکہ کینیا کا جنوبی ساحلی علاقہ بہت زیادہ زرخیز ہے اس لئے اس ملک کی تمام تر اقتصادی زندگی اسی حصہ کے ساتھ وابستہ ہے۔

انتظامی اعتبار سے کینیا کا مرکزی شہر نیروبی ہے اور اس شہر کی آبادی ۱۱۹۴۸۹ افراد پر مشتمل ہے نیروبی کے علاوہ ممباسا اور نکورو دو اور بڑے شہر ہیں ممباسا کی آبادی ۸۴۷۴۶ افراد پر مشتمل ہے۔ یہ شہر بندرگاہ

اور صنعتی مرکز بھی ہے اور نیروبی کو ان یوروپی باشندوں کا مرکز سمجھا جاتا ہے جو کینیا میں زراعت اور باغبانی کرتے ہیں۔

انتظام

انتظامی اعتبار سے کینیا دو حصوں ــــ علاقہ زیر حمایت اور نوآبادی ــــ پر منقسم ہے۔ علاقہ زیر حمایت میں دس میل عریض وہ قطعۂ ارض جو ٹانگانیکا کی سرحد سے شروع ہو کر کیپنی تک بحر ہند کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلا گیا ہے نیز مجمع الجزائر لامو شامل ہے۔ انیسویں صدی کے اواخر میں کینیا پر تسلط حاصل کرنے کے لئے برطانیہ اور جرمنی کے مابین تصادم رونما ہوا تھا اور اس تصادم کے نتیجہ میں فریقین کے درمیان ۱۸۹۰ء میں جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے برطانیہ نے بحر شمالی میں اپنا مقبوضہ جزیرہ ہیلیگولینڈ جرمنی کے حوالہ کرنے کے علاوہ ٹانگانیکا پر جرمنی کے استحقاق کو بھی تسلیم کر لیا تھا اور جرمنی نے کینیا اور یوگنڈا کو برطانیہ کے لئے چھوڑ دیا تھا اور ۱۹۲۰ء میں برطانیہ نے کینیا کے اس علاقہ کے علاوہ جو سلطان زنجبار کی سلطنت میں شامل سمجھا جاتا تھا باقی ماندہ تمام علاقہ کو نوآبادی قرار دے دیا تھا۔

بہر حال جہاں تک نظم و نسق کا تعلق ہے علاقہ زیر حمایت اور نوآبادی میں کوئی فرق نہیں، دونوں حصے ایک گورنر کے ماتحت ہیں جسے برطانوی حکومت مقرر کرتی ہے۔ گورنر کی مجلس عاملہ کے اراکین ہی مختلف شعبوں کے انتظام کے ذمہ دار ہوتے ہیں کینیا میں ایک مجلس قانون ساز بھی موجود ہے جس کے کچھ اراکین کو گورنر نامزد کرتا ہے اور باقی ماندہ کو کینیا میں رہنے والے یوروپی باشندے منتخب کرتے ہیں لیکن اس مجلس کے منظور کردہ تمام قوانین کے نفاذ کا معاملہ گورنر کی منظوری پر منحصر ہے۔

اقتصادیات

کینیا ایک زرعی ملک ہے۔ وہاں ایک خاص قسم کا گھاس جس سے رسّے بٹے جاتے ہیں، کافی، چائے، گندم، کپاس، عاقرقرحا، مونگ پھلی اور نے شکر کی کاشت کی جاتی ہے اور چند ایسے کارخانے بھی ہیں جہاں ملک کی زرعی پیداوار غیر ممالک میں بھیجنے کے قابل بنانے کے علاوہ جوتے وغیرہ بھی تیار کئے جاتے ہیں۔ کینیا میں سونے، تانبے، نمک اور مینگانیز کے ذخائر بھی دریافت ہوئے ہیں لیکن ابھی ان معدنی

ذخائر کو برآمد کرنے کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا گیا۔ مختصر یہ کہ کینیا کے باشندوں کی اقتصادی حالت اچھی نہیں۔

وقت کا اہم ترین مسئلہ

جیسا کہ سطور بالا میں بیان کیا جا چکا ہے کینیا ایک زرعی ملک ہے اور آج اراضی کا مسئلہ ہی اس چھوٹے سے ملک کا اہم ترین مسئلہ بنا ہوا ہے اور اس مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ کینیا کے نپچاس لاکھ مقامی باشندوں کے قبضہ میں ۲۷۵۰۰۰۰ ایکڑ آراضی ہے اور طرف بتیس ۳۲ ہزار برطانوی نوآبادکار ۸۱۰۰۰۰۰ ایکڑ بہترین قابل کاشت اراضی پر قابض ہیں۔ یہی نہیں بلکہ بعض برطانوی زمینداروں کے پاس کینیا میں ایک ایک لاکھ سے لے کر ساڑھے تین تین لاکھ ایکڑ زمین موجود ہے۔ کینیا کے مقامی باشندوں کی کاشت کو بعض ایسے مخصوص علاقوں میں محدود کر دیا گیا ہے جہاں بیشتر آراضی ناقابل کاشت ہے "کراؤن لینڈ آرڈی ننس" (آراضی سے متعلق شاہی ہنگامی قانون) کی رو سے مقامی لوگوں کو زرخیز علاقوں میں اراضی حاصل کرنے کی اجازت نہیں اور ۱۹۴۸ء سے انھیں ان کی مقبوضہ زرخیز اراضی سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ کینیا کے مشہور قبیلہ کیکویو کو کم و بیش آٹھ سال قبل جو آراضی دی گئی تھی وہ واپس لے لی گئی ہے۔ ایسی تمام آراضی برطانوی نوآبادکاروں کے حوالہ کر دی جاتی ہے اور ان برطانوی نوآبادکاروں کو مالی امداد دینے کے لئے ایک سرمایہ بھی قائم ہے۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ آراضی سے محروم ہو جانے کے بعد مقامی باشندے برطانوی نوآبادکاروں کے یہاں مزدوری کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا جاتا بلکہ ان مقامی باشندوں پر گرانقدر محاصل بھی عائد کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ گذشتہ سال کینیا سے شائع ہونے والے برطانوی اخبار "ایسٹ افریکن اسٹینڈرڈ" نے لکھا تھا کہ —— ہمارا خیال ہے کہ مقامی باشندوں پر گراں قدر محاصل عاید کرنے کے بعد ہی انھیں (ذاتی کاشت) چھوڑنے اور مزدوری کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے مقامی باشندوں کے مصارفِ زندگی کو بڑھانے کا یہی ایک طریقہ ہے اور جیسا کہ اس سے پہلے توجہ دلائی جا چکی ہے اسی بات پر مزدوروں

کے زیادہ سے زیادہ ملنے اور انھیں کم از کم اجرت دئے جانے کے مسئلہ کا انحصار ہے ـــــــ اور ان مزدوروں کو جو اجرت دی جاتی ہے وہ عام حالات میں ۲ شلنگ سے ۱۸ شلنگ ماہوار تک اور خاص حالات میں دو پاؤنڈ ماہوار سے زیادہ نہیں ہوتی۔

مقامی باشندے اپنی مخصوص بستیوں میں رہتے ہیں، نرسلوں، پھوس اور مٹی سے بنے ہوئے ان کے جھونپڑے تاریک اور مرطوب ہوتے ہیں۔ ان کی بستیاں متعدی امراض کا گہوارہ بنی رہتی ہیں، تپ دق کا مرض عام ہے اور ان بستیوں کی کم و بیش ۱۳ فی صد آبادی ملیریا میں مبتلا رہتی ہے اور ۴۰ فی صد بچوں کے لئے ابتدائی تعلیم کا بھی کوئی انتظام نہیں۔

سیاسی حقوق؟

کینیا کے مقامی باشندے سیاسی حقوق سے محروم ہیں اور اگرچہ ملک کی مجلس قانون ساز میں ان کے چار نمائندے ہوتے ہیں لیکن انھیں ان کی رائے سے منتخب نہیں کیا جاتا بلکہ گورنر مقرر کرتا ہے پھر وہاں رنگ اور نسل کے امتیاز کو بھی کام میں لایا جاتا ہے۔ برطانوی حکام مقامی باشندوں سے ہر وقت بےگار لے سکتے ہیں اور انھیں ان کی مرضی کے خلاف محنت کرنے کے لئے ملک سے باہر بھی بھیج سکتے ہیں، چنانچہ جنوری ۱۹۵۲ء میں جب مصری مزدوروں نے نہر سویز کے علاقہ میں برطانیہ کے لئے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا تو کینیا کے باشندوں کو جبراً نہر سویز کے علاقہ میں کام کرنے کے لئے بھیج دیا گیا تھا۔

آزادی کی تحریک

کینیا میں برطانوی مستعمرین تحصیل بالجبر کی جس حکمت عملی پر کاربند رہے ہیں کینیا کے باشندوں نے کسی مرحلہ میں بھی اسے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور اگرچہ یہاں اس جد و جہد کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ممکن نہیں جس میں کینیا کے باشندے موجودہ صدی کے شروع ہی سے مصروف رہے ہیں۔ لیکن ۱۹۲۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کینیا میں برطانوی حکمت عملی کے خلاف بطور احتجاج چار مرتبہ جو زبردست ہڑتالیں ہو چکی ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ کینیا کے باشندے کسی زمانہ میں بھی برطانوی حکمت عملی سے مطمئن نہیں ہو سکے۔

بہر حال دوسری عالمگیر جنگ کے زمانہ سے کینیا کے باشندوں کی تحریکِ آزادی میں شدت اور وسعت پیدا ہوتی جارہی ہے اور اس تحریک کی قیادت کینیا کے باشندوں کی انجمن ـــ کینیا افریکن یونین ـــ کررہی ہے۔ اور اگرچہ اس انجمن کی زمامِ قیادت اعتدال پسندوں کے ہاتھوں میں ہے لیکن اس کے لائحہ عمل میں ـــ اس سرمایہ سے جو انگریز نوآبادکاروں کی امداد کے لئے محفوظ کرلیا گیا ہے نیگرو کاشتکاروں کے لئے زمین حاصل کرنا، مزدوروں کے لئے مناسب اجرتیں متعین کرانا، ٹریڈ یونینوں کی تنظیم کا حق حاصل کرنا، متشددانہ قوانین کو منسوخ کرانا مجلس قانون ساز میں نیگرو باشندوں کی نمائندگی میں اضافہ کرانا، بچوں کی تعلیم کا انتظام کرانا اور مقامی باشندوں کی صحت کی طرف سے حکومت کے محکمۂ صحت کی موجودہ مجرمانہ غفلت کو دور کرانا، ایسے امور شامل ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ مذکورہ بالا مطالبات میں کینیا افریکن یونین کو عوام کی کامل تائید اور حمایت حاصل ہے۔ یہ انجمن ابتدا ہی سے قانون کی حدود میں رہ کر حصولِ مقاصد کی جدوجہد کرتی رہی ہے لیکن اس کی تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئی ہیں۔

"ماؤ ماؤ"

کینیا کے باشندے کم وبیش گذشتہ پچیس سال سے برطانوی حکومت کو اپنی خستہ حالی کی طرف توجہ دلاکر اصلاحِ حالات کا جو مطالبہ کرتے رہے ہیں اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا لیکن آج جبکہ ہر چھوٹی سے چھوٹی قوم میں بھی غلامی کی ذلتوں اور مشکلات نیز آزادی اور خود مختاری کی برکتوں کا احساس بیدار ہوگیا ہے برطانوی مستعمرین کو بجا طور پر اس بات کا اندیشہ لاحق ہونا چاہئے تھا کہیں کینیا کے باشندوں کی موجودہ جدوجہد کینیا کی کامل آزادی کی جدوجہد میں تبدیل نہ ہوجائے اور اسی اندیشہ کے ماتحت انھوں نے کینیا کے باشندوں کی قومی تحریک کو نابود کردینے کے لئے ظلم اور تشدد کے وہ طریقے اختیار کررکھے ہیں جن کے تصور ہی سے بدن پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔

کینیا میں برطانوی استعمار پسندوں نے مظالم کا سلسلہ سال گذشتہ کے اواخر میں شروع کیا تھا اور جیسا کہ عام دستور ہے جبر وتشدد کے مظاہرہ سے چند ماہ قبل برطانوی اخبارات میں کینیا کے دہشت پسندوں کی سرگرمیوں کی اطلاعات شائع ہونے لگی تھیں لیکن اسی زمانہ میں کینیا کے شعبۂ انصاف اور امن کے ذمہ دار رکن

نے کینیا کی مجلس قانون ساز کے روبرو اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ —— گذشتہ پانچ سال کی مدت میں کوئی ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا جسے جرائم کی فہرست میں اضافہ قرار دیا جا سکے۔ اس کے باوجود یہ بات فرض کر لی گئی کہ —— کینیا کے باشندے کینیا میں مقیم تمام یورپی باشندوں کو ملک سے نکال دینا چاہتے ہیں اور دہشت خیز افراد کی ایک خفیہ جماعت "ماؤ ماؤ" اس مقصد کو تشدد اور خونریزی کے ذریعہ سے حاصل کرنا چاہتی ہے اور اسی مفروضہ کی بناء پر ستمبر ۱۹۵۲ء میں چند ایسے قوانین مرتب اور منظور کئے گئے جن کی بدولت کینیا کی تمام سیاسی جماعتیں خلاف قانون جماعتیں قرار دے دی گئیں اور "کینیا افریکن یونین" کے تمام رہنماؤں اور کارکنوں کو قید خانوں میں بند کر دیا گیا۔ اور یہ صورت حالات اس وقت تک قایم ہے۔

"کی کو یو قبیلہ"

برطانوی نوآبادیات خواہوں کے ہاتھوں سے کی کو یو قبیلہ کو جو عظیم نقصان پہنچا ہے اس کا اندازہ کرنا بھی دشوار امر ہے۔ یہ قبیلہ کم و بیش دس لاکھ افراد پر مشتمل تھا اور اراضی سے بے دخلی کی بدولت چونکہ اسی قبیلہ کو سب سے زیادہ خسارہ بھی برداشت کرنا پڑا تھا اس لئے آراضی کی صحیح تقسیم کے مطالبہ میں اسی قبیلہ کے افراد ہی پیش پیش بھی نظر آتے تھے۔ چنانچہ کینیا کی سیاسی جماعتوں کو منتشر کرنے کے بعد برطانوی حکام نے تقریباً اس تمام قبیلہ کو "ماؤ ماؤ" کے ساتھ وابستہ قرار دے کر اس قبیلہ کے ہزارہا افراد کو گرفتار کر لیا۔ اور جو لوگ خوفزدہ ہو کر جنگلوں میں جا چھپنے پر مجبور ہو گئے ان کی ہر چیز پر حکومت نے قبضہ کر لیا۔ ان کی بستیوں کو تباہ کر دیا گیا اور قبیلہ کے ممتاز افراد کو بیس بیس سال کے لئے قید خانوں میں بند کر دیا گیا۔

وحشت و بربریت کے یہ تمام مظاہرے مسٹر چرچل کی حکومت کی طرف سے کئے گئے ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ برطانیہ کے سوشلسٹ رہنما مسٹر ایٹلی نے بھی اس حکمت عملی کی تائید کی ہے۔ بہر حال ان تمام مظالم کے باوجود کینیا کے باشندوں کے حوصلے پست نہیں ہوئے ان کی جدوجہد جاری ہے لیکن کینیا کی قومی تحریک کے سلسلہ میں دنیا کی آزاد قوموں پر بھی ایک ذمہ داری عاید ہوتی ہے اور اگرچہ بظاہر وہ ذمہ داری کینیا کے باشندوں کی جدوجہد کی تائید اور حمایت کے بعد ختم ہو جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک دنیا کی آزاد اقوام اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین نہ کر لیں کہ مغربی جمہوریت کی علمبردار جو اقوام آج بھی کمزور اور چھوٹی قوموں کو محکوم بنائے رکھنے کے لئے ہر قسم کے مظالم برپا کر سکتی ہیں ان کی رہنمائی میں اقوام عالم کی سیاسی معاشی اور اقتصادی نجات ممکن نہیں ہو سکتی اس وقت تک نہ تو کینیا کی قومی تحریک کی حمایت ہی مفید ہو سکتی ہے اور نہ اس قسم

"وفیات الاعیان"

آہ

حاجی شیخ رشید احمد صاحب مرحوم

از

(عتیق الرحمٰن عثمانی)

۱۹۵۲ء جس کو "عام الحزن" کہنا چاہئے اس کی ابتدا برادر مکرم مولانا یعقوب الرحمٰن عثمانی کی وفات کے سانحہ المناک سے ہوئی اور انتہا حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ قدس سرہٗ کے حادثۂ ارتحال پر اسی سال برادر عزیز مولانا سعید احمد کے والد ماجد قبلہ ڈاکٹر ابرار حسین صاحب، محب باصفا حافظ ضیاء الدین احمد صاحب مدیر ندائے حرم، قرول باغ کے غمگسار پردسی چودہری محمد بخش صاحب اور بچپن کے بے تکلف ساتھی قاری محمد طاہر صاحب ناظم دار الصنائع دار العلوم دیوبند رخصت ہوئے یہاں تک کہ ۲ دسمبر کی درمیانی شب میں مخدومی حاجی شیخ رشید احمد صاحب کی بھی رحلت کا حادثہ پیش آگیا۔

حاجی صاحب سے میرے اور میرے بزرگوں کے تعلقات نہایت ہی قدیم اور نہایت ہی مخلصانہ تھے، کم وبیش ۵۴ سال سے شرف نیاز حاصل تھا مسرت وغم کے ہر موقع پر ایک دوسرے کے شریک رہتے تھے۔

ابھی کل کی سی بات معلوم ہوتی ہے جب مارچ ۱۹۱۸ء میں بزرگانِ میرٹھ کا یہ قافلہ بڑے اہتمام وشوق سے میرے نکاح میں شریک ہونے کے لئے دیوبند آیا تھا، اسی کا یہ اثر ہوا کہ ۳۵ سال کے بعد جب گذشتہ ۲۸ ر ۲۹ ر نومبر کو برخوردار مجیب الرحمٰن کی تقریبِ شادی ہوئی تو اس وقت جو بزرگ خاص طور پر یاد آئے اور جن کے شریک نہ ہونے کا قلب پر خاص اثر ہوا اُن میں ایک حاجی صاحب مرحوم ومغفور بھی تھے انسان کی بے خبری وبے بسی کا بھی کیا عالم ہے اور اس دنیا کی عجوبہ کاریوں کا بھی کیا ٹھکانا ہے ادھر ہم دیوبند میں تقریب کے انتظامات میں لگے ہوئے تھے ادھر حاجی صاحب مرحوم ملاءِ اعلیٰ کے لئے رختِ سفر باندھ رہے تھے۔

"فیا للاسف"

مرحوم شروع میں الٰہی بخش اینڈ کمپنی میرٹھ میں ایک ملازم کی حیثیت سے آئے تھے پھر اپنی غیر معمولی قابلیت، محنت اور دیانت شعاری کی بدولت جلد ہی کمپنی کے شریکِ منفعت ہو گئے اور پھر چند سال کے بعد ایک باوفا اور باوقار شریک کی حیثیت

سے الٰہی بخش اینڈ کو دہلی کے کاروبار کے نگرانِ اعلیٰ مقرر ہوئے، آپ کی بہترین نگرانی میں حافظ فصیح الدین صاحب مرحوم کی اس تاریخی فرم نے جلد جلد ترقی کی منزلیں طے کیں اور اس کا شمار دہلی کی چوٹی کی فرموں میں ہونے لگا۔

حاجی صاحب کو قدرت نے جن گوناگوں صلاحیتوں اور قابلیتوں سے نوازا تھا قدرتی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاروبار کی مشغولیتوں کے ساتھ ساتھ قومی اور ملی کاموں میں بھی زبردست حصہ لینے لگے اور چند ہی سال میں دہلی کی شہری زندگی کے مختلف گوشوں پر چھا گئے شہر کے سب سے بڑے سماجی ادارے میونسپل بورڈ میں ان کی خدمات نہایت نمایاں رہتی تھیں اور اس کے طریق کار میں ان کی رائے کا بڑا دخل ہوتا تھا چونکہ اول درجے کے راسخ العقیدہ اور پابند اوقات مسلمان تھے دنیوی خدمتوں کے ساتھ علم دین کی خدمت بھی بڑے شوق اور ولولے سے کرتے تھے، سالہا سال حضرت مفتی محمد کفایت اللہ صاحب کے ساتھ مدرسہ عالیہ فتح پوری کے مہتمم رہے اور مدرسہ کے تمام شعبے بڑی قابلیت سے چلائے، دہلی پنجابی مسلم ہائی اسکول اور فتح پوری مسلم ہائی اسکول کے برسوں سربراہ کار رہے، مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کے سرپرست خصوصی اور دار العلوم دیوبند کے مجلس شوریٰ کے سرگرم اور بیدار دماغ رکن تھے۔

بڑے صاحب خیر تھے اور ہر اچھے کام میں کھلے دل سے حصہ لیتے تھے، وضع داری کے پیکر، ذی مروت، با اخلاق، کشادہ دماغ و کشادہ جبین، رونق محفل اور بہارِ چمن،

"ندوۃ المصنفین" سے خاص علاقہ رکھتے تھے اور اس کی خدمات کی سنجیدگی اور اہمیت کا قولی ہی نہیں عملی اعتراف کیا کرتے تھے، ۱۹۴۷ء میں دہلی کی بہار لٹی تو یہ سروِ گلستان بھی چھوٹا کانگ کی رونق بنا اور اسی شان اور آن بان کے ساتھ زندگی بسر کی، یہاں کی طرح وہاں بھی تمام دینی اور دنیوی مشاغل میں منہمک رہے، وہی سرکاری مناصب، وہی مدارس دینی کی دیکھ بھال، وہی اعمالِ صالحہ کی جستجو، وہی شوقِ حج و زیارت اور وہی کاروباری شغف، آخری ملاقات ۱۹۵۱ء میں مدینہ منورہ میں ہوئی تھی اور آخری مکتوب "جامع المجددین" پر تنقید کے سلسلہ میں آیا تھا جس کی سطر سطر محبت و اخلاص کے پھولوں میں بسی ہوئی تھی

رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

خاتمہ بھی ایسا ہوا کہ ہر مسلمان کو اس کی دعا کرنی چاہئے اس سلسلہ میں مرحوم کے منجھلے صاحبزادے اور میرے مخلص دوست برادرم حاجی شیخ ہنیس احمد صاحب کے ایک طویل خط کی آخری سطریں سنئے

کے لائق ہیں۔

"یکم دسمبر کی صبح فرمانے لگے کہ "اب تو آپریشن بھی ہوگیا مواد بھی خارج ہوگیا۔ ڈاکٹر جو کچھ کر سکتے تھے کر لیا بخار پھر بھی ہونے لگا تم لوگ مجھ کو میری حالت پر چھوڑ دو جو حق تعالیٰ کو منظور ہوگا وہی ہوگا۔" اسی دن ڈاکٹر سمیع الدین صاحب کو جو بہت متقی، پرہیزگار اور صوم و صلوٰۃ کے پابند ہیں خاص طور پر بلایا اور فرمایا "کہ سب ڈاکٹروں نے کوششیں کرلی ہیں اب میں چاہتا ہوں کہ آپ علاج کی ذمہ داری لیں اور جو کچھ بھی ہو آپ کے ہاتھوں ہو اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوگا تو آپ ہی کے ہاتھوں شفا ہوگی کیونکہ آپ ماشاء اللہ متقی اور محتاط مسلمان ہیں۔" ۴ دسمبر (۱۲-۱۳ ربیع الاول) کی درمیانی شب میں حسب معمول صبح ۴ بجے اٹھے۔ ضروریات سے فارغ ہوکر تیمم کیا۔ اسی وقت وہی ڈاکٹر صاحب انجکشن لگانے آئے تو فرمایا ڈاکٹر صاحب پانچ منٹ ٹھہر ئیے۔ میں نوافل سے فارغ ہو جاؤں تو انجکشن لگا دیں، تہجد کے نوافل کے لئے نیت کی اور اسی حالت میں حرکت قلب بند ہوگئی میں ان کے پاس ہی موجود تھا ڈاکٹر صاحب کو آواز دی وہ فوراً نبض کا پتہ نہ ملا۔ قلب کو دیکھا وہاں بھی کچھ نہ پایا۔ ایک ہچکی آئی اور ساتھ ہی کلمہ طیبہ کی آواز بھی "انا للہ وانا الیہ راجعون" آناً فاناً سب کچھ ہوگیا ایک منٹ پہلے بھی وہم و گمان نہ تھا کہ اتنی جلدی ہم سے جدا ہو رہے ہیں انھیں ڈاکٹر صاحب کی موجودگی میں جان دی اور ان کی خواہش پوری ہوئی کہ "جو کچھ بھی ہو آپ ہی کے ہاتھوں ہو" ڈاکٹر صاحب بھی حیران رہ گئے کہ اتنی آسانی سے جان نکلتی ہوئی میں نے کسی کی نہیں دیکھی۔ اللہ پاک حضرت قبلہ کو اپنی خاص رحمتوں سے نوازیں حضرت مرحوم "برہان" بڑی پابندی سے پڑھا کرتے تھے اور جب رسالہ کے آنے میں دیر لگ جاتی تھی تو دریافت فرمایا کرتے تھے کہ اب تک رسالہ کیوں نہیں آیا۔ "برہان" کی مطبوعات بھی برابر زیر مطالعہ رہتی تھیں۔

"برہان" کا فون نمبر بدل گیا ہے نیا نمبر یہ ہے ۲۳۸۱۵

ادبیات

غزل

(جناب مخمور دہلوی)

جناب مخمور دہلوی آج پہلی بار "برہان" کی ادبی محفل میں تشریف لا رہے ہیں۔ مخمور صاحب اس وقت بادِ خزاں کے تیز وتند جھونکوں سے مرجھائی دلی کے اول درجے کے پُر بہار شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک سخنورانِ دہلی کا تعلق ہے آپ کی رنگیں نوائی اور شعلہ بیانی سے دلی کی افسردہ و پژمردہ بزمِ شعر وادب میں ایک خاص طرح کی گرمی اور زندگی محسوس کی جاتی ہے، مخمور صاحب کے کلام کا ایک نفیس مجموعہ عن قریب "بادۂ مخمور" کے نام سے شائع ہو رہا ہے۔ یقین ہے اردو کے قدر دان اس کی قدر کریں گے۔ "برہان"

حسن خود چشمِ خریدار تک آپہنچا ہے — قافلہ مصر کے بازار تک آپہنچا ہے

آج اک مردِ خدا دار تک آپہنچا ہے — عشق اب اس قدر ایثار تک آپہنچا ہے

جس کے دل میں کبھی تمنائے بہشت وطوبیٰ — آپ کے سایۂ دیوار تک آپہنچا ہے

تنگ ہے اب ترے بندوں پہ خدائی تیری — آدمی جرأتِ انکار تک آپہنچا ہے

وہ فرشتوں کے مقامات سے گذرا ہوگا — جو سرا پردۂ اسرار تک آپہنچا ہے

اب حقیقت میں مرے دل کے کھلیں گے جوہر — آئینہ مصحفِ رخسار تک آپہنچا ہے

جادۂ صبر و رضا سے بھی گذرنا ہوگا — اب قدم منزلِ دشوار تک آپہنچا ہے

ناخدا نے نہ بچایا تو بچائے گا خدا — اب سفینہ مرا منجدھار تک آپہنچا ہے

کون ہے بارِ امانت کا اٹھانے والا — فیصلہ جرأتِ کردار تک آپہنچا ہے

تیری رحمت سے کسی حال میں مایوس نہیں — تیرا پیغام گنہگار تک آپہنچا ہے

آج جاتی ہوئی دنیا کو بھی رخصت کر دے — وقت آخر ترے بیمار تک آپہنچا ہے

ہوش مندوں سے تو بڑھ کر ہیں ترے دیوانے
کوئی در تک کوئی دیوار تک آپہنچا ہے
رحم فرمائیے اب میری زبوں حالی پر
ضبطِ غم طعنۂ اغیار تک آپہنچا ہے
اس قدر مستِ مئے شعر و سخن ہوں مخمور
کیفِ بادہ مرے اشعار تک آپہنچا ہے

رباعیات

(جناب شارق میرٹھی ایم۔ اے)

"توفیقِ خودی"

بڑھتی ہوئی رو جھنجھوڑ ڈالی میں نے
ہر بندشِ موج توڑ ڈالی میں نے
توفیقِ خودی ہوئی جو شاملِ حال
طوفاں کی کلائی موڑ ڈالی میں نے

"سہارا"

دیتے ہوں پناہ گر کنارے تو نہ لے
دیتے ہوں ضیا اگر ستارے تو نہ لے
ٹوٹے ہوئے دل کے اک سہارے کے حضور
ملتے ہوں اگر لاکھ سہارے تو نہ لے

"پیش کش"

غم کی بھی کھٹک کا لطف پاتے جاؤ
تلخی کی بھی لذتیں اٹھاتے جاؤ
پھولوں کی شراب نوش کرنے والو
اک زہر کا جام بھی چڑھاتے جاؤ

"رقص"

طوفاں کی صدا پہ رقص کرتا ہوں میں
امواجِ بلا پہ رقص کرتا ہوں میں
ہر لحظہ حیات کا اشارہ پاکر
دامانِ فنا پہ رقص کرتا ہوں میں

شئون علمیہ

پچاس برس بعد کی دنیا

جامعہ گلاسگو کے معلم تشریح پروفیسر آئی برن نے اپنی ایک تقریر میں بیان کیا کہ جو لوگ ۲۰۰۰ء میں زندہ رہیں گے وہ دیکھیں گے کہ

کارخانوں میں بہت سا کام روبٹ (ROBOTS) انجام دیں گے۔ اور گھروں میں لاسلکی دور نما ٹیلیفون لگے ہوں گے اس سے ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جب کوئی شوہر اپنی بیوی کو فون پر اطلاع دے گا کہ اسے کام میں دیر ہو گئی ہے تو وہ دیکھ لے گی کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

اون اور روئی کی کاشت کرنے والے بے کار ہو جائیں گے کیونکہ سارے کپڑے کیمیاوی اشیاء سے تیار ہوں گے۔

دنیا کی آبادی بڑھ جائے گی۔ اس لئے انسان مجبور ہو کر سمندر کا رخ کریں گے جس سے وہ ایندھن اور غذا حاصل کریں گے

انسان کی اوسط عمر ۱۰۰ برس کے قریب ہو جائے گی۔

جامعہ کے شعبہ ہوابازی نے اطلاع دی ہے کہ امریکہ میں لوگ سیاروں تک سفر کے لئے اپنی نشستیں محفوظ کرا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ سفر کے وقت نامے بھی شائع کر دیئے گئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ چاند تک پہنچنے کے لئے ۴۱ گھنٹے درکار ہوں گے اور مریخ تک پہنچنے کے لئے ۵۷ دن لگیں گے۔

لیکن پروفیسر موصوف نے فرمایا کہ اس میں ایک بڑا "مگر" بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ زمین کے تجاذبی حلقے سے باہر نکلنے کے لئے ۲۵۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار درکار ہوگی اور ہم ابھی تک صرف ۱۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار حاصل کر سکے ہیں۔

سورج کی توانائی

امریکہ کے سائنسی اور صنعتی تحقیق کے شعبہ نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس نے اعلان کیا ہے کہ مستقبل قریب میں سورج کی توانائی (ENERGY) کو حرارت یا طاقت کی شکل میں استعمال کرنا ممکن نہ ہوگا۔ لیکن بعض خاص حالات میں اس سے فائدہ ضرور اٹھایا جا سکے گا۔

کمیٹی کے صدر ڈاکٹر ہلارڈ کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ سورج کی توانائی کے استعمال کے امکانات بتلائیں اور یہ بتائیں کہ اس سلسلہ میں تحقیقی کام شعبہ کی طرف سے انجام دیا جائے یا نہیں۔

کمیٹی نے بتلایا کہ گھروں میں پانی گرم کرنے کے لئے سورج کی توانائی کا استعمال بعض خاص حالات میں ممکن ہے۔

اور بعض گرم ممالک میں ممکن ہے کہ شمسی گرمالہ اور حرارتی پمپ استعمال کرکے پانی کی کشید کی جا سکے۔

کمیٹی نے رپورٹ میں بتلایا ہے کہ گھروں کو سورج کی شعاعوں سے گرم کرنے کی طرف توجہ کی جانی چاہئے۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ کھڑکیاں بڑی رکھی جائیں۔ ماضی میں اس کی طرف کم توجہ کی گئی ہے۔ حالانکہ اس سے ایندھن میں کفایت ہوتی ہے۔

رپورٹ نے تسلیم کیا ہے کہ کھانے پکانے کے دیگر ذرائع کے ہوتے ہوئے سورج سے کھانا پکانے کا رجحان نہیں ہے لیکن جہاں کوئلہ، برق، یا لکڑی نہیں ملتی وہاں ایک آفتابی چولہا کام میں لایا جاسکتا ہے جس سے کھانا نہایت عمدگی سے تیار ہو سکتا ہے۔

رپورٹ میں ہندوستانی قومی تجربہ خانۂ طبیعات (انڈین نیشنل فزیکل لیبوریٹری) کے تیار کردہ آفتابی چولہے کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ایک آئینہ اور ایک دباؤدار کوکر (PRESSURE COOKER) استعمال کیا گیا ہے۔ یہ چولہا اچھا کام دیتا ہے، لیکن ساتھ ہی اس کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس چولہے کی قیمت اتنی ہے کہ جن لوگوں کے لئے اسے بنایا گیا ہے وہ اسے خرید نہ سکیں گے۔

تبصرے

اقبال کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی

از ڈاکٹر مظہیر الدین احمد الجامعی تقطیع کلاں صفحات ۲۰۳ کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت مجلد تین روپیہ پتہ :۔ اشاعت محل۔ دارالسلام قدیم ملک پیٹ حیدرآباد دکن۔

ڈاکٹر اقبال مرحوم کے فلسفہ۔ ان کی شاعری اور سوانح حیات سے متعلق انگریزی اور اردو میں اب تک چھوٹی بڑی بیسیوں کتابیں اور سینکڑوں مقالات لکھے جا چکے ہیں لیکن اس کتاب کے لائق مؤلف کا دعویٰ ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے پیغام و کلام کی اصل روح جو "آدم گری" ہے اسے خاطر خواہ سمجھنے کی کوشش کسی نے نہیں کی ہے اور جو شخص جس خیال کا ہے اس نے کلام اقبال کو اپنے ہی خیالات کے سانچے میں اتار لیا ہے اس بنا پر انھوں نے یہ کتاب لکھی ہے جس میں ترجمان حقیقت کے کلام کا تحلیلی و تنقیدی مطالعہ کر کے متعدد اشعار کی تشریح انھی کے اشعار سے اور خود اپنی طرف سے اس طرح کی گئی ہے جس سے پورے کلام میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہ معلوم ہو کہ دراصل سارا کلام ایک ہی پیغام کے مختلف اجزا ہیں اس میں شبہ نہیں کہ یہ کوشش بڑی مستحسن ہے اور پھر مؤلف کے خطیبانہ اور واعظانہ انداز بیان نے اس میں اور زور پیدا کر دیا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ کسی حقیقت پر علمی اور سنجیدہ گفتگو کرنے کے لئے یہ طرز بیان اور یہ انداز گفتگو ناموزوں اور نامناسب ہے اس طرز بیان سے جذبات تو برانگیختہ ہو جاتے ہیں لیکن موضوع بحث کے بہت سے گوشے پردۂ خفا میں رہ جاتے ہیں چنانچہ اس میں بھی یہی ہوا ہے ہر شخص جانتا ہے کہ جہاں تک شعائر اسلام کے ادب و احترام اور اسلامی رسومات و عبادات اور شریعت و طریقت کے اصل خط و خال کا تعلق ہے اقبال مرحوم اس معاملہ میں کٹر سے کٹر مولوی اور صوفی تھے اور انھوں نے جس "ملائیت" اور "صوفیت و خانقاہیت" پر نفرین کیا ہے وہ صرف وہ ہے جس کو بعض لوگوں نے صرف ایک پیشہ کی حیثیت سے اختیار کر لیا ہو اور وہ جسد

بے روح کی طرح بے کار و بے مصرف ہو کر رہ گئی ہوں لیکن اس کے باوجود لائق مؤلف نے اس خاص عنوان کی نسبت اقبال کے کلام کی تشریح اس طرح کی ہے کہ پڑھنے والے کے دل سے سرے سے اسلامی عبادات و رسوم اور شریعت و تصوف کے حدود ظاہری و باطنی کی عظمت و اہمیت ہی نکل جاتی ہے یہ اور اسی طرح کی چند فروگذاشتوں اور بے اعتدالیوں کے علاوہ کتاب مجموعی حیثیت سے مفید اثر انگیز اور ولولہ آفریں ہے اور اقبالیات کے طالب علم کے مطالعہ کے لائق ہے

قطعات و رباعیات اکبر الہ آبادی حصہ دوم | مرتبہ جناب بھیا احسان الحق صاحب تقطیع کلاں ضخامت ۲۴۰ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت مجلد تین روپیہ چھ آنے شائع کردہ بزم اکبر کراچی نمبر ۴

بزم اکبر کراچی نے جس کا ذکر انھیں صفحات میں پہلے آچکا ہے حضرت اکبر الہ آبادی سے متعلق کتابیں شائع کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے۔ یہ کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے اس میں حضرت لسان العصر کے قطعات و رباعیات جن کی تعداد تین سو بیاسی ہے تیرہ ابواب میں مختلف عنوانات کے ماتحت مرتب و مہذب کر کے شائع کئے گئے ہیں ان ابواب کے عنوانات یہ ہیں۔ حمد و دعا اور نعت و منقبت۔ اسلامیات و عرفانیات اسلام سے بے گانگی۔ دین و دانش۔ لامذہبی۔ پند و موعظت۔ اخلاق و معاشرت۔ بصائر و حکم۔ قومیات و سیاسیات۔ طنزیات۔ تقلید فرنگ۔ انگریز اور انگریزی حکومت۔ ادبی چٹکلے اور شعری لطائف اس مجموعہ کا ہر قطعہ اور ہر رباعی ادب و حکمت کا انمول موتی ہے جس پر اردو زبان و شعر کو بجا طور پر فخر و ناز ہو سکتا ہے پھر لائق مرتب نے جگہ جگہ ان قطعات و رباعیات پر تشریحی نوٹ لکھ کر اس مجموعہ کی افادیت کو دو چند کر دیا ہے اس بناء پر یہ اس لایق ہے کہ ہر صاحب ذوق اس کا مطالعہ کرے اور اس کا انتخاب اپنے بچوں اور بچیوں کو پڑھائے۔ بزم اکبر کی یہ کوشش سزاوار تحسین ولائق صد آفریں ہے کہ وہ اردو کے ایک پوشیدہ خزانہ کو اس طرح وقف عام کر رہی ہے۔

اکبر اس دور میں | مرتبہ جناب اختر انصاری اکبر آبادی تقطیع کلاں ضخامت ۳۳۶ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت پانچ روپیہ شائع کردہ بزم اکبر کراچی ملا

یہ کتاب حضرت اکبر کی شخصیت اور ان کی شاعری کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ۲۳ مقالات پر جو اردو زبان کے نامور اور روشناس اہل قلم کے لکھے ہوئے ہیں مشتمل ہے اور آخر میں حضرت مرحوم کی نظم کے دو فارسی ترجمے ہیں، یہ مقالات اگرچہ مختصر اور ایک حد تک طالب علمانہ ہیں تاہم لسان العصر کے کلام کے مختلف پہلوؤں اور ان کے اصل نقطۂ خیال کے سمجھنے میں ان سے کافی مدد مل سکتی ہے اس بناء پر کلام اکبر کے طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ مفید اور بصیرت افروز ہوگا امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے۔

تبیان الشہور از جناب محمد داؤد صاحب قاسمی جونپوری تقطیع خورد ضخامت ۲۰۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت دو روپیہ پتہ:- محمد داؤد و عبد المعبود صاحب چوراہہ نکی ٹولہ جونپور۔

مسلمانوں کے قمری سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں اور ہر مہینہ میں کوئی نہ کوئی دن ایسا ہوتا ہے جو مذہبی یا معاشرتی یا عام رسم و رواج کے اعتبار سے اہمیت رکھتا ہے۔ خواہ اس کی اہمیت واقعی اور حقیقی ہو یا محض فرضی! مگر بہت سے مسلمان ہیں جن کو نہ ان کی اہمیت کی وجہ معلوم ہے اور نہ انہیں اس کا علم ہے کہ وہ دن جس طرح منایا جاتا ہے اس میں کتنی بات غلط ہے اور کتنی صحیح اسی ضرورت کے پیش نظر لائق مولف نے یہ کتاب لکھی ہے جس میں شب و روز اور ماہ و سال کے تعین اور شمسی و قمری سالوں کی تاریخ اور ان کے آغاز وغیرہ سے متعلق گفتگو کرنے کے بعد یکم محرم الحرام سے لے کر ماہ ذی الحجہ تک کے اہم دنوں کے اہم واقعات اور اس سلسلہ کے احکام و مسائل بیان کئے گئے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب تاریخی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے مفید اور لائق مطالعہ ہے۔

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور متعلقہ واقعات کا بیان۔ دوسرا ایڈیشن جس میں ختم نبوت کے اہم اور ضروری باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ قیمت چھ روپے آٹھ آنے ہے مجلد سات روپے آٹھ آنے ۷؍۸

اسلام کا اقتصادی نظام وقت کی اہم ترین کتاب جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ چوتھا ایڈیشن قیمت ۵؍ مجلد ۶؍

اسلام کا نظام مساجد۔ قیمت ۴؍ مجلد ۵؍

مسلمانوں کا عروج و زوال:۔ جدید ایڈیشن۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ لغت قرآن پر بے مثل کتاب۔ جلد اول طبع دوم قیمت [illegible] مجلد [illegible]

جلد ثانی قیمت [illegible] مجلد [illegible]

جلد ثالث قیمت [illegible] مجلد [illegible]

جلد رابع (زیر طبع)

مسلمانوں کا نظم مملکت مصر کے مشہور مصنف ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن کی محققانہ کتاب النظم الاسلامیہ کا ترجمہ۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت

جلد اول:۔ اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب قیمت چار روپے [illegible] مجلد پانچ روپے [illegible]

جلد ثانی:۔ قیمت چار روپے [illegible] مجلد پانچ روپے [illegible]

قرآن اور تصوف حقیقی اسلامی تصوف پر محققانہ کتاب۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

ترجمان السنہ جلد اول۔ ارشادات نبوی کا بے مثل ذخیرہ۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

ترجمان السنہ جلد دوم۔ اس جلد میں چھ سو کے قریب حدیثیں آگئی ہیں۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

تحفۃ النظار یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ مع تنقید و تحقیق از مترجم و نقشہائے سفر قیمت [illegible]

قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات

قرون وسطیٰ کے حکمائے اسلام کے شاندار علمی کارنامے

جلد اول۔ قیمت [illegible] مجلد [illegible]

جلد دوم قیمت [illegible] مجلد [illegible]

عرب اور اسلام:۔

قیمت تین روپے آٹھ آنے ہے، مجلد چار روپے آٹھ آنے [illegible]

وحی الٰہی

مسئلہ وحی اور اس کے تمام گوشوں کے بیان پر پہلی محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ پر ایسے دل پذیر انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل کی گہرائیوں میں سما جاتا ہے۔

جدید ایڈیشن قیمت [illegible] مجلد چار روپے

منیجر ندوۃ المصنفین۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی-۶

REGISTERED NO. D. 183

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسن خاص جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین جو حضرات پچیس روپئے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلاکسی معاوضہ کے پیش کیا جائیگا۔

۳۔ معاونین:۔ جو حضرات اٹھارہ روپئے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا انکی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ 'برہان' (جس کا سالانہ چندہ چھ روپئے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ احبّاء نو روپئے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبّاء میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دیجائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ بُرہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہوجاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپئے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپئے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کراکر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین دہلی کی مذہبی اور تاریخی مطبوعات

ذیل میں ندوۃ المصنفین دہلی کی چند اہم دینی، اصلاحی اور تاریخی کتابوں کی فہرست درج کی جاتی ہے۔ مفصل فہرست جس میں آپ کو ادارے کے حلقوں کی تفصیل بھی معلوم ہوگی دفتر سے طلب فرمائیے۔

اسلام میں غلامی کی حقیقت جدید ایڈیشن جس میں نظر ثانی کے ساتھ ضروری اضافے بھی کیے گئے ہیں قیمت ۳ مجلد للعہ

سلسلہ تاریخ ملت مختصر وقت میں تاریخ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں کیلئے یہ سلسلہ نہایت مفید ہے اسلامی تاریخ کے یہ حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع بھی۔ انداز بیان نکھرا ہوا اور شگفتہ

نبی عربی صلعم (تاریخ ملت کا حصہ اول) جس میں سرور کائنات کے تمام اہم واقعات کو ایک خاص ترتیب سے نہایت آسان اور دل نشین انداز میں یکجا کیا گیا ہے۔ قیمت ۸ مجلد ۱۲

خلافتِ راشدہ (تاریخ ملت کا دوسرا حصہ) عہد خلفائے راشدین کے حالات و واقعات کا دل پذیر بیان قیمت ۱۲ مجلد ۱۲

خلافت بنی امیہ (تاریخ ملت کا تیسرا حصہ) قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ مجلد تین روپے بارہ آنے

خلافت ہسپانیہ (تاریخ ملت کا چوتھا حصہ) قیمت دو روپے۔ مجلد دو روپے چار آنے

خلافت عباسیہ (جلد اول) (تاریخ ملت کا پانچواں حصہ) قیمت ۱۲ مجلد للعہ

خلافت عباسیہ (جلد دوم) (تاریخ ملت کا چھٹا حصہ) قیمت للعہ، مجلد صہ

تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ (تاریخ ملت کا ساتواں حصہ) مصر اور سلاطین مصر کی مکمل تاریخ صفحات ۳۰۰ قیمت تین روپے چار آنے۔ مجلد تین روپے آٹھ آنے

خلافت عثمانیہ تاریخ ملت کا آٹھواں حصہ مجلد ۸

فہم قرآن جدید ایڈیشن جس میں بہت سے اہم اضافے کیے گئے ہیں اور مباحث کتاب کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے۔ قیمت ۴ مجلد ۴

غلامان اسلام اسی سے زیادہ غلامان اسلام کے کمالات و فضائل اور شاندار کارناموں کا تفصیلی بیان۔ جدید ایڈیشن قیمت ۵ مجلد ۶

اخلاق و فلسفۂ اخلاق علم الاخلاق پر ایک مبسوط اور محققانہ کتاب۔ جدید ایڈیشن جس میں غیر معمولی اضافے کیے گئے ہیں۔ اور مضامین کی ترتیب کو زیادہ دل نشین اور سہل کیا گیا ہے۔ قیمت ۶ مجلد معہ

قصص القرآن جلد اول تیسرا ایڈیشن۔ حضرت آدمؑ سے حضرت موسیٰ و ہارونؑ کے حالات و واقعات تک۔ قیمت ۲ ، مجلد معہ

قصص القرآن جلد دوم حضرت یوشعؑ سے حضرت یحییٰؑ کے حالات تک تیسرا ایڈیشن قیمت ۳ مجلد للعہ

قصص القرآن جلد سوم انبیاء علیہم السلام کے واقعات کے علاوہ باقی قصص قرآنی کا بیان قیمت صہ مجلد ۶

بُرہان

جلد سی ام — شمارہ نمبر ۳

مارچ ۱۹۵۳ء مطابق جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

۲۸ رفروری کو ڈھاکہ میں "کل پاکستان ہسٹری کانفرنس" کے موقع پر جو ناگوار واقعہ پیش آیا وہ حد درجہ افسوسناک اور لائق شرم ہے اور ہر سمجھدار انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کردیتا ہے کہ اگر یہی ونہار یہی رہے اور جمہوریت کے لفظ کا غلط استعمال اسی طرح ہوتا رہا تو آخر پورے ملک اور قوم کے حق میں اس کا انجام کیا ہوگا۔

واقعہ یہ ہے کہ کل پاکستان ہسٹری کانفرنس کا تیسرا اجلاس ۲۷، ۲۸ رفروری اور یکم مارچ کو ہونا قرار پایا تھا۔ اس قرارداد کے مطابق ۲۷ر کو کانفرنس کا پہلا جلسہ بڑے تزک و احتشام اور شان وشوکت کے ساتھ شروع ہوا۔ گورنر نے افتتاح کیا کانفرنس میں مقامی وزراء عمالِ حکومت اور یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر اور ہندو پاکستان اور بعض دوسرے ملکوں کے مندوبین کے علاوہ پاکستان کے مرکزی کابینہ کے چند وزراء بھی شریک تھے۔ جو محض اس اجلاس میں شرکت کی غرض سے کراچی سے ڈھاکہ ایک ہزار میل کا سفر کرکے آئے تھے۔ کانفرنس کے پہلے اجلاس کے صدر مولانا سید سلیمان ندوی تھے جناب صدر نے اپنے فاضلانہ خطبہ میں ہندو پاکستان میں اسلامی ثقافت وتمدن کے آثار ونشانات پر گفتگو کے بعد بنگالی زبان کے تدریجی ارتقاء پر روشنی ڈالی اور اس سلسلہ میں زبان کے رسم الخط سے متعلق اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے فرمایا

"میرے خیال میں بنگالی مسلمانوں کو سارے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک ملت بننے کے لئے ضروری ہے کہ سارے پاکستان کا ایک ہی خط ہو اور وہ عربی رسم الخط نسخ ہے جس میں پشتو، سندھی اور پنجابی لکھی جاتی ہے اس کا ثمرہ یہ ہے کہ ان صوبائی زبانوں کے نہ جاننے والے عربی رسم الخط اور مشترک عربی وفارسی الفاظ کی بناپر عبارت کا ماحصل مطلب بآسانی سمجھ لیتے ہیں اگر بنگال کے مسلمان بنگالی کا خط بدل دیں تو وہ سارے پاکستان کو ایک بنا سکتے ہیں اور قرآن کے لئے عربی رسم الخط اور زبان کے لئے بنگالی رسم خط سیکھنے میں بچے دوہری محنت سے بچ جائیں گے۔"

سولہ صفحے کے خطبۂ صدارت میں رسم خط سے متعلق مشورہ کے صرف یہی دو چار جملے تھے اور

وہ بھی سنجیدہ اور متین انداز میں خلوص اور ہمدردی کے ساتھ! لیکن نونہالانِ قوم کو یہ بھی گوارا نہ ہوئے چنانچہ اگلے دن یعنی ۲۸ رفروری کو جب کہ کانفرنس کا دوسرا اجلاس شروع ہی ہوا تھا اور جس میں معزز و موقر مہمانوں اور نمائندوں کے علاوہ مرکز اور صوبہ کے وزراء اور یونیورسٹیوں کے ذمہ دار عمال وارباب مناصب شریک تھے طلباء کی ایک کثیر تعداد مولانا سید سلیمان ندوی کے خلاف خصوصاً اور دوسرے قسم کے عموماً نعرے لگاتی ہوئی ہال میں گھس آئی اور یہاں بھی نعرے لگانے شروع کر دیئے، ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر نے جو صدر مجلس استقبالیہ بھی تھے۔ طلبا کو ہر چند سمجھایا۔ مگر جب کوئی اثر نہ ہوا اور صورت حال پر قابو نہ پایا جا سکا تو اجلاس ملتوی کر دیا گیا طلبا نے اس پر بھی قناعت نہ کی۔ بلکہ جب سید صاحب موٹر پر بیٹھ کر اپنی قیام گاہ جانے لگے تو مظاہرین نے موٹر روک لی اور آخر جب موصوف نے ان کے منشا کے مطابق انھیں کے لکھے ہوئے ایک بیان پر مجبوراً دستخط کر کے رسم خط سے متعلق اپنا مشورہ واپس لے لیا تو اب گلو خلاصی ہوئی اور ان کو وہاں سے روانہ ہو جانے کی اجازت ملی۔ اس واقعہ کا یہ اثر ہوا کہ اجلاس قرار داد کے مطابق تین دن ہونے والا تھا۔ مگر وہ ایک ہی دن ہو کر رہ گیا اور باقی دو روز کی نشست نہ ہو سکی۔

اگرچہ ہمارے نزدیک مولانا کا مشورہ صحیح نہیں ہے اور جس بنا پر ہم ہندوستان میں اردو کے لئے دیوناگری رسم خط کو اختیار کر لینے کے حامی نہیں ہیں ٹھیک اسی بنیاد پر ہم اس کو درست نہیں سمجھتے کہ وحدت ملت کے نام پر مشرقی بنگال کے مسلمانوں کو اس کی دعوت دی جائے کہ وہ اپنی زبان کے لئے عربی یا کوئی اور رسم خط اختیار کریں وہاں وحدتِ ملت کے نام پر اور یہاں متحدہ قومیت کی بنیاد پر آخر یہ کیوں ضروری ہے کہ مقامی، معاشرتی و سماجی اور لسانی امتیازات و خصوصیات کو ہی خیرآباد کہہ دیا جائے علاوہ بریں مولانا کو یہ بھی سوچنا چاہیے تھا کہ وہ تاریخ کانفرنس میں خطبہ پڑھ رہے تھے نہ کہ اسلامیات یا لسانیات کی کسی انجمن میں پھر کیا ضروری تھا کہ خواہ مخواہ ایک ایسے مسئلے کا ذکر کیا جاتا جس کی نسبت مشرقی بنگال کے جذبات و احساسات کا انھیں اچھی طرح علم نہ ہوگا، کوئی بات خواہ کیسی ہی حق ہو اور کیسے ہی خلوص و صداقت پر مبنی ہو لیکن اگر اس کو بے موقع کہا جائے اور جو کہنے کا طریقہ ہے اس طریقہ پر اس کو نہ کہا جائے تو اس کا اثر بجائے مفید ہونے کے مضر ہی ہوتا ہے، وحدت محض ادھر ادھر کی دو چار باتیں کہہ دینے سے پیدا نہیں ہو سکتی اس

کے لئے اصولاً ضروری یہ ہے کہ پہلے اسلامی اجتماعیت کا یقینِ محکم پیدا کیجئے جب یہ یقین پیدا ہو جائے گا
تو مقامی امتیازات وخصوصیات کے اختلاف کے باوجود پوری قوم وحدتِ ملی کے رشتہ سے خود بخود
منسلک ہو جائے گی تاہم نوجوانانِ قوم کو یہ سمجھنا چاہیے تھا کہ مولانا نے جو کچھ فرمایا تھا وہ ایک شخص کی خواہ
وہ ملک کی کیسی ہی مقتدر ہستی ہو اپنی ذاتی رائے تھی وہ نہ حکومت کا کوئی آرڈیننس تھا اور نہ اسمبلی یا کونسل
کا فیصلہ! پھر مولانا جو ہند و پاک دونوں ملکوں کے نامور عالم اور بزرگ ہیں اس وقت مشرقی بنگال کے
مہمان بھی تھے اس بناء پر شرافت اور انسانیت کا تقاضا تھا کہ اگر انہیں مولانا کی کوئی ایک بات ناگوار بھی ہوئی
تھی تو اس پر صبر کرتے اور اگر ضرورت ہوتی تو سنجیدگی کے ساتھ مولانا سے اس پر تبادلہ خیالات و مذاکرہ کرتے،
جمہوری ملکوں کا قاعدہ یہ ہے کہ عوام اپنی مرضی سے اور اپنی صوابدید کے مطابق اسمبلیوں اور کونسلوں کے
لئے اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں حکومت اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے عوام قانون کو کبھی اپنے
ہاتھ میں نہیں لیتے۔ انھیں اپنے نمائندوں پر پورا اعتماد ہوتا ہے۔ انھیں حکومت سے جو مطالبہ کرنا ہوتا ہے
وہ اپنے نمائندوں کے ذریعہ کرتے ہیں یورپ اور امریکہ جو آج کل کی رائج الوقت جمہوریت میں ساری
دنیا کے استاد اور معلم اول ہیں ان سے سبق لینا چاہیئے کہ وہاں آئے دن کتنے اہم اور نازک معاملات و
مسائل پیش آتے رہتے ہیں مگر کبھی آپ نے اخبارات میں پڑھا کہ فلاں یونیورسٹی کے طلباء نے اسٹرائک
کر دی، پولیس سے الجھ پڑے، وائس چانسلر کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ اور جلسے جلوس کے ذریعہ مظاہرے کئے
ہند اور پاکستان دونوں ملکوں کے نوجوان طلباء کو جو اپنی قوم کے مستقبل کے معمار ہیں اس
حقیقت کو کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ جہاں کسی بزرگ قوم کی کوئی بات ناگوار ہوئی اور اس کے خلاف
جبر و تشدد کا مظاہرہ شروع کر دیا اس کا نام ہرگز جمہوریت نہیں ہے بلکہ یہ نہایت شدید قسم کی قومی
خودکشی ہے، جس کا انجام تباہی و بربادی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا جمہوریت میں ہر شخص کو اظہارِ خیال
کی آزادی یقیناً حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ آزادی کسی خاص ایک گروہ یا فرقہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی
اور اگر آپ دوسروں کی اس آزادی کا احترام نہیں کرتے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ دوسرے بھی آپ
کی آزادی کا احترام نہیں کریں گے نتیجہ باہمی تصادم اور تزاحم ہوگا اور اس میں کسی ایک کا بھی بھلا نہیں ہوگا!

م

(جناب انعام اللہ خاں صاحب ناصر)

(ایڈیٹر روزنامہ الجمعیتہ دہلی)

لیکن سنائی یزید اور یزیدیوں کے متعلق بھی اچھی رائے نہیں رکھتے تھے حدیقہ میں ان کا ذکر نیکی سے نہیں کیا۔ امام حسینؓ کے قتل کی بناء پر انھیں ملامت کی اور ان کے اس فعل کو بُرا کہا۔

پیری اور مریدی تصوف کا ایک رکن ہے صوفیا کے نزدیک مرید کو چاہئے کہ پیر کی اس حد تک پیروی کرے کہ اپنے کو اس کے اجزا میں سے ایک جز جیسا کہ بیٹے باپ کو سمجھتے ہیں سمجھے اور پیر چاہئے کہ مسلمانی کے تمام اوصاف سے متصف اور اخلاقِ الٰہی سے متخلق ہو حقیقی تصوف عبادت ہے خلق اللہ کو فائدہ پہنچانے سے اور اللہ کے امر کی تعظیم بجالانے سے سعدی فرماتے ہیں

بزرگی بجز خدمتِ خلق نیست — بہ تسبیح و سجادہ و دلق نیست

اسلام کے جلیل القدر عارف حضرت جنیدؒ بغدادی فرماتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تصوف قیل و قال کا نام نہیں بلکہ عبادت ہے دنیا کو چھوڑنے اور مالوفات کے ترک کر دینے سے ابو محمد حریری نے کہا ہے کہ تصوف عبادت ہے اچھے اخلاق اختیار کرنے اور بُری عادتیں چھوڑ دینے سے۔

سنائی پیر کے انتخاب اور اوصاف کے متعلق فرماتے ہیں

راہ تجرید را ز غول مپرس — خبر از پیر بوالفضول مپرس

ترک اور تجرید کے نکات غول سے نہ پوچھ۔ پیر بوالفضول سے راز کی بات کیا جانے

مرہم ریش چوں کند افعی — دارو ئے درد چوں دہد اعمیٰ

سانپ زخم پر مرہم کس طرح رکھ سکتا ہے۔ اور اندھا درد کی دوا کس طرح دے سکتا ہے

پیر باید کہ راہبر باشد سالک وحیبت و باخبر باشد

پیر ایسا چاہئے جو راہ دکھائے۔ سالک حیبت اور باخبر ہو

از تہ دل بود بحق یک رنگ صافی از زرق و حیلہ و نیرنگ

تہ دل سے حق کے ساتھ یک رنگ ہو۔ اور مکر و حیلہ و نیرنگ سے پاک ہو

حکیم سنائی باتفاق جمہور مورخین شیخ یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے اور شیخ صاحب علماء مشاہیر و مشایخ کبار اسلام سے ہیں! ابن خلکان لکھتے ہیں کہ

شیخ لڑکپن میں ۴۶۰ھ کے قریب بغداد میں آئے اور شیخ ابو اسحق شیرازی کی خدمت میں پہنچ کر فقہ کی تحصیل شروع کی اور بعد میں اپنے زمانے کے ممتاز فاضل اجل ہوئے شیخ نے حدیث حسین صمد بن علی بن مہتدی باللہ و ابی الغنائم عبدالصمد بن علی بن مامون ابو جعفر محمد بن احمد سے سنی اور اکثر اس کو لکھ لیا اس کے بعد زہد اور ریاضت و مجاہدت نفس اور گوشہ گیری اختیار کی اور ۵۱۵ھ میں بغداد آئے اور وہاں مدرسہ نظامیہ میں حدیث کا درس دینے لگے۔

آپ کے وعظ اور درس نے باشندگان بغداد میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔"

سمعانی کتاب الانساب میں لکھتا ہے کہ یوسف ان علمائے پرہیزگاریں سے تھے جن کی دانش اور عرفان میں برابری کی نسبت تھی۔

مرو میں ان کی خانقاہ کے اندر صوفیا اور دنیا سے قطع تعلق کرنے والے کثیر تعداد میں جمع ہو گئے تھے اور شیخ صاحب بچپن سے لے کر تا دم وفات راستبازی، نیکوکاری اور شرع کی پابندی کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے اور ابو اسحاق شیرازی خورد سالی کے باوجود شیخ صاحب کو اپنے اکثر دوستوں پر ترجیح دیتے تھے شیخ صاحب پہلے بغداد سے مرو میں آئے اور مدت دراز تک وہاں رہے اس کے بعد ایک عرصہ تک ہرات میں قیام اختیار کیا اور پھر اپنے مخلصین کے اصرار پر دوبارہ مرو آئے اور وہاں سے پھر ہرات چلے گئے۔

اخیر عمر میں تیسری بار ہرات سے مرو جانا چاہتے تھے کہ بامئین میں جو ہرات اور بغشور کے درمیان ایک موضع ہے وفات پائی ان کی نعش کو وہاں سے مرو پہنچا دیا گیا ان کا سال ولادت از روئے تحقیق ۴۴۱ھ یا ۴۴۰ھ ہے اور سال وفات تحقیق ۵۳۵ھ ہے

بعض مورخین نے یہ بیان کیا ہے کہ طریقت میں سنائی کا اولین رہ نما ایک بادہ خوار تھا۔ اس کے متعلق یہ عجیب وغریب روایت بیان کی ہے کہ غزنی میں ایک صاحب حال مجذوب رہتا تھا یہ شخص ہمیشہ ایک بھٹی کے اندر بیٹھتا اور شراب کی تلچھٹ جمع کر کے پی جاتا۔

ایک دن سنائی ایک قصیدہ لکھ کر سلطان غزنی کے دربار کی طرف جا رہے تھے۔ (بعض مورخین نے اس بادشاہ کو بہرام شاہ بعض نے مسعود اور بعض نے ابراہیم سمجھا ہے) اور بادشاہ اس وقت ہندوستان جانے کا ارادہ کر رہا تھا۔

سنائی ایک حمام کے قریب سے گذر رہے تھے مجذوب کی آواز سنی تو کھڑے ہو گئے" مجذوب ساقی سے کہہ رہا تھا کہ ایک پیالہ دے کہ بہرام شاہ نے ابھی غزنی کا انتظام نہیں کیا کہ دوسرے ملک کو فتح کرنے کی فکر میں ہے پھر کہا کہ اے ساقی پیالہ بھر دے کہ سنائی نہیں جانتا کہ اسے خدا نے دوسرے کام کے لئے پیدا کیا ہے اگر قیامت کے دن پوچھا گیا کہ ہمارے واسطے کیا لائے ہو تو کیا جواب دے گا"

بیان کرتے ہیں کہ یہ آواز سن کر سنائی کے باطن میں ایک شور پیدا ہوا اور اُس نے بادشاہوں کے دربار کو چھوڑ کر تصوف کی راہ اختیار کی۔

یہ بات معلوم نہیں ہو سکی کہ سنائی شیخ یوسف کی صحبت میں کہاں اور کس طرح پہنچے۔ البتہ دولت شاہ سمرقندی صرف اتنا لکھتا ہے کہ جب بہرام شاہ نے سنائی سے اپنی بہن کا عقد کرنا چاہا تو سنائی اس سے انکار کر کے بعزم حج روانہ ہو گئے اور خراسان کے ایک گاؤں میں جا کر شیخ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

بہر حال جیسا کہ ہم نے پہلے کہا طریقت کے کوچے میں قدم رکھنے کے بعد سنائی کی زندگی بالکل ہی بدل گئی اور ان کے اشعار اور آثار میں اس کا اثر یہاں تک نمایاں ہے کہ ان کے وہ اشعار جو مرید ہونے سے پہلے کہے تھے ان اشعار سے بالکل مختلف ہیں جو مرید ہونے کے بعد کہے اس لئے کہ عشق نے پیشگاہ جلال اور منزلِ معرفت میں پہنچنے کے بعد اشکِ حسرت سے دھویا اور خونِ دل سے رنگین کیا۔

سنائی جو پہلے ایک نغز گو سخنور اور قادر الکلام شاعر تھے نئی زندگی میں داخل ہونے کے بعد معلّم اخلاق اور مصلحِ اعظم بن گئے راہِ عشق و معرفت میں اپنے کو گم کر دیا اور جس شخص کو دولتِ عشق سے

بے بہرہ دیکھا سنگ وخشت جانا۔

مردِ بے عشق را جمادِ شمر دل بے سوز را رمادِ شمر

مرد بے عشق پتھر ہے۔ اور دل بے سوز خاکستر

زندگانی عبارت از عشق است دل وجان استعارت از عشق است

زندگانی کا مطلب ہے عشق۔ دل اور جان عشق کا استعارہ ہے

فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے لالچ کا دیو مجھے جلاتا رہتا تھا لیکن حلقۂ تصوف میں داخل ہونے کے بعد بادشاہ خورسندی نے نیک بختی کا جمال دکھایا

حسب حال آنکہ دیو آز مرا داشت یک چند در گداز مرا

شاہ خورسندیم جمال نمود جمع منع و طمع محال نمود

یہ فرق مندرجہ ذیل مثالوں سے واضح ہوگا۔ پہلے ایک قصیدے میں لکھا تھا

جامۂ بخش مرا خاص خود از سر قدرے تا زفر تر شود کار من امسال چو چنگ

مجھے اپنا لباس خاص عنایت فرما۔ تاکہ میرا کام امسال شان و شکوہ سے چنگ کی طرح بہتر ہو جائے

اور ایک قصیدے میں لکھا تھا

جز از تو بندہ بسے مدح گفت در غزنی شنید مدحش ہر کس و لے ندید سخاش

بندہ نے تیرے سوا بھی غزنی میں بہت لوگوں کی مدح کی ہے لوگوں نے مدح سنی لیکن کسی نے اظہار سخاوت نہ کیا

لیکن پھر اسی سنائی کی زبانی ہم یہ سنتے ہیں

باد رنگین است شعر و خاک رنگین است زر تو ز عشق این و آں چوں آب و آتش بے قرار

شعر ایک رنگین ہوا ہے اور زر ایک خاک رنگیں۔ اور تو اس کے اور اس کے عشق میں آب و آتش کی طرح بے قرار ہے

زیں چنیں بادی و خاکی چوں سنائی بر تر آئی تا چو در شہر ہا بے تاج باشی شہریار

تو اس رنگین ہوا اور رنگین خاک سے بلند تر ہو جا تاکہ شہروں میں تاج کے بغیر فرماں روائی کرے

مختصر یہ کہ سنائی پر برقِ تجلی و عرفان اس قدر چمکی کہ ان کی ہستی کے خرمن کو جلا دیا اور انھیں عشق کی آگ

میں ڈال کر دنیا و مافیہا سے بے نیاز کر دیا چنانچہ فرماتے ہیں

زبادہ بدہ ساقیا زود دادم کہ من خرمنِ خویش برباد دادم

اے ساقی شراب سے جلد میری مدد کر۔ کہ میں نے اپنا خرمن برباد کر دیا

بہ آتش فگندم ہمیں بیم آنجا من ایں جا ز عشق اندر آتش فتادم

یہ خوف تھا کہ مجھے اس جہان میں جلائیں گے۔ میں نے یہیں عشق اختیار کیا اور آگ میں گر پڑا

بآں آتش آنجا مبادا بسوزم از ایں آتش ایں جا رہائی مبادم

خدا نہ کرے کہ میں وہاں کی آگ میں جلوں۔ کاش مجھے اس آگ سے نکلنا نصیب نہ ہو

ز نیک و بد این و آں فارغم من بر ایں نعمت ایزد زیادت کنادم

میں اس کے اور اُس کے نیک و بد سے فارغ ہوں۔ خدا میری اس نعمت کو زیادہ کرے

سنائی کو یہاں تک استغراق ہوا کہ جنت الماویٰ اور فردوس بریں کو اپنی ہمت بلند کے شایاں نہیں سمجھتے تھے۔ عقل نامہ میں فرماتے ہیں

ملکا عاشقِ جمالِ تو ایم منتظر بودہ جلال تو ایم

اے بادشاہ ہم تیرے جمال کے عاشق اور جلال کے منتظر ہیں

ما نہ مردانِ باغ و بستانیم ما نہ در بند آب حیوانیم

ہمیں باغ اور بستان کا شوق نہیں نہ آب حیات کی آرزو ہے

روضۂ سبز و آب را چہ کنیم ما کباب و شراب را چہ کنیم

ہم شاداب باغ اور پانی کو کیا کریں۔ کباب اور شراب سے ہمیں کیا کام

ما بہ غیر از لقا نمی خواہیم ما ز تو جز ترا نمی خواہیم

ہم تیرے جلوہ کے سوا کوئی تمنا نہیں رکھتے ہم تجھ سے تیرے سوا اور کچھ نہیں چاہتے

چند ماں مکر شہد و شیر دہی چند ماں غصہ و زحیر دہی

تو کب تک ہمیں شہد اور شیر کے وعدوں سے بہلاتے گا اور کب تک غم و غصہ میں مبتلا رکھے گا

دُرِ گوہر بہ تنگدستاں دہ   جوئی بادہ بمی پرستاں دہ

یہ موتی تنگدستوں کو بخش۔ شراب کی نہرے کشوں کو دے

سرِ مارا بتاج حاجت نیست   تنِ مارا دواج حاجت نیست

ہمارے سر کو تاج کی حاجت نہیں۔ ہمارے بدن کو قبا کی ضرورت نہیں

ما بدیں قدر سر فرو ناریم   ما بتو بیش ازیں طمع داریم

ہم اتنے کے لئے سر نہ جھکائیں گے۔ ہم تیری ذات کے ساتھ اس سے بیشتر امید رکھتے ہیں

سنائی کی شاعری میں عرفان کی تاثیر

سنائی کی زندگانی کو جس طرح تصوف نے یکایک تبدیل اور ان کی توجہ کو دوسری طرف مائل کر دیا اور ان کے دل میں ایک نیا شور اٹھایا۔ اسی طرح ان کے پایہ شاعری کو بھی ایک نئی بنیاد پر رکھا بلکہ بعد کو آنے والے شاعروں کے لئے شعر کی بنیاد ہی کو زیر و زبر کر دیا مولانا جلال الدین بلخی کے ہاتھ میں چراغ دیا اور شیخ عطار اور خواجہ حافظ اور سعدی کے رستے میں مشعل روشن کی۔ مخزن میں نظامی کی یاری کی۔ تحفہ میں خاقانی کو مدد دی۔ دبدبۂ خسروی کو بلند کیا اور سلسلۂ جامی کو مضبوط۔ اس تبدیلی سے پہلے سنائی کے اشعار میں جو بات نظر آتی ہے وہ بعد کے اشعار میں نظر نہیں آتی وہاں ایک بات ہے خاکی اور یہاں اک رمز ہے افلاکی۔ وہاں سے اہل فرش کی بو آتی ہے اور یہاں اہل عرش کی خوشبو مشام جان کو معطر بناتی ہے۔ خود فرماتے ہیں "کتابہائے خلق کہن شدہ بود" (یہاں کتابوں سے مراد ہیں شعراء کے دیوان) میں نے کلام تازہ اور لطیف پیش کیا معانی بسیار کو تھوڑے لفظوں میں اور بڑے سے بڑے مطالب کو چند جملوں میں سمو دیا۔ کلام میں ایک نیا اسلوب اور ادائے مطالب میں ایک نیا طریقہ اختراع کیا

خاطرم گفت مر مرا در سر   کاے بفضلِ تو روزگار مقر

مجھ سے دل نے در پردہ کہا کہ۔ زمانہ تیرے فضل کا معترف ہے

زود پیش آر و خوب تازہ سخن   کہ خلق شد کتاب ہائے کہن

جلد کلام تازہ سنا کہ پرانی کتابیں چاک ہو گئیں

تا بدین عہد نامد اندر ذکر   زانکہ در پردہ بود معنی بکر

اس زمانہ تک اس کا کوئی ذکر ہی نہ تھا۔ اس وجہ سے کہ معنی تو پردہ میں مستور تھا

معنی کی صحت، الفاظ کی فصاحت، زبان کی سلاست۔ جملوں کی روانی اور مضمون آفرینی کی قدرت سے وہ اشعار پیدا کئے کہ جنہیں روح اور عقل کے ساتھ ملا دینا چاہئے فارسی زبان میں پہلی بار علم الٰہی کے مطالب توحید کے مسائل شعر کے قالب میں ڈھل کر آتے اور علم اخلاق اس تفصیل اور جوش کلام کے ساتھ نظم کا موضوع بنا۔ صوفیا کی مصطلحات مانند خانقاہ اور خرابات، پیری و مریدی، سماع و وجد، صحو و سکر، عشق اور گوشہ گیری، ظاہری تجمل سے منہ پھیر کر حقائق کو دیکھنا دنیا کو بے حقیقت سمجھنا اور عاشق حقیقت ہونا یہ باتیں شعر و شاعری میں داخل ہوگئیں۔

عقل نامہ میں فرماتے ہیں

بہ خرابات شو کہ یار آنجاست　　　بادۂ روشن و نگار آنجاست

میکدہ میں جا کہ دوست وہاں ہے۔ بادۂ روشن اور محبوب اس جگہ ہے۔

حج آزادگاں خرابات است　　　جائے افتادگاں خرابات است

آزادوں کا حج مے خانہ میں بنا ہے۔ افتادوں کی جگہ مے خانہ ہے

خانقاہ آشیانِ مرغ صفاست　　　گلشن عیش و بوستانِ وفاست

خانقاہ مرغ صفا کا آشیاں ہے۔ عیش کا گلشن اور وفا کا بوستاں ہے

پھر عقل نامہ میں فرماتے ہیں

خفتہ گان را مرید نام منہ　　　بر رُخِ مرغِ مردہ دام منہ

سوتے ہوؤں کو مرید نہ کہو۔ مردہ مرغ پر جال نہ رکھ

سنائی کی پایۂ علم | سنائی اپنے عصر کے علمائے اجل میں سے تھے اور حکمت اور فلسفہ میں درجہ استادی رکھتے تھے علم کلام خوب جانتے تھے جیسا کہ حدیقہ سے معلوم ہوتا ہے تفسیر و قرآن اور اس علم کی اصطلاحات میں پورا مہارت رکھتے تھے۔ حدیقہ کے چند مقامات میں آیات قرآن کی منظوم تفسیر کی ہے اخبار و احادیث نبوی بھی کافی معلومات رکھتے تھے۔ حدیقہ میں متعدد احادیث نبوی نقل کی ہیں اور ان کو منظوم کیا ہے۔ علوم ادبی مانند صرف نحو اور عروض مطالعات و معلومات بھی وسیع رکھتے تھے اکثر اپنے اشعار میں ان علوم کی اصطلا

استعمال کر کے اچھی تلمیحات پیدا کی ہیں۔

شعرائے عرب کے دیوانوں کا مطالعہ بھی کیا تھا خود بھی عربی میں اشعار کہتے تھے اپنے اشعار میں قصائد سبعہ کا مکرر ذکر کیا ہے تاریخ قبل از اسلام کا مطالعہ بھی کیا تھا حدیقہ میں ایک مقام پر موت کی تعریف اور بے وفائی دنیا کی مذمت کرتے ہوئے قبل از اسلام کے نامور بہادروں اور بادشاہوں کا ذکر کرتے ہیں۔

زاں ملوکِ عجم کہ در تاریخ بخردان راست موجبِ توبیخ

ان شاہانِ عجم کا حال جو تاریخ میں دانشمندوں کے لئے موجب عبرت ہے

زاں سخن ہائے ملک کیخسرو رستم و زال و منیژہ و جم و زو

ملک کے خسرو کا تذکرہ اور رستم۔ زال۔ نریمان۔ جم اور زو کا حال

زاں خبرہائے آلِ ساسانی راندنِ کام دل بہ آسانی

خاندان ساسانی کے واقعات اور دل کی مرادوں کو آسانی سے پورا کرنا

حکیم سنائی اپنے زمانے کے بڑے طبیب سمجھے جاتے تھے اور اس علم میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ حدیقہ میں ایک فصل جداگانہ طب کے متعلق لکھی ہے اور اس میں اول ان نیم حکیموں کی مذمت کی ہے جو علم طب سے پوری واقفیت نہیں رکھتے اور علاج کر کے مخلوق کو آرام کی بجائے آزار پہنچاتے ہیں۔ طبابت کو زر اندوزی اور ذاتی اغراض کی پیش برد کا ذریعہ بناتے ہیں اسی فصل میں دعا کرتے ہیں کہ خداوند تعالیٰ نیم حکیموں کے شر سے اپنی پناہ میں رکھے بیماروں کو تندرستی عطا فرماتے اور سب کو اپنا فضل نصیب کرے۔

وائے آنکس کہ ہست حاجتمند بہ چنیں قوم کور بے درد مند

اس شخص کے حال پر افسوس ہے جو ایسے مطلق اندھوں کا محتاج ہو

اے خداوندا ازیں چنیں حکما خلق را کن بفضلِ خویش رہا

اے خدا ایسے حکیموں سے خلق کو اپنے فضل سے رہائی دے

چوں جہاں شد ز فعلِ شاں ویراں خلق را زیں بداں بجاں برہاں

دنیا ان کے افعال سے ویران ہو گئی خلق کو ان بدوں کے چنگل سے نجات دے

سنائی طبیب اس شخص کو سمجھتے ہیں کہ جس نے اصولِ طب کو پورے طور سے سیکھا ہو، ریاضیات و طبیعیات سے واقف ہو اور اس فن کے علمی اور عملی اسرار جانتا ہو۔

باز مردے کہ وے طبیب بود ۔۔۔ در سخن صادق و ادیب بود

پھر وہ آدمی جو طبیب ہو۔ کلام میں صادق اور ادیب ہو

از ریاضی برد بدانش راہ ۔۔۔ وز طبیعی بود بوجہ آگاہ

ریاضی میں دسترس رکھتا ہو۔ اور علوم طبعی سے بخوبی آگاہ ہو

بنید احوالِ علت و امراض ۔۔۔ داند اسبابِ جوہر و اعراض

علت اور امراض کا احوال دیکھے اور اسباب جوہر و اعراض کو سمجھے

حدیقہ میں تقریباً ساٹھ اشعار کے اندر امراض کی تشریح کی ہے اس سے طب میں ان کی مہارت معلوم ہوتی ہے۔ سنائی علم نجوم میں بھی کافی معلومات رکھتے تھے اور اگرچہ اس علم کو محل اطمینان نہیں سمجھتے تھے اس کو بے ہودگی جانتے تھے اور آسماں پیمائی کو ایک لغو حرکت کہتے تھے

ہمہ در راہ حکم خود رایند ۔۔۔ بسرِ من کہ ژاژ می خایند

یہ لوگ اپنی رائے سے حکم لگاتے ہیں میں قسم سے کہتا ہوں کہ یہ بکواس کرتے ہیں

غافل اند ایں منجماں از کار ۔۔۔ نیست در کار شان دلِ بیدار

یہ منجم حقیقت سے غافل ہیں پیشگوئیوں میں ان کا دل بیدار نہیں

ہمہ باد است حکم بادا نگار ۔۔۔ تو ز احکام خیرہ دست بدار

منجم کا حکم ہوا کے سوا کچھ نہیں۔ تو ایسے تاریک احکام سے دست بردار ہو جا

سخن فال گر ندارد سود ۔۔۔ باد پیمود کاسماں پیمود

اگر فال کی بات فائدہ مند نہ ہو تو جس نے آسمان کو ناپا ایک فعل عبث کیا

ان تمام باتوں کے باوجود حدیقہ میں اس فن کی اصطلاحات سے مفصل بحث کی ہے مثلاً صفت افلاک، صفت بروج سعادت و نحوست شرف و بال ہبوط و صعود ذوالذنب اولیٰ تسویہ اکثر قصائدِ مدحیہ میں اس علم کی

اصطلاحات لکھی ہیں۔ حکیم سنائی مذکورہ بالا علوم کے علاوہ تعبیرِ خواب کا فن بھی جانتے تھے۔ حدیقہ میں اس موضوع پر سو اشعار لکھے ہیں اور طویل تشریحات کی ہیں۔

سیر و سفر | دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے جب بہرام شاہ نے اپنی بہن کو سنائی سے رشتہ ازدواج میں منسلک کرنا چاہا سنائی نے اسے منظور نہ کیا اور حج کو روانہ ہو گئے۔ اثنائے راہ میں خراسان پہنچے اور وہاں ایک گاؤں میں جا کر شیخ یوسف ہمدانی کے مرید ہو گئے۔

صاحب تذکرہ ید بیضا نے لکھا ہے کہ سنائی سر و پا برہنہ حج کے لئے گئے اور وہاں سے واپس آکر غزنی میں عزلت اختیار کی۔ لطف علی بیگ آذر آتش کدہ میں لکھتا ہے کہ سنائی حرمین شریفین کے سفر خیر اثر کے لئے روانہ ہوئے اور واپس آنے کے بعد شیخ یوسف ہمدان کے پاس پہنچ کر ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے۔ بہر حال یہ بات مسلّم ہے کہ سنائی نے فریضۂ حج ادا کیا اور اس سفر میں مرو و نیشاپور اور ہمدان بھی گئے اور بغداد پہنچ کر حضرت امام اعظمؒ کے مزار کی زیارت کی اور انطاکیہ و حلوان کی سیر کر کے واپس آئے۔

اس لئے کہ انھوں نے خود ایک قصیدے میں تمام واقعات اور راہ میں پیش آمدہ مشکلات تفصیلاً بیان کی ہیں اور بتایا ہے کہ بضرورت کبھی نالائقوں کا بار خاطر بننا پڑتا تھا اور کبھی نادانوں کی صحبت میں رہنا پڑتا تھا

سفر مرو | دولت شاہ سمرقندی لکھتا ہے کہ غزنی سے چل کر خراسان پہنچے اور وہاں سے مرو پہنچ کر شیخ یوسف کے مریدوں میں شامل ہو گئے پھر غزنی واپس آئے اور حکیم کے اشعار سے بھی سفر مرو کی تائید ہوتی ہے

سر اسپِ ارسلاں دیدی برفعت رفتہ بر گردوں ... بمرو آنا کنوں در گل تن اسپ ارسلاں بینی

تو نے اسپ ارسلان کا بلندی میں ہمسر آسمان دیکھا تھا۔ اب مرو میں آکر اس کے بدن کو زیرِ خاک دیکھ

سفر سرخس | حکیم نے سرخس کا بھی سفر کیا تھا یہ سفر شوق کے نتیجے میں نہ تھا بلکہ ایک ظلم کی وجہ سے تھا جو قاضی اسعد مروی نے حکیم پر کیا تھا۔ قاضی صاحب کی انگیخت سے چند غنڈوں نے حکیم صاحب سے کپڑے چھین لئے تھے چنانچہ حکیم صاحب فرماتے ہیں۔

بر سرِ من گماشت رندے چند ... ہمچو او ناکس و ذمیم و شیم

مجھ پر چند اوباشوں کو مسلط کر دیا جو اسی کی مانند نالائق اور بدخصلت تھے

جامہ ہا بستد بزد و گفتند دم — نیز دستار کن بہ ایں سرخم

میرے کپڑے چھین لئے اور کہا کہ اپنی پگڑی بھی ہمارے سر پر رکھ دے

من ز بلخ آنچناں شدم بسرخس — با بلا و عناد رنج و ھم

میں بلخ سے سرخس کو ایسی تکلیف اور اذیت غم سے گیا

کہ گنہ گار یونس ابن متی — بسوئے نینوا ز ساحل یم

جیسے گنہ گار یونس ابن متی۔ ساحل سمندر سے نینوا کی طرف

ہرات | علی ابن ہیصم نے سنائی کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سنائی نے ہرات میں بھی کچھ روز قیام کیا تھا۔ علی بن ہیصم کہتا ہے۔

ز انوارش امروز شہر ہرات — چو برج و قمر پُر شعاع وضیاست

اس کے انوار سے شہر ہرات برج قمر کی طرح روشن ہے۔

سفر بلخ | معلوم ہوتا ہے کہ بزمانۂ جوانی سنائی مدتِ دراز تک بلخ میں مقیم رہے کارنامہ سے یہی ثابت ہوتا ہے، دورانِ قیام ان کے والد بقید حیات تھے اور سلطان مسعود بن سلطان ابراہیم کا دور ختم نہیں ہوا تھا۔ حکیم صاحب کارنامہ بلخ میں مسعود کی تعریف کرتے ہیں اور اسے اپنے والد کے متعلق یاد دلاتے ہیں،

کارنامہ بلخ حکیم صاحب نے بلخ میں تصنیف کی اس میں اپنے غزنوی دوستوں کو مخاطب کیا ہے غزنی سے بلخ کو جاتے ہوتے سنائی نے راہ میں سخت تکالیف اٹھائیں برف پوش پہاڑوں سے گذرنا پڑا سردہوا اور برف باری کی وجہ سے سفر میں بڑی مشکل پیش آئی چنانچہ وہ فرماتے ہیں

کوہ ہائے بریدہ ام بہ زحیر — کہ قزبن بود تیغِ شاں با تیر

میں نے ایسے پہاڑوں میں مسافت طے کی ہے جن کی چوٹیاں تیر کی طرح نوکدار تھیں

آنچہ آمد مرا در ایں رہ پیش — گبر در گور از یں نہ بیند بیش

جو کچھ مجھے اس سفر میں پیش آیا وہ کسی کافر کو بھی قبر میں پیش نہ آئے گا۔

برف نزدِ بنات نعش چناں — کہ ز پنبہ کمان پنبہ زناں

بنات النعش (ستاروں کے جھرمٹ کا نام) کے قریب برف اس طرح نظر آتا تھا جس طرح روئی دھننے والوں کی کمان کے پاس روئی کے گالے

اشک من کردہ بود یاقوتی غم بے قوتی و بے قوتی

طاقت اور غذا کی قلت نے میرے آنسوؤں کو سرخ بنا دیا تھا

بلخ میں پہنچ کر حکیم صاحب کو اور مشکلوں سے دوچار ہونا پڑا۔ اگر قاضی عبدالحمید بلخی مدد نہ کرتے تو کام ہی تمام ہو جاتا۔ کارنامہ میں فرماتے ہیں۔

تا بہ بلخ آمدم بہ عزہ و سلخ عیش من بود چوں مسعوف بلخ

دیو غربت مرا بہ بردی آب گر نبودے کف امیر شہاب

خواجہ عبدالحمید بلخی آں کہ خرد را دل است و دل راجاں[1]

بلخ میں آنے کے بعد ہمیشہ میرا عیش تلخ رہا۔ اگر امیر شہاب مدد نہ کرتا تو۔ دیو افلاس مجھے خوار کر دیتا خواجہ عبدالحمید بلخی خرد کا دل ہے اور دل کے لئے جہان کی حیثیت رکھتا ہے

بہرحال حکیم صاحب کے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہ تمام سفر۔ حلقۂ صوفیا میں شامل ہونے سے پہلے کئے گئے تھے۔

حکیم صاحب عمر بھر پریشان اور پریشانی سے نالاں رہے لیکن طریقت میں قدم رکھنے کے بعد کبھی پریشانی کی شکایت نہیں کی۔

ایک جگہ پریشانی کی شکایت کرتے ہوئے کہتے ہیں

سفر نہ کردمے از بہر بیشی و بیشی اگر بسندہ بدے در حضر بہ ماحضرم

اگر قیام میں میرے لئے ماحضر کافی ہوتا۔ تو میں زیادتی کی طلب کے تقاضے سے سفر نہ کرتا

اور طریق تحقیق میں فرماتے ہیں

بخدائے کہ پاک بے عیب است واہب العقل و عالم الغیب است

کہ مرا اندریں سرائے ہوس جز ہنر نیست یار و مونس کس

با ہنر کاشکے دولتم بودے تا غم و غصہ ام نہ فرسودے

[1] ممکن ہے کہ یہ قاضی عبدالحمید وہی حمید الدین بلخی ہوں جو اس عہد میں ایک ممتاز عالم تھے۔

منصب آنرا بود کہ شور انگیخت ۔۔۔ ناں کسے خورد کا بروئے بریخت

اس خدا کی قسم جو پاک اور بے عیب ہے اور عقل کا بخشنے والا اور غیب کا جاننے والا ہے اس سرائے ہوس میں ہنر کے سوا میرا مونس اور دوست کوئی نہیں کاش ہنر کے ساتھ میرے پاس دولت بھی ہوتی۔ تاکہ غم وغصہ مجھے تکلیف نہ دیتا۔ منصب اس کو ملتا ہے جو شور مچاتا ہے۔ روٹی وہ کھاتا ہے جو دوسروں کو ذلیل کرتا ہے

سنائی کے عہد میں غزنی کی حالت | غزنی آل سبکتگین کے دورۂ سلطنت میں عروسِ مشرق تھا۔ اور ایشیا کے خوبصورت اور آباد ترین شہروں میں سمجھا جاتا تھا اعلیٰ حضرت یمین الدولہ اور ان کے فرزند مسعود کے عہد میں غزنی کے اندر جو تعمیرات پایۂ تکمیل کو پہنچیں ان کی شان وعظمت اور دولت وثروت حد بیان سے باہر ہے محمود کے دربار کا شکوہ اور مسعود کے دربار کا تجمل مشرق میں کسی بادشاہ کو نصیب نہیں ہوا، یمینی دربارِ محمود کی تعریف کرتے ہوئے رقم طراز ہے "مہمانوں کو محلِ ضیافت میں لے گئے جو ایک بہشت تھا، حوضوں اور طلائی اور نقرئی تھالیوں سے آراستہ ہر طرف مرصع ظروف رکھے ہوئے صحن کشادہ اور ہر ایک چیز نفیس وپاکیزہ .... رومی خطائی اور ریشمین فرش بچھے ہوئے۔ صدر مجلس میں ایک انگیٹھی رکھی ہوئی اور اس کے گرد مربع۔ مسدس مثمن اور منور خانوں میں انواع واقسام کے جواہر بھرے ہوئے۔ ان جواہرات کا عکس دیکھنے والوں کی آنکھوں میں خیرگی پیدا کرتا تھا۔ اور سب اس بات پر متفق تھے کہ اکاسرۂ عجم۔ قیاصرۂ روم مقبلان عرب۔ فرمانروایان یمن۔ اور رایان ہند کو ایسے جواہر بے بہا نصیب نہیں ہوئے۔

مجلس کے گرد مشک اذفر۔ عنبر اشہب۔ کافور ریاحی اور عود قماری سے بھرے ہوئے زرّیں طاس رکھے تھے اور بعض کاسوں میں سونے سے بنے ہوئے انواع واقسام کے پھل اور لعل بدخشاں سے بنے ہوئے پھول سجائے گئے تھے[1]

مسعود شہید پسر یمین الدولہ کے واسطے جو تخت بنایا گیا تھا بیہقی نے اسے بچشم خود دیکھا تھا[2]۔

---

[1] نسخہ خطی کے صفحہ ۴۳۴ تاریخ یمینی [2] ص ۵۵۰ و ۵۵۱ تاریخ بیہقی طبع طہران۔

لکھتے ہیں یہ تخت تین سال کی مدت میں مکمل ہوا تھا جو شخص اس تخت کو دیکھتا تھا یہ اور کوئی چیز اس کی نظر پر نہیں چڑھتی تھی' یہ تخت سراسر زر خالص سے تیار کیا گیا تھا اس کے اطراف میں صور تیں شاخہائے نبات کی مانند بنی ہوئی تھیں اور جواہر بیش بہا جڑے ہوئے تھے ...... تخت پر دیبائے رومی بچھی ہوئی اور چار باش زریں تاروں سے بنی ہوئی چھت سے۔ تخت کے اوپر ایک طلائی زنجیر لٹکی ہوئی تھی اور تاج اس میں آویزاں' تخت کے گرد چار دیو پیکر روئیں مجسمے ستونوں کے سہارے نصب تھے اور ان کے ہاتھ اس طور سے بنائے گئے تھے کہ گویا تاج کی حفاظت کر رہے ہیں۔

سلطان کے سر پر تاج کا بار نہ تھا اس لئے کہ تاج کو زنجیروں اور ستون سے مضبوطی کے ساتھ آویزاں کیا گیا تھا اس کے اندر ٹوپی بچی تھی مجلس میں ۔۰۸ طلائی کشتیوں کے اندر کافور۔ مشک۔ عود۔ عنبر اور دیگر اقسام کی خوشبودار چیزیں رکھی ہوئی تھیں) اور تخت کے سامنے ۱۵ بارے یاقوت رمانی۔ لعل بدخشانی زمرد مروارید اور فیروزے کے رکھے ہوئے تھے۔

اس عہد میں غزنی کی مشہور عمارات میں سے باغ فیروزی بھی تھا اور اس کو شہر کی خوش منظر اور دلکش تفریح گاہوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اعلیٰ حضرت یمین الدولہ محمود اس باغ کی فضا اور ہوا کو بہت پسند کرتے تھے اور اسی بنا پر وصیت کی تھی کہ بعد وفات میرے جسد عنصری کو باغ فیروزی میں سپرد خاک کیا جائے چنانچہ انھیں وصیت کے مطابق اسی باغ میں دفن کیا گیا دربار محمود کے مشہور شاعر فرخی سیستانی نے اس باغ کی تعریف میں ایک شاندار قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع ہے۔

بفرخندہ فال و بفرخندہ اختر بہ نو باغ بنشست شاہ مظفر

امین احمد رازی مؤلف ہفت اقلیم نو باغ کے متعلق لکھتا ہے سلطان نے پہاڑ کے دامن میں ایک عالی شان قصر موسوم بہ نو باغ تعمیر کیا تھا اس قصر میں دلکش مکانات اور خوش منظر اور فرح فزا باغ موجود تھے اس باغ کی نہروں اور طرب خیز آبشاروں میں پانی بالا نے کوہ سے آتا تھا۔

غزنی کا دوسرا تاریخی مقام میدان افغان کلی ہے کہ بقول بیہقی سلطان محمود کے والد سبکتگین کی قبر یہیں تھی بعد میں اس مقام پر کوشک محمودی بنایا گیا۔ یہ میدان وہی جگہ ہے جہاں سبکتگین کی تربت اور غزنی کے

مینار واقع ہیں۔ بیہقی نے اپنی کتاب میں کئی مقامات پر افغان سلی کا ذکر کیا ہے۔ بابر نے بھی اپنے تزک میں افغان سلی کا ذکر کیا ہے اور اس کا ترجمہ افغان شعار کیا لیکن درحقیقت اس کلمہ افغان سلی (بنائے افغانی) کی اصل کا تلفظ ثائے مثلثہ عربی کے قریب ہے اور پشتو میں اس کے معنی ہیں منار یادگار۔

چونکہ یہاں سبکتگین رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ واقع تھا اس لئے اس کو یادگار افغان کہتے تھے۔ غزنی کی دوسری مناریں بھی اسی میدان میں واقع ہیں۔

غزنی کی دوسری عظیم الشان عمارتوں میں سے کوشک مسعودی تھا۔ بیہقی لکھتا ہے کہ جب مسعود بن سلطان محمود غزنوی بسلامت و سعادت دارالملک غزنی میں پہنچا تو کوشک کہنہ محمودی واقع افغان سلی میں فروکش ہوا۔ اس اثنا میں کوشک مسعودی تعمیر ہو چکا تھا۔ سلطان صبح کے وقت نئے محل میں گیا اور گھوم کر ہر ایک مقام کو دیکھا۔ وزیروں۔ وکیلوں۔ غلاموں اور کارداروں کے لئے جدا جدا مکانات نامزد کئے اس کے بعد کوشک کہنہ محمودی میں واپس آیا۔

سلطان کے واپس جانے کے فوراً بعد مامورین اپنے اپنے مکانات کو درست کرنے میں مصروف ہو گئے۔ فراش فرش بچھانے اور پردے آویزاں کرنے لگے۔ ایسا محل دنیا میں کسی جگہ موجود نہیں۔ اور کسی بادشاہ نے ایسی پرشکوہ عمارت نہیں بنائی۔ سلطان نے اس محل کا نقشہ اپنے دستِ مبارک سے بنایا تھا۔ اور علم ہندسہ میں انھیں ید طولا حاصل تھا۔ یہ محل چار سال میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ سلطان بے اندازہ خیرات کرتا تھا۔ اور لوگ گروہ در گروہ اس چشمۂ فیض سے سیراب ہونے کے لئے غزنی آتے تھے۔ عبدالملک نقاش اور مہندس سے میں نے سنا کہ ایک روز سرہنگ بوعلی کوتوال سے کہتا تھا کہ سات ہزار درہم خیرات ہو چکے ہیں۔ بوعلی نے کہا مجھے معلوم ہے کہ اس سے دو چند محتاج موجود ہیں۔ ابن اثیر نے بہرام شاہ کی مدد کے لئے غزنی میں سنجر کے وارد ہونے کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ باغات محمودی کے اندر چشموں کے دہانے چاندی کے بنے ہوئے تھے سنجر کے سپاہی انھیں غارت کر رہے تھے۔ سنجر نے انھیں روکا۔

غزنی کی دوسری عالیشان عمارت میں سے مسجد جامع تھی۔ سلطان نے غزوۂ قنوج و کشمیر سے واپس آکر اس مسجد کی تعمیر شروع کی تھی۔ بیہقی لکھتا ہے کہ سلطان نے عازم ہند ہونے سے پہلے حکم دیا تھا

کہ مسجد جامع کے واسطے ایک میدان ہموار کیا جائے اس لئے کہ جامع مسجد قدیم زمانہ سابق کی ضرورتوں کے مطابق تھی۔ اس زمانے کے لوگوں کو کفایت نہیں کرتی تھی۔

جب سلطان غزوہ سے واپس آئے تو میدان ہموار ہو چکا تھا۔ بنیادیں رکھی جا چکی تھیں اور دیواریں بن چکی تھیں، سلطان نے حکم دیا کہ اس عمارت کی تکمیل کے لئے جتنا روپیہ ضروری ہو خرچ کیا جائے۔

استاذان ماہر اور عملہ جابک مرتب کیا گیا اور ثقات حضرت فہرمانی سے ایک ماہر معلم عملہ تعمیر پر مقرر کیا گیا۔ صبح سے شام تک ان کے کام کی نگرانی کرتا اور شام کے وقت ترازو آگے رکھ کر سب کو اجرت دیدیتا مسجد کے لئے سنگ مرمر دور دراز مقامات سے فراہم کیا گیا اور اس کو مربع اور مسدس شکلوں میں تراشا گیا اور مسجد کے طاق ایسے لطیف و زیبا بنائے گئے کہ آنکھ نظارے کے وقت خیرہ ہوتی تھی ان کو مختلف رنگوں اور عجیب شکلوں سے آراستہ کیا گیا اور ان طاقوں پر آب زر سے نقش و نگار کئے گئے، سلطان نے ایک مکان اپنے لئے برائے عبادت تعمیر کرایا اس کی تعمیر میں کمالِ دقت نظر اور نزاکتِ فن سے کام لیا گیا۔ عبادت خانے کا تمام فرش سنگ رخام سے بنایا گیا اور اس کے ہر ایک مربعہ میں آب زر سے خط کھینچا گیا اور لاجورد سے حاشیہ بنایا گیا اس عبادت خانے کی رنگینی و زینت اس درجہ میں پہنچی کہ جو دیکھتا تصویر حیرت بن جاتا۔ لوگ کہتے کہ مسجد دمشق کو دیکھنے اور اس کی عدیم المثالی کا دعویٰ کرنے والو غزنی میں آؤ اور اس کی مسجد جامع کو دیکھو تاکہ تمہارے دعوے کی تردید ہو جائے اور اس کے سامنے ایک مقصورہ بنایا کہ اس میں تین ہزار غلام نماز با جماعت پڑھ سکتے تھے۔ اور لوگ ایک دوسرے کی مزاحمت کے بغیر اپنی جگہ عبادت میں مشغول رہتے تھے اس مسجد کے قریب ایک مدرسہ بنایا اس میں نفیس کتابیں اور نادر تصنیفیں جمع کیں یہ کتابیں علماء اور ائمہ فقہا کی تصحیح کی ہوئی اور نہایت اچھے خط میں لکھی ہوئی تھیں۔ یہاں طلباء تحصیل و ترتیل علم میں مشغول رہتے تھے۔

مسلمان حکومتوں کی موجودہ بدحالی

(ایک امریکن سیاح کے قلم سے)

از

(مولانا محمد ظفیر الدین صاحب پورہ نوڈیہاوی دار العلوم معینیہ)

(۲)

مصری عورتیں | مصری عورتوں کے متعلق لکھتا ہے "مشرق وسطیٰ کے تمام اسلامی ملکوں میں تعلیم یافتہ عورت خیال و عمل کے لحاظ سے اتنی ترقی یافتہ نہیں ہے، جتنی مصری عورت ہے" یہاں کی عورتیں جدید تمدن پر جان دیتی ہیں یہ یورپ کی نقل اتارنے پر فخر کرتی ہیں۔ یہاں کی لڑکیاں سینما کی دلدادہ ہیں۔ ہفتہ میں کم از کم دو بار سینما دیکھنے جاتی ہیں، پارٹیوں اور رقص و سرود کی محفلوں میں بیباک ہو کر شریک ہوتی ہیں۔ انھیں فلم اسٹاروں کے نام یاد ہیں۔ اور حیا و شرم ان سے رخصت ہو چکی ہے، سیاح اپنا واقعہ بیان کرتا ہے۔

"ایک مسلم گھر پر ایک پارٹی میں ایک لڑکی کو میں نے خود یہ کہتے سنا کہ وہ کیری گرانٹ کو دوست بنا سکتی ہے، ہربرٹ مارشل کو شوہر، اور کلارک گیبل کو یہ بھی اور وہ بھی، جب میں نے اسے ٹوکا کہ اس کے گھر والے اسے کیوں کر پسند کریں گے تو بولی کہ "مرے باپ کا تو انتقال ہو چکا ہے اور ماں سمجھتی ہے کہ میں پوری طرح گمراہ ہو چکی ہوں۔ دادی البتہ یہ عقیدہ باندھے بیٹھی ہے کہ ایک دن مجھے ضرور ہدایت ملے گی، اور میں بے دینی کی راہ چھوڑ دوں گی، حالانکہ میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ میں ان کی طرح نہیں، بلکہ نئی قسم کی عورت بننا چاہتی ہوں" (یہ ہے اسلامی روایات کی پابند عورتیں جدید تعلیم سے آراستہ ہو رہی ہیں، پھر سیاح اسماء مہدی نامی عورت کے خیالات نقل کرتا ہے۔

مصر کے تعلیم یافتہ نوجوان طلبہ۔ زمیندار۔ تجارت پیشہ اور سرکاری افسروں کی اولاد ہیں، ان میں آزادی اور ترقی کا بڑا جذبہ ہے، ان میں شدید قسم کی وطن پرستی ہے۔

"اخوتِ اسلامی" کے متعلق سیاح کا بیان ہے "۱۹۲۸ء سے قایم ہے، ایک لاکھ ممبر ہیں، جس میں سے دس ہزار مجاہدوں کی فوج ہے، مذہبی قدامت پرستی اس کا نصب العین ہے ..... عرب ملکوں کا اتحاد چاہتی ہے، اور مصر کی سیادت"

مصری کسان | مصر میں کسانوں کی حالت بڑی قابل رحم ہے، یہ عموماً بھینس پالتے ہیں ان کا دودھ بھی کھاتے ہیں اور ان کو ہل میں بھی جوتتے ہیں عموماً کسان جس گھر میں رہتے ہیں، اسی میں بھینس باندھتے اور رکھتے ہیں مصر میں کسانوں کے بتیس لاکھ کنبے ہیں اور بھینسوں کی گنتی صرف پندرہ لاکھ ہے، بعض کسان جو بھینس نہیں رکھ سکتے، بکری پال لیتے ہیں اور جو اور بھی مفلس ہیں وہ بغیر دودھ ہی کے زندگی گذارتے ہیں، گائے کا رواج نہیں ہے، —— مصر میں اس طرح مویشی کی کمی ہے ڈنمارک میں جہاں دودھ کی سپلائی اٹھائیس ہے، وہاں مصر میں صرف ایک، جن کو دودھ میسر نہیں ہوتا وہ اپنے بچوں کو سیاہ چائے پلاتے ہیں اور اس چائے کے مصری بہت عادی ہیں، اپنا کپڑا گروی رکھ کر بھی چائے ملے تو پیتے ہیں

افلاس کا عالم | مصر کی آبادی پونے دو کروڑ ہے اور یہاں صرف پچیس لاکھ ایکڑ زمین میں کاشت ہوتی ہے۔ یہ زمین نیل کے صدقہ میں بہت زرخیز اور شاداب ہے، روئی مصر کا سونا ہے، گو یہ قابل کاشت زمین کے صرف پانچویں حصہ میں ہوتی ہے روئی کی برآمد اسیؔ فیصدی ہے، پھر بھی کسان بھوکا ننگا ہے اور ساتھ ہی بیمار بھی، مصر کے گاؤں نہایت مفلس اور گھٹیا درجے کے ہیں، کچے مکان ہیں، مکان نہایت بدبودار ہوتے ہیں، مکھیاں بہت زیادہ ہیں یہاں کے دیہاتی پینے کا پانی نالابوں سے حاصل کرتے ہیں، جن میں بچے اور مویشی نہاتے ہیں، دیہاتی لوگ جوتا پہننے والے کو دولت مند سمجھتے ہیں مرد اور بچوں کو کپڑے بہت کم نصیب ہیں عورتوں کا لباس البتہ غنیمت ہے عورتیں پردہ تو نہیں کرتیں لیکن بڑی باعصمت اور پاکدامن ہیں، مصر میں جتنے لوگ بیمار ہیں کہیں اور نہیں، آنکھوں کی بیماری عام ہے یہاں اندھوں کا اوسط تمام دنیا سے زیادہ ہے بلیریا اور گھونگے سے پیدا ہونے والی بیماری بہت زیادہ ہے، اسی فیصدی کسان اس بیماری اور داد کے مریض ہیں، مصری کسان اتنے افلاس و جہالت میں مبتلا ہیں کہ وہ سستی سے سستی دوائیں بھی نہیں خرید سکتے ان کے بچوں کی آنکھیں عام طور پر خراب ہیں ہمیشہ مکھیاں چھیڑتی رہتی ہیں۔

مصر میں تعدد ازدواج برائے نام ہے مگر شک کی بنا پر عموماً طلاق کی نوبت آتی رہتی ہے، مصری لوگ کمزور ہیں، ان کو اچھی غذائیں میسر نہیں کسی طرح زندگی گذار لیتے ہیں۔

زرعی اصلاحات سے حکومت کی بے پرواہی | مصر کا علاقہ تین لاکھ چھیاسی ہزار میل مربع ہے، مگر قابلِ کاشت زمین صرف ساڑھے تین فیصدی ہے باقی سب صحرا ہے، مصر کی آبادی بہت زیادہ ہے، حساب سے آدھے مصری کسان ننگے اور فاقہ زدہ ہیں۔ قانونِ آراضی کی اصلاح ہو تو مصری کسانوں کی آمدنی بڑھ سکتی ہے۔ سیاح کہتا ہے۔

"اعداد و شمار سے ثابت ہے کہ مصر کے ساڑھے سترہ لاکھ کسانوں کے پاس صرف ساڑھے سات لاکھ ایکڑ اور بارہ ہزار دو سو زمینداروں کے قبضے میں اس سے ساڑھے تین گنی آراضی ہے یہ بھیانک حقیقت مصر کی سماجی اور اقتصادی زندگی کے مطلع کو مکدر بنائے ہوئے ہے، سرزمین مصر جس طرح زمیندار کے لئے جنت ہے جس میں وہ عیش و مسرت کی زندگی بسر کر رہا ہے، اسی طرح وہاں کے کسان کے لئے دوزخ ہے جہاں افلاس و بیماری کے سوا کچھ نہیں"

اصلاحات کی ضرورت | سیاح کہتا ہے کہ میرے ایک دوست نے جو قبطی ڈاکٹر ہے بتایا کہ ملیریا سے ایک لاکھ جانیں تلف ہوتی ہیں" اسی نے یہ بھی کہا" پاشا، زمیندار قسم کے لوگوں نے مصر کی ترقی روک رکھی ہے، اس کے پاس دولت ہے اور جس طرح آپ نے دیکھا عیش و عشرت میں پڑے ہیں" اس قبطی ڈاکٹر کے سے خیالات و احساسات دوسرے مسلمانوں کے بھی ہیں۔ سیاح نے یہاں زرعی اصلاحات پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ترقی کی راہیں بہت سی ہیں نئی نئی پیداوار کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہے، بیس لاکھ ایکڑ زمین کو قابلِ کاشت بنایا جاسکتا ہے اور یہ حصہ ان کو دیا جائے جن کے پاس زمین نہیں ہے اسی طرح یہ قانون ہو کہ کسی کے پاس سو ایکڑ زمین سے زیادہ نہ ہو جس کے پاس ہو اس پر ٹیکس کافی رکھ دیا جائے کہ وہ خود انکار کر دے اور زمین دینے پر مجبور ہو جائے، کسان چونکہ زمین کا مالک نہیں ہے اس لئے وہ جیسی محنت چاہئے نہیں کرتا، ملکیت حاصل ہونے کے بعد ضروری طور پر اس کی محنت میں اضافہ ہوگا اور آمدنی بڑھے گی۔

احمد حسین | احمد حسین جو سماجی اصلاح کمیٹی کا انچارج ہے اس کی تعریف کی ہے اور بتایا ہے وہ بڑا مستعد اور محنتی ہے اس نے بتایا کام کی ابتدا کر دی گئی ہے اسکولوں میں پانچ لاکھ بچوں کو دن کا کھانا مفت دیا جاتا ہے، گھریلو دستکاریاں بھی پھیلائی جا رہی ہیں۔ اصلاحات کے قانون کا مسودہ تیار ہو چکا ہے اور وزارت نے منظور بھی کر لیا ہے، کام ہو رہا ہے، سیاح کا بیان ہے کہ اخیر میں ڈاکٹر حسین نے کہا "زمیندار یا تو سوا ایکڑ زمین کی آمدنی پر قناعت کریں گے، یا پھر چند روز اور عیش منالیں اور اس کے بعد اپنا سر قلم کرائیں۔"

بغداد کے حالات | بغداد، عراق کا مرکز ہے، یہ وہ شہر ہے جہاں مسلمانوں کی حکومت کے جاہ و جلال تاریخ میں محفوظ ہیں، عباسی حکومت کا مرکز یہی شہر تھا، ہارون رشید جو معروف و مقبول خلیفہ گزرا ہے، یہیں حکومت کرتا تھا، اس وقت یہاں کی کاشت دنیا میں ممتاز تھی۔ پرانے زمانہ کا عراق واقعی "نہروں سے چمکتا اور غلّے کے انباروں سے معمور رہتا تھا" جب کہ آج کے مقابلہ میں تین گنی پیداوار زیادہ تھی، ہارون رشید کے زمانہ میں بغداد کی آبادی بیس لاکھ تھی، سر مارکس سائکس بغداد کا حال لکھتا ہے۔

خلافت عباسی کے وقت میں | "شہنشاہی دربار شائستہ، شاندار اور بے حد متمول تھا، چاروں طرف شہر آباد تھا، اور بیچ میں قلعہ تھا، جہاں سے نظم و نسق کے احکام جاری ہوتے رہتے تھے، ہر چیز کا محکمہ جدا تھا، اور دفتروں کی باقاعدگی اس وقت کی دنیا میں بے مثال تھی، شہر بغداد سب سے بڑی تجارتی منڈی تھا، تعلیم گاہوں کا شمار مشکل تھا جہاں دنیا بھر کے طلبہ۔ شاعر، فلسفی اور علماء آتے اور کسب علم کرتے تھے۔ دار الخلافہ کی طرح صوبائی مستقروں میں بھی عالیشان سرکاری عمارتیں تھیں، پوری مملکت میں ڈاک کا انتظام مکمل تھا فوج وفادار، بہادر اور قاعدہ کی پابند تھی۔ گورنر اور وزراء متدین اور بردبار ہوتے تھے، عباسی مملکت صقلیہ سے عدن تک اور مصر سے وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی اس وسیع مملکت میں نظم و نسق یکساں طور پر مضبوط تھا سرکاری عہدوں پر عیسائی یہودی، مسلم۔ اور بے دین سبھی فائز ہوتے تھے اس حکومت کے زمانہ میں جھوٹے پیغمبر، باغی جرنیل، اور غاصب عمّال یکسر مفقود ہو گئے تھے، تجارت کی وسعت اور دولت کی فراوانی نے قحط اور بغاوت کو دیس سے نکال دیا تھا وباؤ اور امراض کی روک تھام کے لئے سرکاری اسپتال اور شاہی معالج تھے۔"

اسلامی تعلیمات کا اثر | سیاح اس حوالہ کو نقل کرنے کے بعد رقمطراز ہے

"عباسی خلافت کے دور میں علم وفن اور فلسفہ ومذہب اگرچہ پھلا پھولا، تو وہ مسلمانوں کی حکمرانی کے اندر، باقی دنیا میں ان چیزوں کا وجود نہ تھا ---- ایچ، جی، ویلس لکھتا ہے سائنسی طریقوں کو اپنانے اور استعمال کرنے میں یونان کو اگر باپ کا درجہ حاصل تھا تو عربوں کو منہ بولا باپ کہنا چاہیے، جدید زمانہ کو علم کی روشنی، لاطینی کے ذریعہ سے نہیں، عربوں کے توسل سے ملی ہے۔" ---- سیاح کہتا ہے

"صدیوں کے خوابیدہ عرب دماغ کو اسلامی تعلیمات سے مہمیز ملی، اور عرب بیدار اور متجسس ہو کر دنیا میں سب سے زیادہ تخلیقی دماغ ثابت ہوا، عرب ماہرین ریاضی نے ہم کو صفر اور الجبرا دیا، علم مثلث میں قابل قدر اضافے کئے، علم ہیئت کو نہایت بلند کر دیا، اور زبردست طبیب اور سرجن پیدا کئے، صدیاں گذر جانے کے بعد ان کا علم خواص الادویہ آج بھی ناقص نہیں کہا جا سکتا، عربوں نے چینیوں سے کاغذ بنانا سیکھ کر علم وادب کی زبردست خدمت کی، اور یورپ کے لوگوں کو کاغذ بنانا سکھا کر موجودہ ترقی کی بنا ڈالی، جس وقت یورپ کے لوگ جہالت کی تاریکی اور بدنظمی کے گڑھے میں پڑے تھے، عرب لوگ اس وقت ساری دنیا کی ذہنی رہنمائی کا منصب ادا کر رہے تھے اور چار سو برس تک کرتے رہے۔" ---- اس کے بعد امریکن سیاح ایک عراقی ماہر تعلیم کا قول نقل کرتا ہے کہ اس نے کہا،

"یورپ کا نشاۃ الثانیہ مسلمان عربوں نے شروع کیا، افلاطون، ارسطو اور اقلیدس ہم نے یورپ کو دئیے ہیں ہم نے ان کو ریاضی، طب، ہیئت، اور دوسرے علم مکمل کر کے دئے۔ اور یورپ کو ایک متمدن براعظم بنا دیا۔

عہد نبوی کی سی حرکت کی ضرورت | سیاح موصوف اس قول کو نقل کر کے کہتا ہے کہ عراقی نے زہی بات کہی جس کا یورپ کے مورخوں کو اعتراف ہے، مگر اس کے بیان میں بڑا زور تھا۔" بلاشبہ یورپ عرب کلچر کا مرہون منت ہے۔" ---- اسلامی ملکوں کی سیاحت میں میں نے یہ بار بار سنا، پھر سیاح لکھتا ہے

"ہو سکتا ہے یہ لوگ عرب شہنشاہی کے کارناموں کو دُہرا کر پرانی عظمت وشان کو دوبارہ حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہے ہوں عراقیوں کو ایسے خوابوں کی صحیح اور حسب مراد تعبیر نکلنے کی مخالفت نہ تو علم الہیات کرتا ہے اور نہ تاریخی دلائل سے ہوتی ہے، لیکن ضرورت اس بات کی ہوگی، کہ عرب دنیا عہد نبوی کی طرح ایک بار پھر حرکت

میں آجائے، اور اسی طرح مستحکم بھی ہو جائے، عرب قوم نے جس اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں اور قوتوں کا ثبوت اس زمانے میں دیا، وہ صلاحیتیں اور قوتیں عرب دماغ میں آج بھی ہونی چاہئیں، آج عرب دنیا سوئی ہوئی ہے اسے کسی محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ضرورت ہے، جو اسے نیا الہام دے کر حرکت میں لے آئے۔"

عراق کا جذبۂ عمل| سیاح اس کے بعد اختصار سے عراق کی سیاسی حالت پر روشنی ڈال کر کہتا ہے کہ عراق میں جد و جہد کا جذبہ سب سے زیادہ ہے وہ چاہتا ہے کہ ترقی کی شاہراہ پر جلد آجائے، چنانچہ "ان کا ایک پاؤں پرانی دنیا میں ہے اور دوسرا نئی دنیا میں" اور اسی کا نتیجہ ہے پچھلے چھبیس برس میں عراق کی حکومت باون مرتبہ تبدیل ہوئی ہے۔

عراق میں پہلے زمینداری نظام نہ تھا، اگر ترک کے پنجوں سے آزادی کے وقت زمین کی ملکیت حکومت کو دے دی جاتی، تو یہ موجودہ صورت حال پیدا نہ ہوتی، مگر غلطی یہ ہوئی کہ قبیلے کے شیخ کا حق تسلیم کر لیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زمینداری کا پھیلاؤ بڑھ گیا، اور اس کا ناگزیر نتیجہ یہ نکلا کہ کسان فاقہ کشی میں مبتلا ہو گئے —— پھر سیاح کہتا ہے

"صدیوں کے جمود و تعطل کے باوجود احیائے ثانی کا جتنا روشن مستقبل عراق کا ہے، کسی اسلامی ملک کا نہیں، شرط یہ ہے کہ عراقی اس کام کے لئے دل و جان سے مستعد ہو جاتے ..... عراق کے پاس دو نیل ہیں دجلہ فرات، عراق میں ..... نہ بارش کی کمی ہے نہ آبادی کا اتنا دباؤ ہے۔ عراق کی آبادی مصر کے مقابلہ میں ایک چوتھائی ہے، اور قابل کاشت زمین مصر سے چوگنی ہے، اس کے علاوہ عراق کے پاس تیل کے چشمے بھی ہیں ..... دن بھر کام کرنے کے بعد عراقی مزدور پژمردہ و مضمحل نہیں ہو جاتا ..... اس میں اگر سستی ہے تو ناکافی تغذیہ کا نتیجہ ہے۔"

عراق میں غلہ اور کھجور| عراق کی پیداوار کے متعلق بیان کرتا ہے، کہ اہم پیداوار غلہ ہے، "غلہ کے علاوہ اس کے پاس کافی کھجوریں جو دنیا بھر میں مشہور ہیں، عراق میں کھجوروں کی گنتی تین کروڑ ہے ۴۸ء میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار ٹن کھجور برآمد ہوئی تھی۔"

یہاں کی ترقی کے متعلق رقمطراز ہے "ترکی حکمرانی کے مقابلے میں عراقی حکومت نے زراعت میں نمایاں ترقی کی ہے، آب پاشی چوگنی ہو گئی ہے، کہیں کہیں کاشت میں مشینوں کا استعمال بھی ہونے لگا ہے .....

افسوس ہے زرعی قانون میں اصلاحات کا اس نے زریں موقع کھودیا، اور زمیندار بالادست ہیں، عراق میں کاشت بٹائی پر ہوتی ہے اکثر حالتوں میں کسان کو تیس فیصدی ورنہ چالیس فی صدی غلہ ملتا ہے، اس میں سے اسے بہتری ٹیکس وغیرہ بھی دینا پڑتا ہے۔

عراق کی زبوں حالی | عراق کے کسانوں کی زبوں حالی پر لکھتا ہے

"عراقی کسان کا افلاس جلی حروف میں لکھا ہے، اوسط اموات مصر کی طرح یہاں بھی زیادہ ہے، ۱۹۳۶ء میں ۲۷ فی ہزار تھی، بچوں کی موت کا اوسط بھی ڈراونا ہے ۱۹۴۱ء میں ۲۲۷ فی ہزار تھا، ہر سال سات آٹھ لاکھ انسان ملیریا کا شکار ہوتے ہیں عراق میں بھی وہی بیماریاں عام ہیں جو مصر میں ہیں، بغداد میں اندھوں کی گنتی ساڑھے سات ہزار ہے، اور اوسط زندگی چھبیس سال ہے ... پینتالیس لاکھ کی مردم شماری میں پینتیس لاکھ فلاحین (کسان) کی تعداد ہے، زمین سے نہ فلاح کو محبت ہے، نہ زمیندار کو زمیندار چاہے تو فلاح کو ایک جگہ سے ہٹاکر دوسری زمین پر بھیج دیتا ہے، اور فلاح بھی بہتر آراضی پاتا ہے تو پرانی کو چھوڑ دیتا ہے۔

سیاح یہاں پہنچ کر کہتا ہے

"عراق سے بہتر چراگاہیں دنیا میں کہیں نہیں ہیں مگر مویشی کا اوسط عراق میں بہت کم ہے، قوت پیداوار کے لحاظ سے عراق سب سے زیادہ دولت مند ملک ہو سکتا ہے، مگر سب سے زیادہ مفلس ہے ... عراق کا زمیندار سب جگہ کے زمینداروں سے زیادہ نا جوہر درصندی ہے" ——— سیاح نیچے کی سطر لکھ کر عراق کی بحث ختم کردیتا ہے

"عراقی لوگ عرب بھی ہیں اور مسلم بھی، مگر محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے یہ الفاظ بھلا چکے ہیں کہ "میں نے تمہیں زمین دے کر برکت دی ہے، کھاؤ اور پیو اور ضائع مت کرو"

ایران، مصر اور عراق کے متعلق امریکن سیاح کا آپ نے تاثر معلوم کرلیا، نگار سالنامہ کے ۵۷ صفحات میں یہ اردو ترجمہ شائع ہوا، جس کا یہ اختصار اور خلاصہ میں نے آپ کی خدمت میں پیش کیا، عراق کی بحث ختم کرکے مصنف نے فلسطین اور اسرائیلی حکومت کے حالات قلم بند کئے ہیں اور ۶۷ صفحہ سے لے کر صفحہ ۱۰۴ تک مسلسل اسرائیلی حکومت کا ذکر ہے۔

یہودی شہر تل عفیف | سیاح کا بیان ہے کہ اسلامی ملکوں کا چھ ماہ سفر کرنے کے بعد فلسطین آیا، یہاں کے ہوائی اڈے سے کار پر بیٹھا اور "تل عفیف" پہنچا۔

اس تل عفیف شہر کو زندگی کے ہنگاموں سے معمور پایا، مصر وغیرہ کی طرح فقیروں اور گداگروں کی بھیڑ نہ تھی، اونٹ اور گدھوں کے قافلے بھی مفقود تھے، بلکہ بازار میں بڑی چہل پہل اور موٹروں اور ٹرک کی قطاریں ہیں، مشین نے یہاں انسانوں کی محنت کو کم کر دیا ہے شہر میں نل کا پانی رواں ہے، اسلامی ملکوں کی طرح پانی ابال کر پینے کی زحمت نہ اٹھانی پڑی تل عفیف کو آباد کر کے یہودی نے فطرت کے ساتھ محبت کا ثبوت دیا ہے۔

یہودی ملک کی ترقی | پوری دنیا میں یہی ایک شہر ہے جسے یہودیوں نے آباد کیا ہے اور ان کی ہی حکمرانی ہے یہاں کی سرکاری زبان عبرانی ہے، خوف وہراس کا نام ونشان تک نہیں، اس شہر کی بنیاد ۱۹۰۸ء میں ساٹھ یہودیوں نے ڈالی، پھر یہ تین سو کی تعداد میں پہنچے ۱۹۱۸ء میں یہ تعداد اٹھارہ سو ہو گئی، ۱۹۲۵ء میں بارہ ہزار ۱۹۳۶ء میں ایک لاکھ بیس ہزار اور آج دو لاکھ کی تعداد ہے۔

علم وعمل کا مرکز | سیاح کا بیان ہے یہاں سوائے بوڑھی عورتوں کے کوئی بے پڑھا لکھا نہیں ہے "۱۹۵۰ء میں جب بجٹ ایک کروڑ ڈالر تھا اس میں سے تیس لاکھ ڈالر تعلیم پر خرچ کئے، بچوں کی تعلیم وتربیت پر بڑی توجہ ہے، نشر واشاعت اعلیٰ پیمانہ پر ہے دو لاکھ کی آبادی میں بارہ روزانہ اخبار نکلتے ہیں، کتب فروشوں کی دکانیں بہ کثرت ہیں، صرف دوسرے ملکوں سے پانچ لاکھ ڈالر کی کتابیں درآمد کی جاتی ہیں، اس طرح تین لاکھ ڈالر سالانہ کے اخبار، رسالے دوسرے ملکوں سے آتے ہیں، شہر میں پانچ بڑی لائبریریاں ہیں"

یہاں شہر میں اظہار خیال کی کامل آزادی ہے، ہر پندرھویں دن ایک ادبی اجتماع ہوتا ہے، یہاں کے لوگ خوش پوشاک ہیں، غریب کا پتہ نہیں چلتا، اتنا متحرک شہر ہے کہ دو لاکھ کی آبادی پانچ لاکھ معلوم ہوتی ہے، کوئی شخص نکما اور بے کار نہیں، پورے مشرق وسطیٰ میں یہی تل عفیف ایک شہر ہے جہاں چودہ سال سے کم عمر بچوں سے کام لینا جرم ہے یہ اب ہیرا تراشی کا مرکز بن گیا ہے ۱۹۴۶ء میں اس کی ہیرے کی برآمد سوا دو کروڑ ڈالر کے قریب تھی، سیاح ایک جرمن کا قول نقل کرتا ہے اور کہتا ہے ان میں سمجھنے

کے لئے بہت کچھ ہے، جرمن یہودی نے دوران گفتگو میں کہا

"ہم نے اگر ریگستان پر فتح پاکر اسے باغوں سے ڈھک دیا ہے تو ایک دن ہم عربوں سے معاملہ کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔"

ایک یہودی گاؤں | اس کے بعد سیاح عزات برنیر گاؤں کی بڑی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے یہاں امداد باہمی کے طور پر کاشت ہوتی ہے، جو معجزہ معلوم ہوتی ہے اور اس طرح اور بھی بہت سے گاؤں ہیں مگر یہ سب میں ممتاز ہے، یہاں کی آبادی بارہ سو پچاس ہے، چھ سو پچاس بچے ہیں اور چھ سو مرد و عورت، اکثر اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں

اشتراک عمل اور اس کا نتیجہ | غوا ط ۱۹۳۳ء میں آباد کیا گیا، آج کل چھ سو کاشتکار یہاں نو سو ایکڑ زمین کاشت کرتے ہیں ان کے مکانات بہت پاکیزہ ہیں ان کے کھیت بھی ایسے نظر آتے کہ کہیں بھی جنگلی گھاس کا پتہ نہیں، پینتالیس ایکڑ زمین پر صرف باغ ہی باغ ہے جن میں سیب، نارنگی، انگور، لیمو اور دوسرے عمدہ پھل لگے ہیں بعض چیزوں کی چار چار فصلیں اتارتے ہیں۔

"پورے رقبہ میں ڈھائی سو ایکڑ زمین نہری ہے باقی بارانی پر غلہ بویا جاتا ہے، بہتر ایکڑ زمین پر چارہ کی غرض سے مکئی اور سورج مکھی کی کاشت کی جاتی ہے جس کی بیج سے کھانے کا تیل بھی نکل آتا ہے، مزید بیس ایکڑ ترکاریوں کے لئے وقف ہے، اور تین فصلیں اترتی ہیں..... ساتھ ہی پھولوں کی بھی کاشت ہوتی ہے..... باغات کے علاوہ ایک بڑا رقبہ تاکستان کا ہے..... ڈیڑھ سو سے اوپر مویشی تھے..... دودھ کا سالانہ اوسط فی گائے ننانوے ہزار پونڈ تھا، دودھ بھی مشین سے دوہا جاتا ہے..... ایک برف خانہ بھی کھول رکھا ہے..... ایک ورکشاپ بھی قایم کرلیا ہے جو صرف مرمت اور پرزے ہی بنانے کا کام نہیں کرتی بلکہ پوری مشین بنالیتی ہے.....

. لوہے کی ڈھلائی کا کارخانہ بھی چل رہا ہے ایک فیکٹری فرنیچر اور دوسرے لکڑی کے کام کے لئے جاری ہے، اور ایک حشرات الارض مارنے والی دوائیں طیار کرتی ہے مشین ہی سے کپڑے دھلتے، روئی بکتی، کپڑے سلتے اور جوتوں کی مرمت ہوتی ہے، عمارتیں بنانے والا ادارہ الگ قایم ہے، پہاڑی کی چوٹی پر..... ایک تفریح گاہ بھی ہے جہاں ایک سو تیس آدمی ٹھہر سکتے ہیں، پھلوں کو محفوظ کرنے کی ایک اور فیکٹری چل رہی ہے..... مزدوروں کا بیکار وقت گھریلو دستکاریوں میں صرف ہوتا ہے۔"

ایک یہودی گاؤں کی آمدنی اور اس کا طریقہ | سیاح کہتا ہے کہ میں نے گاؤں کے سکریٹری سے پوچھا گذشتہ سال پورے گاؤں کی کیا آمدنی تھی تو اس نے جواب دیا۔

"۱۹۴۷ء میں ہماری کل آمدنی چار لاکھ پونڈ تھی، اس میں ایک لاکھ کاشت کا منافع تھا اور تین لاکھ گھریلو انڈسٹری کا۔"

سیاح حساب کر کے بتاتا ہے کہ ہر کام کرنے والے آدمی نے دو ہزار چھ سو امریکن ڈالر کمائے، سیاح کا بیان ہے کہ میں نے سوال کیا ہر آدمی کو نقد کیا ملتا ہے، اس نے کہا، کچھ نہیں، یا برائے نام۔ سیاح رقمطراز ہے میں نے پوچھا "فرض کرو وہ کوئی کتاب خریدنا چاہتا ہے؟"

اس نے جواب دیا "کتاب کے لئے لائبریرین کو اطلاع دے دے گا کتاب آجائے گی۔"

میں نے پوچھا "اچھا اگر کوئی نوجوان چاہتا ہے کہ اپنی کسی دوست لڑکی کو تفریح کرانے لے جائے؟

جواب ملا کہ "اس صورت میں وہ خزانچی کے پاس جائے گا اور اسے مناسب رقم مل جائے گی؟

اس کے بعد سیاح نے بتایا ہے کہ ہر میاں بیوی کے لئے ایک عمدہ آرام دہ کمرہ ملا ہوا ہے، باقی کھانا تو اس کے لئے انتظام یہ ہے کہ سارے گاؤں کا کھانا ایک جگہ پکتا ہے اور ایک ہی جگہ کھایا جاتا ہے، بچوں کے لئے الگ انتظام ہے، جو بچوں کا گاؤں کہا جاتا ہے، تمام بچے اسی گاؤں میں رہتے ہیں البتہ شام کو والدین سے مل سکتے ہیں، چھٹی کے دنوں میں بھی والدین کے ساتھ رہ سکتے ہیں ــــ طریقہ یہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد چھ ہفتہ اس کی ماں زچہ اسپتال میں رہتی ہے، چھ مہینہ اس کی ماں سے آدھے دن کام لیا جاتا ہے اور چھ ماہ بعد بچہ "بچوں کے گاؤں" میں پہنچا دیا جاتا ہے وہاں اس کے لئے سارا انتظام ہے، غواط میں بچوں کا اوسط اموات تمام دنیا سے کم ہے یعنی چھبیس ۲۶ فی ہزار۔ یہاں طبی انتظام خود اپنا ہے،

غواط میں اٹھارہ سال کی عمر تک تعلیم لازمی ہے، چودہ برس کے بعد ان سے تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ فیکٹری اور کھیت کا بھی کام لیا جاتا ہے

اس انتظام پر اظہار اطمینان | غواط کے اس جدید نظام کے متعلق اس کے سکریٹری کا بیان ہے

"یہ نظام ہماری زندگی کی ساری سہولتیں فراہم کر دیتا ہے، ہمارا مستقبل محفوظ اور یقینی ہے، رہنے کو مکان ہے، کھانے کو ہر چیز ہے پہننے کو کپڑے ہیں، اور جوتا، بچوں کی تربیت تعلیم اور معالجے کی ہمیں فکر نہیں، اور بے روزگاری

کا اندیشہ نہیں، اور چونکہ ہمارے کاندھوں سے سار بوجھ اتار لیا ہے، ہمارے پاس کلچری مشاغل کے لئے بھی وقت رہتا ہے"

اشتراکی عمل کی برکت | اس عواط میں ایک لائبریری ہے، جس میں بیس ہزار کتابیں ہیں، عمارت جو لائبریری کے لئے ہے دسیع ہے صرف مطالعہ کے لئے چھ کمرے ہیں جن میں اخبارات ورسائل رکھے رہتے ہیں، ایک ہال ہے جس میں چھ سو آدمی بیٹھ سکتے ہیں، اس میں ایک اسٹیج بھی بنا ہوا ہے گویا یہ گاؤں دیہات کا دیہات ہے اور شہر کا شہر، عواط کے ایک بوڑھے کا بیان سنئے،

"میں اگر دو چار ایکڑ زمین بھی طور پر کاشت کرتا تو مجھے ڈراما دیکھنے یا آرکیسٹرا سننے تل عفیف جانا پڑتا مگر چونکہ میں مشترک سماج اور زراعت کا ممبر ہوں، ڈراما کمپنی اور آرکیسٹرا میرے یہاں چلے آتے ہیں"

سیاح کہتا ہے کہ "عواط سے تل عفیف پلٹتے ہوئے میں سوچتا رہا کہ مصر وایران اس اسکیم پر عمل کر کے کس قدر نفع اٹھا سکتے ہیں؟ ان ملکوں کا کسان اشتراکی محنت پسند نہ کرے گا مگر اسے اس کی کتنی شدید ضرورت ہے، مویشی کی نسل سدھارنے کی ضرورت ہے، اچھے بیجوں کے انتظام کی ضرورت ہے، کھیتی اور انسانوں کی بیماری سے جنگ کرنے کی ضرورت ہے، تعلیم پھیلانے کی ضرورت ہے گھریلو دستکاریوں کے نفع کا پورا احساس کرنے کی　ضرورت ہے" ——— اس کے بعد سیاح نے ایک باب اور باندھا ہے اور اس میں یہودی مملکت کی تعریف کی ہے، بتایا ہے کہ ان لوگوں نے کس طرح دلدل کو خشک کر کے ملیریا کا خاتمہ کر دیا، اور کاشت کے لائق زمین بھی پیدا کر لی ۱۹۳۰ء میں بائیس فی صدی ملیریا آبادی کو متاثر کرتا تھا۔ مگر ۱۹۴۶ء میں دو فیصدی اثر رہ گیا، نارنگی کی کاشت میں یہودی نے ترقی کی، پانی کا انتظام کیا، شہد کے چھتے پال کر ساڑھے بارہ لاکھ پونڈ شہد پیدا کیا، مچھلی کے شکار کا انتظام کیا، پھر ایک اور باب میں تل عفیف کی ٹریڈ یونین کا شاندار تذکرہ کیا ہے اور اس کے کارنامے کو بتلایا ہے اور اس کی تفصیل بیان کی ہے، کوئی شبہ نہیں ان کا یہ کارنامہ پڑھ کر زبان پر کلماتِ تحسین آجاتے ہیں۔

مشرق وسطیٰ کی بدحالی | سولھواں باب اس سفرنامہ کا آخری باب ہے اس میں سیاح نے لکھا ہے کہ سیر و تفریح اور سیاحت سے واپس سوئٹزرلینڈ پہنچا۔ اور جنیوا میں اپنی یادداشت نکالی اور سیاحت کے زمانہ کی

خریدی ہوئی اور دوسری کتابیں سامنے رکھیں اور غور کرنے لگا وہ اس باب میں پہلے عیسائی مصنفین کی کتابوں کے اقتباسات نقل کرتا ہے، پھر اپنی یادداشت کی خاص باتیں، سیاح ایک مصنف کی کتاب "مشرق وسطی کی آراضی اور افلاس" سے یہ اقتباس پیش کرتا ہے۔

"فاقوں سے واسطہ، اموات میں زیادتی، زمین کی بربادی، اقتصادی لوٹ کھسوٹ، یہ ہے مشرق وسطی کی دیہاتی زندگی کا خاکہ یورپ بھر میں اس شدید افلاس کی مثال کہ صاف پانی بھی میسر نہ آتا ہو، کبھی اور کہیں نہیں ملتی ایک انسان اس گندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا، جو ایک ہی مکان میں انسان اور مویشی کے ساتھ رہنے سے پیدا ہوسکتی ہے۔

تباہی اور توجہ کی ضرورت | پھر اس نے اسے صحیح تسلیم کیا ہے اور بتایا ہے کہ ذراسی زندگی پیدا ہوجانے اور حکومت کی توجہ سے یہ دن بدلے جاسکتے ہیں۔ پھر یہ المناک منظر دیکھنے میں نہ آئے گا کہ بیس لاکھ بھیڑیں ہر سال مرجائیں، حشرات الارض کھیتی کا تقریباً تین کروڑ ڈالر نقصان کریں ملیریا انسانی زندگی پر حملہ آور ہو، اور مصر کی تین چوتھائی آبادی جو دیہات میں رہتی ہے آنکھوں کی بیماری اور خارش و داد کا شکار بنے،

آخر یہ کیا غضب ہے کہ شام کی تیس لاکھ آبادی میں دو تہائی کاشت کرے اور قابل کاشت زمین کے ساٹھ فی صدی حصہ پر ان زمینداروں کا قبضہ ہو جو جھانک کر بھی نہ دیکھیں کہ کاشت اور زمین کس حال میں ہے، شام میں ساڑھے بارہ لاکھ ایکڑ پر کاشت ہوسکتی ہے مگر ابھی کاشت میں صرف اس کا تیسرا حصہ ہے عراق میں پنتالیس لاکھ انسان بستے ہیں، مگر زمین جو زیر کاشت ہے وہ صرف بیس فی صدی، گو برطانوی سائنسدانوں نے یہاں کاشت کو ترقی دی ہے مگر ثبائی پر جو کاشت ہو وہ کیا ترقی کرسکتی ہے

عرب کی صحت پر فاقہ کا اثر | ۱۹۴۸ء کے فلسطینی معرکے میں عرب سپاہی بہترین اسلحہ کے باوجود نکمے ثابت ہوئے اور یہود کے مقابلے میں پسپا ہوگئے اس کے سوا اور کیا وجہ ہے کہ ان ملکوں میں صحت غایب ہے، اور یہ انسانوں کی بیشتر ادنی مسرت سے بھی محروم ہے، ان ملکوں کے کسان کاشتکار نہیں، کھیت مزدور ہیں جان برائٹ نے سو سال پہلے لکھا تھا۔

"قانون جب اپنا فرض ادا کرنے سے انکار کردے حکومت جب عوام کے حقوق ادا کرنے میں قاصر رہے، زمیندار جب آراضی کے چھوٹے ٹکڑوں پر کاشتکاروں میں ضد اور مقابلہ پیدا کرا کے نفع اٹھائے، وہاں لوگ قانون سے سرگردانی

کرنے لگتے ہیں، تہذیب وتمدن کے اصول ترک ہو جاتے ہیں اور فطری بلکہ انتقامی قانون کام کرنے لگتا ہے۔

زمانے کی رفتار سے چشم پوشی موت کے مرادف ہے

سیاح کہتا ہے کہ اسباب پر ہر جماعت اپنے نقطۂ نظر سے بحث کرتی ہے مگر مجھے اتفاق انھیں لوگوں سے جو کہتے ہیں "اگر زمین کی گھٹتی ہوئی طاقت کا علاج نہیں کیا گیا، تو انسان کے مقدر پر مہر لگی سمجھو ——— پھر سیاح ایک تمہید کے بعد اخیر میں لکھتا ہے۔

"باایں ہمہ سیاست داں اور مدبّر روسی حملے کے خلاف جدو جہد کر رہے ہیں، کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کی تدبیروں میں لگے ہیں۔ ایشیا وافریقہ پر دماغ سوزی کر رہے ہیں تیل اور ہوائی اڈوں کے جھگڑوں میں پھنسے ہوتے ہیں، فوجی ماہر جنگ کے نقشوں پر جھکے ہوئے ہیں، طبقات الارض کے ماہر اور انجنیر اور بینکر اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں تیل کے ذخیروں کا حساب لگا رہے ہیں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن ایک غریب فلاح (کسان) ہے جسے کوئی نہیں پوچھتا، گویا اس کا کوئی وجود ہی نہیں، حالانکہ یہ اٹھارہویں، انیسویں صدی نہیں، بیسویں صدی ہے ہوا بازی اور ایٹمی توانائی کی صدی ہے، ہوائی جہاز نہیں، پرواز خیال کی صدی ہے؟ بغاوت کے خیالات کے پرواز کی صدی ہے، وہ نہیں دیکھتے کہ دنیا کا کسان کسمسانے لگا ہے، حرکت میں آرہا ہے وہ کارل مارکس کی زبان تو نہیں سمجھتا۔ لیکن اس سے آراضی کی بات کی جائے، تو فوراً سمجھ لیتا ہے، اس کو اگر کوئی صحیح حل نہیں بتایا گیا تو غلط حل قبول کرے گا وہ ہر اس آدمی کی بات مان لے گا، جو زمین دینے کا وعدہ کرے، کیونکہ زمین اس کی جان ہے اگر اس کی مدد کرنے کو طاقتیں کھڑی نہیں ہوتیں ...... تو کمیونزم کی فتح یقینی ہے، کل جو روس میں ہوا، آج جو چین میں ہوا ہے، وہی کل مشرق وسطیٰ اور دوسرے ملکوں میں ہوگا ...... دمشق، بیروت، بغداد، مکہ، طہران، قاہرہ اور ان کے ساتھ لندن و واشنگٹن بھی ایک پیغمبر کے انتظار میں ہے جو سماجی مقصد و اصلاح کا جھنڈا لئے ہوئے عیسیٰ علیہ السلام کی طرح کاشتکار کو صرف یہ کہہ کر ہوش میں لائے کہ

"جاگ! جاگ!! اور طاقت کا مظاہرہ کر!"

قدیم اسلامی درسگاہوں کے نصاب کی اصلاح کے متعلق چند بنیادی باتیں

(جناب مولوی محمد عبد السلام صاحب رام پوری)

اسلام زندگی اور اس سے تعلق رکھنے والے تمام مسائل کو چند سادے اور بنیادی عقیدوں کی روشنی میں دیکھتا ہے اور ان کے تحت ہی ان کی قدریں متعین کرتا ہے۔ مسلمان طرح طرح کے ظروف و حالات سے دو چار ہوتے رہے کہیں ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی تو کہیں ہم آہنگ بنانے کی تاہم ان کا اندازِ فکر ہر جگہ، ہر زمانے میں اور ہر حال میں یکساں اور منفرد رہا۔ اس طرح ان میں ایسی ملیت کی بنیاد پڑ گئی جو زمان و مکان اور نسل و قوم کے تعصبات سے پاک تھی، مسلمانوں نے اپنی اس ملی انفرادیت کو قایم رکھنے کے لئے جو جو شعوری یا غیر شعوری کوششیں کی ہیں ان کے ذکر کا یہ موقع نہیں پھر بھی ان کی اس کوشش کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ انھوں نے اپنے ہر قسم کے اداروں کو اپنی انفرادیت کا مظہر بنا کر ہی چھوڑا۔ زندگی کے جائز اور ضروری تقاضوں کو نظر انداز کرنے کے بجائے ان کو اپنے رنگ میں پورا کرنے کی کوشش کی اس طرح ماحول سے بے آہنگ بھی نہ ہوئے اور ملی انفرادیت بھی قایم رہی۔ انھوں نے دوسروں کو جذب کیا لیکن خود کسی میں جذب نہ ہوئے، مسلمانوں کا یہ ملی شعور ان کے تمام اداروں پر برابر چھایا رہا۔

امتِ اسلامیہ کا ادارۂ تعلیم ان کے ملی شعور کا سب سے اہم مظہر رہا ہے۔ یہ ادارہ اگر ایک طرف اس کے مذہبی تصورات اور عقاید سے سب سے زیادہ متاثر تھا تو دوسری طرف اس کی قومی تشکیل میں سب سے بڑی اثر انداز حیثیت رکھتا تھا۔ اس ادارے کا مقصد افراد کو ان کے ذوق و استعداد کے مطابق زندگی کی گوناگوں وسعتوں کے لئے تیار کرنا اور ترقی پذیر گرد و پیش کو اپنے رنگ میں رنگین بنانے کی استعداد پیدا کرنا

تھا۔ مسلمانوں کی درسگاہیں ہر قسم کے علوم و فنون کا مرکز رہیں۔ علوم میں اپنے اور بیگانے کا امتیاز نہ تھا۔ یہ درسگاہیں حکومت کے ساتھ اور حکومت کے بغیر دونوں طرح پھلتی رہیں اور اس طرح مسلمانوں کا تعلیمی ادارہ مسلمانوں کی ملّی زندگی کے جزو لاینفک کی حیثیت میں قایم اور برقرار رہا۔

چونکہ مسلمانوں کی ملّی زندگی اور اس ادارے کا چولی دامن کا ساتھ ہے اس لئے جوں جوں ان کی ملّی حیات میں جمود و اضمحلال آتا گیا ان کا ادارۂ تعلیم بھی ویسے ویسے جامد اور مضمحل ہوتا گیا۔ اگر ملوکیت کی پیش قدمیوں، پس پائیوں اور آبادکاریوں اور تباہ کاریوں کی داستان کو ہی مسلمانوں کی مکمل داستان نہ سمجھ لیا جاتے تو درحقیقت چوتھی یا پانچویں صدی سے ہی تاریخ کی اس بڑی اور اثرانداز ملت میں جمود اور اضمحلال پیدا ہونا شروع ہوگیا تھا اور وہ ہمہ جہتی اور متناسب نمو اور ارتقا جو کسی قوم کو ہر طرح کے گرد و پیش میں ترقی پذیر اور متناسب بناتے رکھتا ہے اس کے دھارے خشک ہونا شروع ہو گئے تھے

یہ جمود و اضمحلال کیسے آیا اور کیوں کر آیا اس کی داستان طویل ہے اور ہم میں سے بہتوں کے لئے تلخ بھی لیکن حقیقتوں سے صرفِ نظر بھی کب تک۔ مسلمانوں کا مذہبی اور علمی تنزل بلکہ میرے نزدیک تو ان کا سیاسی اور اقتصادی زوال بھی اسی داستان کا المناک باب ہے میں تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتا تاہم کچھ اشارے بے محل نہ ہوں گے۔

چوتھی یا پانچویں صدی میں بعض عارضی عوامل سے متاثر ہوکر ہمارے فقہا نے فقہی اجتہاد کے دروازے بند کر دئے ممکن ہے کہ وقت کی مصلحتوں کا یہی تقاضہ ہو اور ماحول کی اصلاح کا یہی واحد طریقہ ہو لیکن اس کے اثرات کی دور رسی اور ہمہ گیری کو غالباً یہ بزرگ پوری طرح محسوس نہ کر سکے۔ مسلمانوں کی پوری ملی حرکت کا محور دین تھا۔ دین کے خارجی پہلو یا اس کے معاشرتی رخ سے اجتہاد کو خارج کر کے جمود کو دعوت دینا ایک طرح سے ان کی ملی حیات کو جامد بنا دینا تھا زندگی کے تمام شعبے جامد ہونے شروع ہو گئے علوم و فنون کی حرکتیں سست ہوگئیں، اگلوں کا ضروری احترام بیجا عصبیت میں تبدیل ہوگیا، غلطیاں کر سکنے والے عملاً معصوم بن گئے۔ جدتِ افکار گویا ناپید ہوگئی، اہل علم کی دماغی اپجوں نے فکری جولانیوں کے لئے اس قید و بند میں بھی نئے میدان تلاش کرنے شروع کر دئے جو پچھلوں کے لئے شمعِ راہ ہونے کے بجائے رستے

کے روڑے ثابت ہوئے اس کے مختلف النوع مظاہر کی تفصیل و تفتیش کا یہ موقع نہیں تاہم اس کا تعلیمی اور تصنیفی مظہر سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ جدتِ فکر کی بے راہ روی نے نئی پگڈنڈیاں نکالیں۔ متقدمین کے استنباط کئے ہوئے مسائل چیستاں بنے چیستانوں کے حل دریافت ہوئے اور حلوں کو معمہ کیا گیا۔ اعتراض اور جواب توثیق و تردید اور توجیہ و تعلیل کی تہیں جمتی گئیں۔ اگلوں کی کلیات نے نئے استقراء اور استنباط سے پچھلوں کو بے نیاز کر دیا۔ اس تاریک فضا میں اگر کسی من چلے دماغ نے کوئی جھلک محسوس کی تو معاصرین اور متاخرین کی کج بحثیوں نے اس پر دھندہ پھیلانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ زمانے کو قدامت سے بیر ہے لوگوں نے پچھلوں کی پذیرائی کی اور اگلوں کے کاموں کو کتاب خانوں میں بند کر کے طالبانِ فن سے اجتہادی نمونے بھی چھین لئے اور پچھلوں کی جامد تالیفیں ان کی رہنمائی کے لئے رہ گئیں، ہمارے نصاب کی کتابوں پر نظر ڈال جائیے قریب قریب سب کتابیں مسلمانوں کے عہدِ جمود کی یادگار ہیں، متن، شرح اور حاشیے کا ایک چکر ہے جس میں نہ علم کی انفرادیت قائم ہے، نہ مضمون کی جامعیت، نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کس کس کا کیا کیا حصہ ہے۔ کس کس کی فروگذاشتیں ہیں اور کس کس کی اصلاحیں۔ طرزِ تحریر دیکھئے تو محض کتابی، نہ زندگی سے مربوط نہ مقصد سے چسپاں خود قناعتی جمود، حقیقتوں سے اغماض، اور کج بحثی تو ہمارے مدارس کی گویا خصوصیتیں ہیں۔

علوم و فنون کے جمود نے مسلمانوں کے سب سے اہم قومی ادارے تعلیم کو جامد بنا دیا اور وہ درسگاہیں جو زندگی کی نشو و نما میں سب سے زیادہ قابل قدر حصہ لیتی تھیں زندگی سے دور ہوتی چلی گئیں۔ لیکن یہ دوری بہت دنوں تک محسوس نہ ہو سکی۔ اتفاق سے مشرق میں خود زندگی بہت دنوں تک ساکن اور جامد رہی اور ہماری درسگاہیں اپنے پرانے ڈھرے پر رہتے ہوئے بھی صدیوں تک زندگی کی ہم آہنگی کرتی رہیں۔ مغرب اور مشرق کا تصادم ہوا اور مشرق میں پہلی بار زندگی نئی افکار، نئی اقدار اور نئے تقاضوں کے ساتھ نمودار ہوئی ہماری درسگاہیں نہ وقت کے ان نئے تقاضوں کو پورا کر سکتی تھیں نہ ان نئی فکروں اور نئی قدروں کا مقابلہ کر سکتی تھیں چنانچہ ہماری درسگاہوں کو اپنی ہر جہتی ختم کرنی پڑی اور آہستہ آہستہ اپنے دائرے کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ علوم و فنون میں دینی اور دنیوی کی تقسیم قبول کر کے اپنے

آپ کو دینی علوم کی تعلیم میں محدود کرلیا۔ اس تدبیر سے تقریباً ایک صدی سے زیادہ عرصہ زندگی سے بچتے بچتے گذر گیا۔ لیکن جس طرح زندگی سے الگ کر کے عام علوم وفنون کی تعلیم بہت دنوں تک زندہ نہیں رہ سکتی اسی طرح خالص دینی تعلیم کو بھی زندگی سے بچا کر باقی نہیں رکھا جا سکتا چنانچہ رفتہ رفتہ وہ گوشۂ عافیت بھی تنگ ہونا شروع ہو گیا جس کو ہماری درسگاہیں قلعہ بند سمجھے ہوئے تھیں۔

یہ ہو سکتا ہے بلکہ ہے بھی یہی کہ ماحول اور فضا کافی مسموم ہو چکی ہے لوگوں کو دین سے وہ لگاؤ نہیں ہے جیسا ہونا چاہئے۔ اسلامی مدارس کی تعلیم وتربیت سے بُعد بڑھتا جا رہا ہے دینی عقاید وتصورات میں وہ قوت باقی نہیں رہی ہے جو امتِ مسلمہ کو زندگی کے میدان میں منظم ومنضبط رکھ سکے لیکن اس کی ذمہ داری صرف دوسروں پر ہی نہیں ہے کچھ قصور ہماری درسگاہوں کا بھی ہے۔ ہماری درسگاہوں نے زندگی کو ایک کل کی صورت میں دیکھنا چھوڑ دیا زمانے کی عقل کو ناقابل اعتنا قرار دیا۔ عصری علوم وفنون سے دیدہ ودانستہ اغماض کیا اور اس طرح زندگی سے کٹ گئیں، ہمارے علماء کا فرض تھا کہ وہ حالات کا صحیح جائزہ لیتے اور حقیقی علل واسباب کو دریافت کرتے اور جب مرض متعین ہو جاتا تو صحیح علاج کی طرف متوجہ ہوتے اور طبیب حاذق کی طرح ہر وقت مرض اور علاج کی مطابقت پر نظر رکھتے لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔ برخلاف ازیں انھوں نے محض دوسروں کی کوتاہیوں سے اپنی اور اپنے اداروں کی کمیوں کی تلافی کرنی چاہئے

مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو برقرار رکھنے کے لئے ان کی تعلیم وتربیت کی انفرادیت کو قایم رکھنا ضروری ہے اور یہ بغیر اسلامی درسگاہوں کے ممکن نہیں۔ ہماری آج کی اسلامی درسگاہیں پرانے عربی کے مدرسے ہیں اور یہی ہماری اس ملی حیات کی نمایندگی کر رہے ہیں۔ جس کی شیرازہ بندی مذہب کرتا ہے ان مدرسوں کے علاوہ مسلمانوں کے اور جتنے ادارے ہیں یا قومی اور وطنی زندگی کو پیش کرتے ہیں یا دوسرے عصری محرکات کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ان مدرسوں کا حال یہ ہے کہ ان کا نصاب، طرزِ تعلیم، ان کے اساتذہ کا اندازِ فکر ان کے طلبہ کا اندازِ نظر، سب کے سب زندگی سے دور اور تعمیری قوتوں سے ناآشنا معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے علماء نے یا حالات کی قوت کو محسوس نہیں کیا یا راضی بقضا ہیں۔

زندگی اپنا چولا بدل چکی۔ علوم و فنون بدل گئے۔ مسائل دوسرے ہو گئے طرزِ فکر اور اندازِ نظر نیا ہو گیا۔ ہر چیز قانونِ ارتقاء کے تحت ماضی سے بہت آگے نکل گئی دنیا کے جن جن اداروں نے زندگی کا ساتھ دیا اور اس کی ارتقاء میں اپنا واجبی حصہ ادا کیا وہ باقی رہے اور ترقی کرتے رہے جو ادارے زندگی کا ساتھ نہ دے سکے انھیں ختم ہونا پڑا۔ کائنات کی ترقی پذیر روحِ حیات کو جذب کئے ہوئے بغیر کوئی چیز زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہماری ان پرانی درسگاہوں نے بدقسمتی سے قدرت کے اس اٹل قانون کی خلاف ورزی کی اس لئے یا فنا ہو گئیں یا فنا پر آمادہ ہیں۔ ان کو ان کی موجودہ حیثیت میں باقی رکھنے کی ہر کوشش لاحاصل ہے ان کا کام ختم ہو گیا اُن میں پڑھاتے جانے والے علوم فرسودہ ہو گئے۔ طریقۂ تحقیق اور طرزِ تعلیم دونوں بوسیدہ ہیں۔ نہ یہ ہماری خارجی زندگی سے ہم آہنگ اور نہ داخلی حیات سے مطابق ان میں اسلام کے حقیقی تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت کبھی نہیں زندگی کو اسلامی اصول پر متوازن بنانے کے لئے جن قابلیتوں کی ضرورت ہے ان کو پیدا کرنے سے یہ قاصر ہیں۔ ایسی حالت میں ان کا باقی رہنا کرامت ہو سکتا ہے تاریخ کا تقاضا نہیں۔ اس بدلی ہوئی فضا میں ان کو باقی رکھنے کی بڑی سے بڑی کوشش ان کی رفتارِ زوال کو کچھ سست کر سکتی ہے ان میں زندگی نہیں پھونک سکتی۔

تاہم اگر ان مدارس کو پرانے انداز پر ہی باقی رکھنا ہے تو پھر وہی تدبیر کرنی ہو گی جس کو اب سے ڈیڑھ دو سو سال پہلے آزمایا گیا تھا۔ ان مدارس کو اور زیادہ نیچے لانا پڑے گا اور کمیت کے ساتھ کیفیت کو بھی محدود کرنا ہو گا۔ نصاب کو بہت زیادہ ہلکا کرنا پڑے گا۔ تعلیمی گھنٹوں میں کافی کمی کرنی ہو گی۔ اوقات میں تبدیلی کی جائے گی اور مدت تعلیم کو کم کیا جائے گا۔ تاکہ مذہبی تعلیم کے شائق (اور خدا کا شکر ہے کہ ابھی تک ہمارے ملک میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں) اپنے غیر مصروف گھنٹوں میں دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ دو تین سال میں مذہبی نصاب کو ختم کر سکیں۔ ممکن ہے کہ ان میں سے کچھ ایسے خصوصی ذوق اور اچھی صلاحیت والے افراد نکل آئیں جو اس تعلیم کی اپنے طور پر تکمیل کر کے ہمارے موجودہ علماء کی جگہ لے سکیں۔

اس تدبیر سے ہم اپنی موجودہ درسگاہوں کو کچھ زمانے کے لئے آباد کر لیں گے اور مذہبی تعلیم

کا چرچا کچھ دنوں کے لئے مزید برقرار رہے گا کیونکہ یہ محض عارضی تدبیر ہے جو موجودہ ماحول کو دیکھتے ہوئے شاید پیش رو تدبیر سے بھی کم دیر پا ثابت ہوگی اور ہمیں چار وناچار ان مدارس کو مستقلاً بند کرنا پڑے گا یا پھر کوئی دوسری تدبیر کرنی ہوگی۔ کیونکہ آج کل ظروف و حالات جس تیزی کے ساتھ بدل رہے ہیں اور ان کی تبدیلی کے ساتھ ذہنیتوں میں جس سرعت کے ساتھ انقلاب آتا جا رہا ہے اس کو دیکھتے ہوئے اس قسم کی عارضی تبدیلیاں بہت زیادہ وقتی ہو کر رہ جاتی ہیں۔

ہاں اگر ہمارا مطمح نظر "انداز اور طرز" نہیں ہیں ہم علوم اور فنون کو انھی علوم اور فنون میں منحصر نہیں سمجھتے ہیں جو متاخرین سے ہمیں ورثہ میں پہنچے ہیں بلکہ ہمارا مقصود اسلامی ادارۂ تعلیم کو برقرار رکھنا ہے اور وہ بھی اس لئے کہ مسلمانوں کی انفرادی اور معاشرتی زندگی کو وہ کیسے ہی حالات اور ظروف میں ہوا سلامی بنایا جا سکے اور مذہبی اصول کو بنیاد بنا کر مسلم زندگی کی تنظیم کی جاتے تو پھر اس کے لئے وہ طریقے اختیار کرنے ہوں گے جن کو مسلمانوں نے اپنے عہد ترقی میں اختیار کیا تھا، مدرسوں میں عصری روح جذب کرنی ہوگی قدیم فرسودہ علوم و فنون کے بجائے علوم و فنون کو ان کی ترقی یافتہ شکل میں شامل کرنا ہوگا تعلیم کو زندگی سے مربوط کرکے آگے بڑھنا ہوگا۔ ان درسگاہوں کا دینی پہلو یہ ہوگا۔ . . . . کہ طلبہ کو اسلام کی حرکی قوتوں سے آشنا کریں گی۔ اسلام کی بنیادی قدروں سے زندگی میں کس طرح ضبط پیدا کیا جا سکتا ہے یہ درسگاہیں اس کو سمجھنے اور سمجھانے کی صلاحیت پیدا کریں گی۔

غالباً صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے اسلام کے تعلیمی ادارے کو باقی رکھا جا سکتا ہے اور اس کو مسلمانوں اور خود اسلام کے لئے مفید بنایا جا سکتا ہے اور تنہا اسی قسم کی درسگاہوں کے فضلا سے زندگی میں رہنمائی کی توقع ہو سکتی ہے۔ چونکہ یہ درسگاہیں زندگی سے بے گانگی نہیں برتیں گی اس لئے وہ شاید زیادہ دیرپا اور مستقل ثابت ہوں۔ یہ طریقہ ایک بار کامیاب ہو چکا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اب ناکام ہو اور اگر خدانخواستہ ناکام ہوا تو بھی ممکن ہے کہ اس تجربے کی بنا پر ہم زیادہ بہتر اور زیادہ عملی راہوں کا سراغ پا سکیں لیکن اگر کچھ بھی نہ ہو سکا اور اصلاح کے شوق میں ہماری موجودہ

درسگاہیں جاتی رہیں تو یہ ایسی بات ہے جو ہونی ہے اس لئے خوف زدہ ہوکر ہمیں صحیح سمت میں کوشش نہ چھوڑ دینی چاہئیں کیونکہ تسکین کے لئے یہ بھی کیا کم ہے کہ ہم نے اپنی جیسی کر لی۔

ہمارے مدارس کی اصلاح کے سلسلے میں سب سے پہلی بات یہ تحقیق کرنی ہے کہ ہمارے نصاب تعلیم کا وہ خاص ڈھانچہ کون سا ہے جو اسلامی اور غیر اسلامی مدارس میں حد فاصل ہے کون سے مضامین لازم کی حیثیت رکھتے ہیں اور کون سے اختیاری، ان مدارس کی تعلیم اور تربیت کی امتیازی خصوصیت کیا ہے۔ ان امور کی صحیح تحلیل کر لی جائے تو ممکن ہے کہ اصلاح کے لئے صحیح رستے مل جائیں۔

تذکروں اور تاریخوں نے ہمارے مدارس کے نصاب کے بارے میں جو کچھ محفوظ رکھا ہے اس سے اور مختلف علوم و فنون کی ان تصانیف سے جو ہم تک پہنچی ہیں یا قیاس کرنا بے جا نہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ انھوں نے دین کو اساس بنا کر تعلیم کی عمارت کو استوار کیا اور ہر طرح کی فکری اور عملی کوششوں کو دین کے سانچے میں ڈھال دینے کی کوشش کی۔ اصل خاکے کو مذہبی رکھ کر اس میں علوم و فنون کی رنگ آمیزیاں کیں۔ مذہب کے تفوق کو نمایاں کیا۔ اس طرح اگر ایک طرف مسلمانوں کے علوم و فنون مذہب سے متاثر ہوئے تو اس میں بھی شبہ نہیں کہ دوسری طرف مذہب نے بھی بعض اجنبی اثر قبول کئے تاہم مسلمانوں نے اس کی پرواہ نہ کی اور اس ڈھانچ کو جو زمانے نے ان کی تعلیم کے لئے مقرر کر دیا تھا کسی طرح نہ چھوڑا۔ ہماری درسگاہوں کا یہی مخصوص ڈھانچ ہے جو ان کو دوسری درسگاہوں سے ممتاز بناتا ہے۔

مسلمانوں کے نصاب تعلیم کے صدہا سالہ مسلسل تغیروں پر اڑتی سی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دینیات اور عربی کو چھوڑ کر ہمارے نصاب کے تمام دوسرے مضامین میں باہم رد و بدل اور متواتر حذف و اثبات ہوتا رہا ہے اور یہ استثنا بھی ابتدائی اور متوسط نصاب میں ہے نصاب تعلیم کے اعلیٰ مراتب میں یہ استثنا بھی نظر نہیں آتا۔ تفقہ فی الدین اور عربی کی لسانی مہارت طلبہ کے ذوق، مناسبت طبع اور فرصت اور حالات کی مساعدت پر منحصر رہی ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین سے اوسط درجے کی عام واقفیت پیدا کرانی جس سے اسلام کے

عقاید و اعمال واضح ہو جائیں، اسلامی طرزِ زندگی کا علم ہو جاتے اور معاشرہ کی روزمرہ کی ضرورتیں پوری ہو سکیں ہمارے مدارس کا مطمح نظر تھا اس سے زیادہ کی تعلیم کو ادارے نہ ضروری سمجھتے تھے اور نہ مناسب۔ ان اداروں کو عربی سے جتنی دلچسپی تھی اس کی حدیں بھی مقرر تھیں یہ درسگاہیں اپنے طلبہ کو اس قدر عربی سے لازماً آشنا بنا دیتی تھیں جس سے وہ قرآن و حدیث سے بطور خود اور بلاواسطہ فائدہ اٹھا سکیں اور اسی ضمن میں فقہ و اصول اور عقاید و کلام کی کتابوں کا براہ راست مطالعہ کر سکیں۔ عہد جاہلی کی ادبی عربی اپنی تمام لسانیاتی نزاکتوں اور فصاحت و بلاغت کے نکتوں کے ساتھ قرآن کے اسلوب بیان، اعجاز اور تدبر معانی کے لئے ضروری سہی، دو جہ عربی اہل زبان کے اختلاط و تعلق کے لئے ناگزیر سہی لیکن ہماری درسگاہوں نے اپنے عام متوسط نصاب کا ان کو جزو لازم نہیں بنایا بلکہ خصوصی ذوق اور شخصی ضرورتوں پر محمول رکھا۔

اسلامی درسگاہوں کی تربیت کی امتیازی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ طلبہ میں اسلامی کردار کو نشو و نما دیں، ان کے افکار، اخلاق اور اعمال کو اسلامی نمونے کے مطابق ڈھالیں۔ چنانچہ صالح ماحول، اسلامی کردار کے اساتذہ اس تربیت کے لئے ضروری عناصر سمجھے گئے۔ غرض یہ کہ ہماری درسگاہوں کی تربیت کا مقصد صرف اچھے اور مفید شہری بنانا نہیں رہا ہے بلکہ اچھے اور مفید مسلمان بنانا رہا ہے اور تنہا یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے مسلمانوں کو اپنی مستقل درسگاہوں کی ضرورت ہے۔

اسلامی درسگاہوں کے امتیازی اوصاف کی اگر یہ تحلیل درست ہے تو ان کو سامنے رکھ کر ہی ہمیں اپنے مدارس کی اصلاح کرنی چاہئے جہاں تک تربیت اور مقصد کا تعلق ہے جب تک ہماری درسگاہوں کو ایسے اساتذہ میسر نہ آ جائیں جو خود اس رنگ میں رنگے ہوں اس وقت تک یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہم اپنی درسگاہوں میں مقصد اور تربیت کے اعتبار سے سو فی صدی کامیاب ہوں گے تاہم اس سلسلے میں جو کوششیں ہو سکتی ہوں ان سے دریغ نہ کرنا چاہئے اور جو وسائل مفید ہوں ان کو اختیار کرنا چاہئے۔

ابتدائی اور متوسط نصاب میں دینیات اور عربی کو لازم قرار دیا جائے اور اعلیٰ اور تکمیلی نصاب میں ان کو اختیاری مضامین کی حیثیت میں پڑھایا جائے اور حتی الامکان ان درسگاہوں کو ہر جہتی بنانے کی کوشش کی جائے۔ پرانے علوم آج اتنے ترقی کر چکے ہیں کہ جدید و قدیم میں نام کے علاوہ شاید کوئی اشتراک نہیں۔ فہرست علوم میں سیکڑوں نئے علموں کا اضافہ ہو گیا، ہماری درسگاہوں کو حسب مقدرت ان سب کو شاملِ نصاب کرنا چاہئے اور ایسے تمام علوم و فنون کو جو آج محض قدیم نظریوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور صرف تاریخی اہمیت کے حامل ہیں ان کو عام نصاب سے خارج کیا جائے، ان کی صحیح جگہ ہمارے مدارس میں اگر کہیں ہے تو تخصص کے مرحلے میں اور وہ بھی اختیاری حیثیت میں۔

یہ سچ ہے کہ ہماری عام درسگاہیں موجودہ فنون کی تعلیم کا بار اٹھانے کے قابل نہیں لیکن ابتدائی اور ثانوی مرحلوں تک بہت سے مدرسے اگر چاہیں تو جدید تعلیم کا بار اٹھا سکتے ہیں، ہندستان کے بعض بڑے مدرسے کوشش کریں تو کم از کم نظری فنون کو جامعی معیار تک بھی پڑھا سکتے ہیں۔ اس طرح جب نئی منہاج کی بنیاد پڑ جائے گی اور نئے فنون ہماری درسگاہوں میں بار پالیں گے تو کون کہہ سکتا ہے کہ عملی فنون کی تعلیم کے لئے راہیں نہیں کھلیں گی اور خدا ان کے لئے اسباب مہیا نہیں کریگا۔ میرا خیال ہے کہ مذہبی تعلیم میں جذب کی ہوئی عصری تعلیم ہماری درسگاہوں کی معرفت کافی سستی اور زیادہ مفید ثابت ہوگی، زبان کا مسئلہ بھی اب زیادہ دشوار نہیں ہے، عثمانیہ یونیورسٹی کے دار الترجمہ نے کام چلانے کے لئے اردو میں کافی مسالہ جمع کر دیا ہے جسے اگر چاہیں تو بھارت میں تنہا یہی اٹھا سکتی ہیں اور یوں حکومت سے آزاد رہ کر اردو کی ٹھوس خدمت بھی انجام دی جا سکتی ہے۔

پوری تعلیم کو ایک اکائی کی صورت میں ضبط کرنا نہ طلبہ کے لئے مفید ہے اور نہ سرپرستوں کے لئے، خالص تعلیمی زاویہ نظر بھی اس طریق کار کی تائید نہیں کرتا۔ تعلیم کو چند اور مکمل بکار آمد مرحلوں میں تقسیم ہونا چاہئے۔ ابتدائی مرحلے کو چھوڑ کر ثانوی اور جامعی مرحلوں میں طلبہ کی ضرورتوں اور مناسبتوں کے تحت اختیاری مضامین کی مجموعہ بندیاں کرنی چاہئیں۔ تخصص اور مہارت پیدا کرنے کی سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں اس کے بغیر ہماری درسگاہیں ہر جہتی اور مفید نہیں بن سکتیں، مضامین کی تقسیم مجموعہ

ندی اور طریق تعلیم میں عصری تحقیقوں اور ماہرین تعلیم کی رایوں اور منصوبوں سے کام لینا چاہیئے اس طرح ہم بہت سی کاوشوں سے بھی نجات پالیں گے اور ہمارا نظام تعلیم خود بخود حرکی اور عصری روح سے ہم آہنگ رہے گا۔

ہماری درسگاہوں کے مروجہ دینیاتی نصاب میں قرآن کو عملاً مرکزی حیثیت حاصل نہیں حالانکہ اس کو سمجھنے اور اس کا عام میلان و مزاج دریافت کرنے کا واحد ذریعہ قرآن ہی ہے۔ قرآن میں بلاواسطہ تدبر کی راہیں بڑی حد تک بند ہیں۔ آئندہ نصاب میں اس کو مرکزی مقام ملنا چاہیئے اور بلاواسطہ تدبر کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیئے۔ احادیث کا دورہ حنفی فقہ اور اشعری کلام کی روشنی میں پورا کر دیا جاتا ہے اور اس طرح احادیث کی تمام دوسری حیثیتیں نظرانداز ہو جاتی ہیں۔ احادیث کو جب تک شرح قرآن کا درجہ نہیں دیا جائے گا ان کی تعلیم کا صحیح فائدہ حاصل نہیں ہوگا فقہ آج تقلید محض ہے تعلیم کے آخری مرحلوں میں حقیقی تفقہ پیدا کرنا ہمارے نصاب کا مطمح نظر ہونا چاہیئے۔ اصول فقہ کا درس بالکل بے مقصد ہو گیا ہے اس کو بامقصد بنانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ عقاید و کلام میں مختلف اسباب و عوامل کی بناء پر عجیب و غریب عقائد اور دور از کار نظری مباحث شامل ہو گئے ہیں۔ جو ممکن ہے کبھی مفید اور ضروری ہوں مگر آج ان کی وجہ سے اسلامی عقاید کی سادگی چھپ جاتی ہے اور اس زمانے کے ذہن کے لئے طمانیت بخش ہونے کے بجائے الجھنوں کا باعث ہیں۔ دینیات کے لئے جدید نصاب پر غور کرتے وقت ان سب باتوں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے تاکہ ہمارا نصاب اسلامی رجحانات سے مناسبت رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید ماحول کی ضرورتوں کو بھی پورا کر سکے۔

دوسرے فنون کی تعلیم میں تاریخی پس منظر کے طور پر ان خدمتوں کو جو مسلمانوں نے اس خاص میں نمایاں کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ مغربی تاریخ علوم میں جو خلا ہے بھر جائے اور اس لئے بھی کہ ہماری موجودہ تعلیم اپنے ماضی کے ساتھ مربوط رہے اس طرح نہ ہم اپنے اسلاف سے بیگانے رہیں گے اور نہ ہماری ملی وحدت زمانوں اور عصروں سے پارہ پارہ ہوگی۔

ہمارے مدارس میں ابتدا سے بعض ایسے مضامین درس میں شامل ہیں جو ابتدائی موضوع میں بالکل

بے کار ہیں اور ان میں طلبہ کی قوت بے جا صرف ہوتی ہے ایسے مضامین کو ابتدائی مراحل سے خارج کر دینا بہتر ہے۔ ان کا درس لبشرط ضرورت صحیح موقعوں پر ہونا چاہئے۔ معانی، بیان، اصول فقہ، منطق اور فلسفہ اسی قسم کے مضامین ہیں نحو صرف دنخو ابتدائی مرحلے کے لازم مضامین ہیں مگر ان کی مجرد حیثیت میں تعلیم طلبہ پر غیر ضروری بار ہے۔ ان کی تعلیم زبان کے ضمن میں ہونی چاہئے یوں طلبہ دلچسپی بھی محسوس کریں گے اور زبان کے ساتھ قواعد کی مشق بھی ہو جائے گی۔

زیرِ درس مضامین میں اصل اہمیت علوم کو دینی چاہئے نہ کہ کتابوں کو۔ کتابوں کی حیثیت ان یاد داشتوں سے زیادہ نہیں جن میں اساتذہ اور طلبہ کی سہولت کے لئے متعین معیاروں کے تحت علمی مواد جمع کر دیا گیا ہے۔ بغیر خاص ضرورت کے کتاب کو موضوعِ درس بنانا تعلیم کو ناقص بنانے کے مترادف ہے۔

تعلیم میں اس کی خاص طور پر نگرانی کی ضرورت ہے کہ تعلیم کا موضوع طالب علم رہے، تعلیم میں اس کی ضرورتوں، دلچسپیوں اور مناسبتوں کا خیال رکھا جائے، اس کی ذہنی الجھنوں اور کشمکشوں کو سمجھنے کی کوشش کی جائے اور ان کو حل کرنے اور دور کرنے پر توجہ صرف کی جائے تعلیم کا فائدہ طالب علم کے انفرادی اور اجتماعی رجحانوں کو سدھار کر اس کو سماج کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور بکار آمد بنانا ہے نہ کہ اس کو علوم کی کال کوٹھری بنانا اسی ضمن میں یہ بھی ضروری ہے کہ طلبہ میں تعمیری نقد کی حوصلہ افزائی کی جائے اس طرح نہ صرف یہ کہ اس کی تخریبی قوتوں کی اصلاح ہوگی بلکہ اس کی داخلی الجھنوں کی بھی تسکین ہوتی رہے گی اور دماغی اوج میں ترقی بھی۔

اس سلسلے کی آخری گذارش مدارس کے اربابِ انتظام سے یہ کرنی ہے کہ اگر ہندستان کے محکمۂ تعلیم کے منظور کئے ہوئے مراحل اور ان کے بنائے ہوئے نصابوں کو معیار بنا کر ضروری حذف و اثبات سے ان میں دینیات کو جذب کر دیا جائے اور میرا یہ تجربہ ہے کہ یہ کچھ زیادہ دشوار نہیں تو بہت سی کاوشوں سے نجات مل جائے گی اور ہمارا نصاب خود بخود زمانے کے ساتھ چلنے لگے گا، اساتذہ کا مناسب انتخاب، تعلیم اور طرزِ تعلیم کی نگرانی طلبہ میں اسلامی روح پیدا کرنے میں معاون ثابت ہوں گے۔

۴۴

ابتدائی مراحل میں اساتذہ کی تھوڑی سی توجہ سے عربی اور دینیات کو ایک دوسرے میں جذب کیا جا سکتا ہے ابتدائی مراحل میں عربی کو لازم کرنے کا مقصد طلبہ کو ابتدا سے ہی ایسا ذریعہ فراہم کر دیتا ہے جس سے وہ دینیات کے ماخذوں سے براہ راست اور بقدر استعداد فائدہ اٹھا سکیں۔ اگر قرآن حدیث اور فقہ و عقاید سے الفاظ فقروں، جملوں اور عبارتوں کا انتخاب کر کے عربی کی تعلیم دی جائے تو یہ فائدہ بدرجہ اتم حاصل ہو جائے گا اور زبان کے اعتبار سے بھی عربی اتنی ہو جائے کہ آئندہ مراحل میں ادبی عربی کے لئے درجات کا کام دے۔

آخر میں مجھے ایسے تمام بزرگوں اور رفیقوں سے جن کو میری معروضات سے دکھ پہنچا ہو یا انھوں نے سوء ادب محسوس کیا ہو میں معافی چاہتے ہوئے عرض کروں گا کہ میری نیت دکھ دینا ہے اور نہ سوء ادب کا ارتکاب " ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ"

تفسیر مظہری

(تمام عربی مدرسوں کتب خانوں اور عربی جاننے والے اصحاب کے لئے بیش بہا تحفہ)

ارباب علم کو معلوم ہے کہ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی یہ عظیم المرتبہ تفسیر مختلف خصوصیتوں کے اعتبار سے اپنی نظیر نہیں رکھتی لیکن اب تک اس کی حیثیت ایک گوہر نایاب کی تھی اور ملک میں اس کا ایک قلمی نسخہ بھی دستیاب ہونا دشوار تھا۔

الحمد للہ۔ سالہا سال کی عرقریزی کوششوں کے بعد ہم آج اس قابل ہیں کہ اس عظیم الشان تفسیر کے شائع ہو جانے کا اعلان کر سکیں اب تک اس کی حسب ذیل جلدیں طبع ہو چکی ہیں جو کاغذ اور دیگر سامان طباعت و کتابت کی گرانی کی وجہ سے بہت محدود مقدار میں چھپی ہیں۔ آخری جلد زیر کتابت ہے۔

ہدیہ غیر مجلد جلد اول تقطیع ۲۹×۲۲/۸ ساٹ روپے، جلد ثانی ساٹ روپے، جلد ثالث آٹھ روپے، رابع پانچ روپے، خامس سات روپے، سادس آٹھ روپے، سابع آٹھ روپے، ثامن آٹھ روپے

۵۴،

حالاتِ حاضرہ

صدر آئزن ہاور کے اعلان کے بعد چین کا مستقبل

از

(جناب اسرار احمد صاحب آزاد)

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے سابق صدر مسٹر ٹرومین نے ارضِ چین پر مارشل چیانگ کائی شیک کی کامل شکست کے بعد ۲۷ رجون ۱۹۵۰ء کو یہ اعلان کیا تھا کہ ——— میں نے ساتویں امریکی بحریہ کو فارموسا پر کئے جانے والے ہر حملہ کو روکنے کا حکم دے دیا ہے ——— لیکن امریکہ کے نئے صدر مسٹر آئزن ہاور نے ۲ رفروری ۱۹۵۳ء کو ساتویں امریکی بحریہ کے متعلق جو اہم اعلان کیا ہے وہ یہ ہے کہ ——— میں یہ ہدایات جاری کر رہا ہوں کہ آئندہ ساتواں امریکی بحریہ کمیونسٹ چین کی حفاظت نہیں کرے گا۔ ان ہر دو اعلانات کے الفاظ میں جو تضاد موجود ہے اس کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن ان اعلانات میں مقصد کی جو یکسانیت مضمر ہے اسے ضرور سمجھ لینا چاہئے۔ ۱۹۵۰ء کے وسط میں چیانگ کائی شک اور ان کے ساتھیوں نے ارضِ چین سے فرار ہو کر فارموسا میں پناہ لی تھی اور اگر اس وقت چین کی عوامی حکومت فارموسا پر یورش کر سکتی تو چیانگ کائی شک اور ان کے ساتھیوں . . . . . .

. . . .

. . . . کے لئے اس جزیرہ کی زمین بھی تنگ ہو جاتی اس لئے ۱۹۵۰ء میں چیانگ کائی شک اور عوامی چین کے ہر تصادم کو روکنا ضروری تھا لیکن آج ۱۹۵۳ء میں جب صدر ٹرومین کے اعلان پر دو سال اور آٹھ ماہ کی مدت گذر چکی ہے اور غالباً چیانگ کائی شک اُن کے ساتھی اور ان کے حامی خود کو ارضِ چین پر حملہ کرنے کے قابل سمجھ رہے ہیں اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ ساتواں امریکی بحریہ عوامی چین کو فارموسا پر اور فارموسا کو عوامی چین پر حملہ کرنے کی راہ میں حائل رہے۔

ارض چین میں عوامی حکومت کو قایم ہوئے تین سال کی مدت گذر چکی ہے اور اس قلیل سی مدت میں چین کے عوام نے زندگی کے تقریباً تمام شعبوں میں جو قابل ذکر ترقی کی ہے دنیا کی کوئی قوم اس سے انکار نہیں کر سکتی اس کے باوجود امریکہ نے آج تک چین کی عوامی حکومت کو ملک کی جائز اور نمائندہ حکومت تسلیم نہیں کیا اور آج امریکہ کے نئے صدر زیادہ عزم اور استقلال کے ساتھ چین کی عوامی حکومت کی مخالفت پر آمادہ نظر آتے ہیں اور یہی وہ بات ہے جو دنیا کے ہر سمجھ دار انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ امریکہ کو عوامی چین کے ساتھ یہ نفرت اور شکست خوردہ چیانگ کائی شک کے ساتھ وہ وابستگی کیوں ہے جس نے مشرق بعید کے سیاسی اور اقتصادی مسائل کو پیچیدہ تر بنا رکھا ہے اور جس کی بدولت کسی وقت بھی امن عالم تباہ اور برباد ہو سکتا ہے۔

یہاں چین میں مغربی سرمایہ دار نو آبادیات خواہوں کی سازشوں کی طویل تاریخ بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن آج اس بیسویں صدی کے وسط میں جسے عوام کی صدی کہا جاتا ہے تمام جنوبی مشرقی ایشیا اور خصوصاً چین کے متعلق امریکہ کے برسر اقتدار سرمایہ دار طبقوں کا جو نظریہ رہا ہے کم از کم اسے بیان کئے بغیر مذکورہ بالا سوال کا جواب نہیں دیا جا سکتا۔ اور اس سلسلہ میں صرف انھیں باتوں کو مدِ نظر رکھنا کافی ہوگا جو دوسری عالم گیر جنگ کے بعد رونما ہوتی رہی ہیں۔

۱۹۴۹ء میں مسٹر ایڈورڈ آنرک نے جو اس زمانہ میں امریکہ کے ایوان نمائندگان کی اس مجلس کے چیرمین تھے جو بحری امور سے متعلق ہوتی ہے کہا تھا کہ ـــــ بحر الکاہل ہمارا سمندر ہے ـــــ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ـــــ امریکہ بحر الکاہل کے کناروں پر واقع دوسرے ملکوں مثلاً سوویٹ یونین، چین، جاپان اور آسٹریلیا وغیرہ کے مفادات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا ـــــ لیکن مسٹر آنرک کے مذکورہ بالا الفاظ کے پس پردہ امریکہ کے کیا مقاصد کارفرما رہے ہیں؟ انھیں اخبار "فائینشل ٹائمز" مورخہ ۲۶ر مارچ ۱۹۵۰ء میں شائع شدہ ایک مقالہ میں ایک امریکی مقالہ نگار نے اس طرح بیان کیا ہے ـــــ امریکی کارخانہ دار تاجر ہندوستان اور مشرق بعید کے وسیع بازاروں پر قابو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان میں مقدم ترین بازار چین ہے ـــــ اور چونکہ اس قسم کے بازاروں کے حصول اور

ان کی حفاظت کے لئے فوجی قوت کی نمائش ضروری ہوتی ہے اس لئے اسی سال "آرزک کمیٹی" نے بحر الکاہل اور بحر اوقیانوس میں ۲۷ بحری مستقر حاصل اور قایم کرنے کی سفارش بھی کی تھی۔

مسٹر آرتھر کلینگ نے اپنی کتاب "نیا چین۔ نئی دنیا" میں لکھا ہے کہ ——— دوسری عالم گیر جنگ کے زمانہ میں امریکی تاجروں کا منافع چھ ہزار ملین ڈالر سے بڑھ کر ۲۳ ہزار ملین ڈالر تک پہنچ گیا تھا ...... اور امریکی رہنماؤں کے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ اس کثیر منافع کو کس طرح قایم رکھا جائے ——— اور اس سوال کو حل کرنے کے لئے امریکہ کے محکمۂ خارجہ نے "اقتصادی امور" سے متعلق جو شعبہ قایم کیا تھا اس کے صدر اور محکمۂ اقتصادیات کے انڈر سکریٹری مسٹر کلیٹن نے ۱۴ر نومبر ۱۹۴۶ء کو ایک تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ——— ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بہت سی اہم اشیاء تیار کرنے کی اہلیت ہے اور بعض حالات میں ہماری تیار کردہ اشیاء باقی ماندہ دنیا کی تیار کردہ ایسی اشیاء سے بہت زیادہ ہوتی ہیں اور اگر ہمارے کارخانے باقاعدگی کے ساتھ کام کرتے رہیں تو ہماری تیار کردہ اشیاء بچ رہتی ہیں جس سے ہمیں نقصان ہوتا ہے اس لئے ہمیں تمام دنیا کے ساتھ تجارتی تعلقات قایم کرنا چاہئیں، ہمیں بازار، بڑے بڑے بازار درکار ہیں ——— مسٹر کلیٹن نے مذکورہ بالا الفاظ میں جو کچھ کہا وہ اپنی جگہ قابل اعتراض نہیں لیکن یہ محض تمہید ہے ورنہ ان کے اس بیان کا حقیقی مقصد انھیں کے الفاظ میں ہے کہ ——— کارخانوں کی کثرت اور توسیع کی بدولت ہمیں دوسرے ممالک سے خام اشیاء حاصل کرنے کی بے حد ضرورت ہے اور چونکہ ہمارے کارخانوں کی زندگی اور ترقی کا مدار خام معدنیات اور دوسری خام اشیاء کی درآمد پر ہے اس لئے ہم جن ممالک سے یہ خام اشیاء حاصل کرتے ہیں ان کے مستقبل کا مسئلہ ہمارے لئے ایک ایسے مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے جسے قومی اہمیت حاصل ہو۔

جیسا کہ سطور بالا میں عرض کیا جا چکا ہے۔ امریکہ کے سرمایہ دار تاجر خام اشیاء کے حصول اور تیار شدہ مال کی فروخت کے سلسلہ میں چین کو خصوصی اہمیت دیتے رہے ہیں اس لئے نومبر ۱۹۴۶ء میں چیانگ کائی شک کی حکومت اور امریکہ کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے امریکی قیدیوں کو چین میں کسی پابندی کے بغیر سفر کرنے، رہنے اور تجارت کرنے کے حقوق حاصل ہو گئے تھے امریکی تجارتی

فرموں کو تجارتی، صنعتی، مالی، تعلیمی اور مذہبی ادارے قایم کرنے اور ان امور سے متعلق ہر قسم کی سرگرمیاں جاری رکھنے کی غیر مشروط اجازت دے دی گئی تھی اور چیانگ کائی شک کی حکومت نے اس بات کی ذمہ داری قبول کی تھی کہ چین میں آنے والے امریکی مال پر کسی قسم کی کوئی پابندی عاید نہیں کی جائے گی ــــــ لیکن ظاہر ہے چیانگ کائی شک کی حکومت امریکی سرمایہ داروں کو جو مراعات دے سکتی تھی چین کی عوامی حکومت سے ان مراعات کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی اور چیانگ کائی شک کے ساتھ امریکی سرمایہ دار جس تعلقِ خاطر کا اظہار کرتے رہے ہیں وہ چینی عوام کی فلاح وبہبود یا بقاء امنِ عالم کے جذبہ پر مبنی نہیں بلکہ اس کا مقصد امریکی سرمایہ داروں کے مفاد کی حفاظت ہے۔

سطورِ بالا میں، میں نے محض یہ بات ثابت کی ہے چیانگ کائی شک کے ساتھ امریکی سرمایہ داروں کی ہمدردی صرف اپنے مفاد کے حصول کی جذبہ پر مبنی ہے لیکن یہ بات ثابت کر دینے سے وقت کا یہ اہم ترین سوال حل نہیں ہو جاتا کہ ــــــ اگر چیانگ کائی شک کی افواج نے ارضِ چین پر حملہ کر دیا اور اس حملہ میں امریکہ نے چیانگ کائی شک کی امداد بھی کی تو کیا ارضِ چین پر چیانگ کا قبضہ نہیں ہو سکتا؟ اور اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلے ہمیں اس قرطاس ابیض (وہائٹ پیپر) پر ایک نظر ڈال لینا چاہئے جو چیانگ کائی شک کی شکست کے بعد ۱۹۴۹ء کے اواخر میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی طرف سے شائع کیا گیا تھا۔

اس قرطاسِ ابیض کے پیش لفظ میں متحدہ امریکہ کے سابق ناظم امور خارجہ مسٹر ڈین ایکیسن نے لکھا تھا کہ ــــــ جاپان کی شکست کے بعد سے متحدہ امریکہ کی حکومت نیشنلسٹ چین کو امداد اور قرض کی صورت میں جو رقوم دیتی رہی ہے وہ تقریباً دو ملین ڈالر تک پہنچتی ہے یہ رقم نیشنلسٹ چین کے میزانیہ کی نصف رقم سے زیادہ ہے اور جنگ کے بعد سے امریکہ نے مغربی یورپ کے کسی ملک کو اس قدر مالی امداد نہیں بہم پہنچائی اس امداد کے علاوہ امریکہ نے چین کو تقریباً ایک ملین ڈالر سے زیادہ قیمت کا جنگی سامان اور شہری ضرورتوں میں کام آنے والی اشیاء بھی دی ہیں اور ان کی قیمت کے طور پر محض ۲۳۲ ملین ڈالر وصول کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے ــــــ امریکہ نے چین کی خانہ جنگی کے آخری دور میں

چیانگ کائی شک کو جو قابل ذکر امداد دی تھی اس کا اعتراف کرنے کے بعد اسی قرطاس ابیض میں اس بات کا اقرار بھی کیا تھا کہ ـــــ چیانگ کا زوال چین میں ان کی شدید ترین اندرونی مخالفت کا نتیجہ تھا اور چین کے اندرونی حالات نے جو رخ اختیار کیا تھا امریکہ کے لئے اس پر قابو حاصل کرنا ناممکن تھا۔ اور چین میں موجود امریکی فوجی مبصرین کی بھیجی ہوئی یادداشتیں اس بات پر گواہ ہیں کہ ۱۹۴۸ء میں چین کی نیشنلسٹ فوجوں کو کسی ایک مقابلہ میں بھی سامانِ جنگ کی قلت کے باعث شکست نہیں ہوئی ـــــ اس کے بعد مسٹر ایچی سن نے کسی قدر تامل کے ساتھ اس بات کو بھی تسلیم کر لیا تھا کہ ـــــ امریکہ خواہ کتنی ہی امداد کیوں نہ دیتا لیکن چیانگ کائی شک کی شکست کو روکنا ممکن نہیں تھا ـــــ اور مذکورہ بالا اقتباسات سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اگر امریکہ کی مالی اور عسکری امداد ۱۹۴۹ء میں ارض چین پر چیانگ کائی شک کی حکومت کو سنبھال اور برقرار نہیں رکھ سکی تو وہی امداد آج چیانگ کائی شک کو ارض چین پر کس طرح مسلط کر سکتی ہے؟

یہ بات ظاہر ہے کہ آج سے چند سال قبل پورے چین پر چیانگ کائی شک کی حکومت قائم تھی اور ان کی حکومت کے خلاف چینی عوام ہی کی سرفروشانہ جدوجہد نے انھیں ارض چین سے فرار ہونے اور فارموسا میں پناہ لینے پر مجبور کیا تھا اس لئے یہاں قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ـــــ کیا آج وہ حالات بدل گئے ہیں جن کی بدولت چیانگ کائی شک کو ارض چین سے فرار ہونا پڑا تھا اور کیا آج چین کے عوام چیانگ کائی شک کی حکومت کا خیر مقدم کرنے کے لئے آمادہ ہیں؟

چین کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر سن یت سین کے انتقال کے بعد ارض چین کا واحد رہنما چیانگ کائی شک ہی کو تصور کیا جاتا تھا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے آغاز سے قبل چین کے کمیونسٹ بھی اس سے منکر نہیں تھے اور جیسا کہ ایڈگر اسنو نے اپنی قابل قدر کتاب "ریڈ اسٹار اوور چائنا" میں لکھا ہے ـــــ چین کے جنرل مارشل کے حکم سے چیانگ کائی شک کی گرفتاری کے بعد کمیونسٹوں نے انھیں محض اس بنا پر رہا کرایا تھا۔ کہ وہ ان کی ذات کو چین کے قومی اتحاد کا مرکز تصور کرتے تھے ـــــ لیکن جنگ کے بعد جب چین میں ازسرنو خانہ جنگی شروع

ہوئی تو چین کے عوام آہستہ آہستہ اس نتیجے پر پہونچ گئے ان کے لئے چیانگ کائی شک کی حکومت مفید نہیں ہو سکتی اور اسی لئے نیشنلسٹ فوجوں کو نہ صرف شکست ہی ہوتی گئی بلکہ نیشنلسٹ چین کے لاکھوں سپاہی چین کی عوامی فوج کے ساتھ شامل بھی ہوتے گئے پھر چین کا جس قدر علاقہ چیانگ کائی شک کی گرفت سے آزاد ہوتا رہا چونکہ وہاں کے عوام کی حالت بھی روز بروز بہتر ہوتی گئی اس لئے عوامی فوج اور نئی حکومت دونوں کی قوت و طاقت بڑھتی گئی اور آج جب ارض چین بالکل آزاد ہے اور چین کی عوامی حکومت کو عوام کی حالت بہتر بنانے کے زیادہ مواقع حاصل ہیں وہاں کے حالات کو قدرتی طور پر چیانگ کائی شک کے موافق نہیں بلکہ شدید ترین مخالف ہونا چاہئے۔ اس سلسلہ میں صرف ایک بات اور سمجھ لینا چاہئے اور وہ یہ ہے کہ ارض چین پر چیانگ کائی شک کی شکست کے دو ہی اسباب ہو سکتے تھے اول یہ کہ عوام ان کے مخالف ہو گئے تھے اور اگر شکست کا بنیادی سبب اسی بات کو سمجھ لیا جائے تو جیسا کہ سطور بالا میں بتایا جا چکا ہے چین کے عوام اب ان کے موافق نہیں بن سکتے۔ اور دوسری وجہ چین کے کمیونسٹوں کی قوت کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس حال میں اول تو چین کے کمیونسٹوں کی قوت عوام ہی کی قوت کا دوسرا نام ہے لیکن اگر اس قوت کو عوام سے علیحدہ بھی فرض کر لیا جائے تو یہ بات بھی ماننا پڑے گی کہ چین کے کمیونسٹ اتنے طاقتور ہیں کہ وہ نہ صرف چیانگ کائی شک کی اس حکومت ہی کو شکست دے سکتے ہیں جس کی بقا کے لئے امریکہ ایسا طاقتور ملک ہر ممکن مدد دیتا رہا ہے بلکہ وہ چین کے ۴۷½ کروڑ باشندوں کو ان کی مرضی کے خلاف زندگی بسر کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں اور ظاہر ہے کہ چیانگ کائی شک ایک ایسی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مختصر یہ کہ چیانگ کائی شک اور ان کے حامیوں کے لئے از سر نو ارض چین کی تسخیر اور اس پر تسلط ممکن نہیں اور اس قسم کی کوئی سعی موجودہ بین الاقوامی حالات کو پیچیدہ تر تو ضرور بنا سکتی ہے لیکن اس کی بدولت چین کی عوامی حکومت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

برنارڈ شا
مصنفہ ظ۔ انصاری

از

(جناب پروفیسر سید احتشام حسین صاحب لکھنؤ یونیورسٹی)

برنارڈ شا انگریزی کے ان ادیبوں میں سے ہے جو اپنے ملک کی حدوں کو پار کرکے دوسرے ملکوں کے ادب اور ادیبوں کو متاثر کرتے ہیں، اس کی بے باکی، بلند حوصلگی، تیز نگاہی، زندگی کی توانا اور اعلیٰ قدروں سے محبت اور ادبیت نے تقریباً نصف صدی تک ذہنوں کو متاثر کیا، روایت پرستوں اور اخلاق کے خود ساختہ مدعیوں کو جھنجھوڑا، اقتدار پرستوں کو کچوکے لگائے اور ذہن و فکر کے لئے نئے دروازے کھولے۔ اُردو جاننے والوں کی بدقسمتی ہوگی اگر وہ برنارڈ شا کی عظمت سے واقف نہ ہوں۔

ڈاکٹر عابد حسین اور پروفیسر آل احمد سرور کے پرمغز اور دلکش مضامین کے سوا ابھی تک کسی نے برنارڈ شا کے متعلق اردو میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں لکھی، اس سلسلہ میں ظ۔ انصاری کی نئی تصنیف برنارڈ شا ایک اہم فرض انجام دیتی ہے۔ اس میں برنارڈ شا کی زندگی بھی ہے اس کا ماحول بھی اس میں اس کے ذہنی ارتقا کی تصویر بھی ہے اور اس کے افکار و خیالات کی تنقید بھی اور یہ سب کچھ دلکش ادبی زبان میں لکھا گیا ہے۔

انگریزی میں برنارڈ شا پر نہ جانے کتنا لکھا گیا ہے، خود برنارڈ شا نے اپنے متعلق اتنا لکھا ہے کہ اسی سے اس کی تصویر بنائی جا سکتی ہے لیکن ظ۔ انصاری نے ایک دیانت دار نقاد کی طرح نہ تو صرف اس کے اقوال پر اعتماد کیا ہے اور نہ دوسروں کے مخالف اور متضاد خیالات پر، بلکہ اس کے ذہنی پس منظر کا تجزیہ کرکے خود اس کے خیالات کی تنقید کی ہے کہیں اسے سراہا ہے اور کہیں

اس تضاد کو نمایاں کیا ہے جس میں برنارڈ شا کو گرفتار ہونا پڑا۔ گو برنارڈ شا کے کارناموں کی وسعت کو دیکھتے ہوئے یہ کتاب محض ایک تمہیدی اور تعارفی حیثیت رکھتی ہے لیکن یہ تعارف ہمیں برنارڈ شا سے روشناس کرا دیتا ہے اور یہی اس کتاب کا مقصد ہے۔ اس میں ہم اس برنارڈ شا کا ہلکا سا ایک عکس دیکھ لیتے ہیں جو بار بار راہ سے بے راہ ہو جانے کے باوجود انسانی قوتِ فکر، جوشِ عمل اور امکاناتِ ارتقاء کی منزل کی نشان دہی کرتا رہا۔

امید ہے کہ اختصار کے باوجود یہ کتاب اردو زبان میں ایک اہم جگہ حاصل کرے گی اور مجھے یقین ہے کہ اسے پڑھ کر ہمارے ادیب ان صحت مند قدروں کی ترویج کی طرف راغب ہوں گے برنارڈ شا جن کا بے باک علمبردار تھا اور ظ۔ انصاری نے جن کی طرف واضح اشارے کئے ہیں برنارڈ شا کے چند اہم ڈراموں کے بعض حصوں کے ترجمے دیکھ کر اردو دانوں کو اندازہ ہوگا کہ دورِ جدید کے سب سے بڑے ڈرامہ نگار کے ہاتھ میں پہنچ کر موضوع کس طرح فن سے دست و گریباں ہو جاتا ہے۔

ندوۃ المصنفین کی نئی کتاب

"قرآن اور تعمیرِ سیرت"

قرآنی تعلیمات کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور ان تعلیمات کے ذریعہ سے اس کردار کا کس طرح ظہور ہوتا ہے؟ یہ متبرک اور شاندار کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے اس وقت جب کہ مسلمان سیاسی بدقسمتیوں کا شکار ہو کر عام طور پر احساسِ کہتری اور بے یقینی کی گھٹاٹوپ اندھیریوں میں پھنسے ہوئے ہیں، یہ گراں مایہ تالیف ان کے ٹوٹے ہوئے روحانی رشتے کو استوار کرنے میں "چراغِ راہ" کا کام دے گی۔

فاضل مؤلف نے اس کتاب میں تعلیماتِ اسلامی کا عطر کشید کر کے رکھ دیا ہے، اور پھر اس میں فلسفہ، تصوف اور ادب کو بڑی قابلیت اور دیدہ وری سے سمویا ہے۔ فہرست مضامین کے چند بڑے عنوان ملاحظہ فرمائیے۔ توحید الوہیت، عبادت و استعانت، صالحیت، تعلیم کا مقصد، انسانِ کامل، قوتِ ایمانی اور ظہورِ غیب، تصحیحِ فکر، ماحول پر کس طرح قابو حاصل کیا جائے، قرآن اور علاج خوف، قرآن اور علاج حزن، قرآن

از

(رئیس المتغزلین جگر مرادآبادی)

اے وہ کہ تری ذاتِ گرامی بہ ہمہ رنگ — قدرت کی جو ہمراز تو فطرت کی ہم آہنگ

اے وہ کہ ہر اک نغمہ ترا نغمۂ فطرت — اے وہ کہ ہر اک نقش ترا دلکشِ ارژنگ

اے وہ کہ ترے معجزۂ جنبشِ لب سے — اک جنّتِ شاداب ہر اک غنچۂ دل تنگ

ہر پھول ترے باغ کا فردوس بہ دامن — ہر خار ترے دشت کا انگشتِ شفق رنگ

اے وہ کہ تری فکر بہ ہر صنف و بہ ہر طرز — ہم شعلہ و ہم شبنم و ہم نکہت و ہم رنگ

اقلیمِ سخن ہے ترے اعجازِ نفس سے — ہم نغمہ و ہم دشنہ و ہم نکہت و ہم رنگ

اک گوشۂ دامن میں ترے دجلہ و جیحوں — اک موجِ نفس میں ترے رقصاں جمن و گنگ

تھے ملکِ سخن میں ترے ہم عصر ہزاروں — تنہا تھی تری ذات مگر صاحبِ اورنگ

عرفی و نظیری و ظہوری و فغانی — کوئی ترا ہم سر نہ ترا کوئی ہم آہنگ

تو نے اسے گنجائشِ کونین عطا کی — ہر چند بہت تھا ابھی دامانِ غزل تنگ

تو نظم میں بھی نثر میں بھی مجتہد العصر — لیکن وہ ہے معذور کہ جس کی ہے نظر تنگ

الحق کہ تری وسعتِ تخئیل کے آگے
صحرا کفِ خاکستر و گلشن قفسِ رنگ

بیباک خاتون

کناٹ پلیس میں چند خواتین کو بے حجابی کا مظاہرہ کرتے دیکھ کر

(از جناب بسمل شاہجہانپوری)

یہ سماں جس کی خموشی نغمۂ چنگ ورباب   یہ ہوا جس کے نفس سے منفعل روحِ گلاب
یہ فضائے مرمریں یہ منظرِ برق انتساب   یہ تجلی گاہ جس میں حسنِ فطرت بے حجاب

بادلوں سے یوں برآمد ہو رہا ہے ماہتاب
جس طرح کوئی رخِ روشن سے سرکائے نقاب

نغمہ نغمہ بربطِ دل کا ہم آوازِ سروش   غنچہ غنچہ گلشنِ عالم کا مے خانہ بدوش
ذرہ ذرہ محفلِ ہستی کا آئینہ فروش   زندگی ساکت مشیت دم بخود فطرت خموش،

کس قدر پُر کیف منظر کیا سہانی رات ہے
اے حنا بندِ عروس زندگی کیا بات ہے

سامنے سے آ رہی ہے کون اٹھلاتی ہوئی   ناز فرماتی ہوئی بجلی سی لہراتی ہوئی
ہر قدم پر کعبہ و بت خانہ ٹھکراتی ہوئی   گنگنگوئے زیرِ لب سے نغمے برساتی ہوئی

ہر ادا میں اک ادا ہر ناز میں اک ناز ہے
یہ وہ فتنہ ہے کہ محشر بھی نظر انداز ہے

وہ تجلی جس کا پرتو پرتوِ جامِ شراب   وہ تبسم جس کی شوخی شوخیٔ عہدِ شباب
وہ نظر جس کے اثر میں بجلیوں کا اضطراب   وہ اثر جس کے جلو میں کاروانِ انقلاب

وہ تجلی وہ تبسم وہ جوانی وہ شباب
اور پھر اس پر قیامت یہ کہ بالکل بے حجاب

ریشمی ساری برہنہ سر جوانی کی اُمنگ   آنکھ میں مستی نظر میں کیف غمزوں میں ترنگ
خندۂ گل جلوۂ ماہِ مبیں حسنِ فرنگ   مسلکِ شرم و حیا سے جنگ، بیباکا رجنگ

مسکراتی لہلہاتی ہاتھ پھیلاتی ہوئی
آ رہی ہے مجمع عشاق میں گاتی ہوئی

چٹکیاں لیتی ہوئی آنکھوں کو مٹکاتی ہوئی | پھبتیاں کستی ہوئی مردوں کو شرماتی ہوئی
دیدہ و دانستہ ہر اک شے کو ٹھکراتی ہوئی | فرطِ مدہوشی سے خود بھی ٹھوکریں کھاتی ہوئی

حسن کج رفتار کی خدمت میں نظریں باریاب
انقلاب اے انقلاب اے انقلاب اے انقلاب

آہ اے عورت تری وہ پہلی سی غیرت کہاں | گوہرِ یکدانہ وہ لعل گراں قیمت کہاں
جس کو مریم چوم لے وہ دامنِ عصمت کہاں | دامنِ عصمت نہیں تو پھر تری عزت کہاں

اس کا کیا غم شان و شوکت چھن گئی دولت گئی
ہاں اگر غیرت گئی تو پھر بڑی نعمت گئی

اے کہ تو ناواقفِ انجام ہے مدہوش ہے | مجمع اغیار میں مصروفِ ناؤ نوش ہے
یہ نظارہ کیا بتاؤں کس قدر غم کوش ہے | میری آنکھوں میں لہو ہے اور لہو میں جوش ہے

تجھ کو میں اس حال میں دیکھوں نہیں ہرگز نہیں
دور ہو جا دور ہو اے لعنتِ دنیا و دیں

کشتۂ حرص و ہوا بیگانۂ عزت ہے تو | بے حیا بے شرم بد اخلاق بد فطرت ہے تو
اک سیہ کاری بہر پہلو بہر صورت ہے تو | صنفِ نازک کے لئے اک مستقل لعنت ہے تو

بھیگی بھیگی سی جبیں یہ بہکی بہکی سی نظر
ڈوب مرنا ہی مناسب ہے تجھے جا ڈوب مر

آہ اے بسمل یہ حال شہ جہاں آباد ہے | دیکھ کر جس کو مرا دل مائلِ فریاد ہے
خوفِ عقبیٰ ہے نہ فکر عالمِ ایجاد ہے | کیا کہا عورت جہاں ہے فطرتاً آزاد ہے

ہے مگر یوں دامنِ عصمت لٹانے کو نہیں
برق بن کر پارکوں میں جگمگانے کو نہیں

شئونِ علمیہ

سورج کی توانائی چاند پر

پچھلے نمبر میں جو کیفیت درج کی گئی ہے وہ زمین پر سورج کی توانائی سے متعلق تھی لیکن جس شخص نے ۱۹۱۱ء میں یہ پیش گوئی کی تھی کہ دورناتی (Television) اور راڈار (Radar) کی ایجاد ہونے والی ہے اس کو آج یہ خواب نظر آرہا ہے کہ چاند پر ایسے اسٹیشن قائم کردئے جائیں گے جہاں مشینیں سورج کی توانائی کو برق میں تبدیل کردیں گی جس سے چاند کی دھاتیں پگھلائی جاسکیں گی۔

وہ سوال کرتا ہے کہ برقیاتی کائنات (الکٹرونک یونیورس) سے ہم کو کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ

ایک تو برقیوں (الکٹروں) کے متعلق ہم کو نئی معلومات حاصل ہوں گی جس سے ہمارے علم میں اضافہ ہوگا۔ ہم کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ راست جوہر (ایٹم) سے ہم برقی اشعاع (الکٹرک ریڈیشن) حاصل کرسکتے ہیں۔ یہ بات ابھی تجربہ خانے کی حد تک ہے لیکن کل اسی کو تجارتی پیمانہ پر انجام دیا جاسکے گا۔

پھر آئندہ ہم سورج سے برقی توانائی حاصل کرسکیں گے۔ ممکن ہے کہ زمین پر یہ کام کچھ عرصہ تک نہ انجام دیا جاسکے کیونکہ ہمارا کرۂ ہوا اس میں مانع ہے۔ لیکن چاند پر ایسی کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

چونکہ چاند تک پہنچنے میں اب زیادہ دیر نہیں ہے اس لئے یہ یقینی ہے کہ ایسے آفتابی برقی اسٹیشن قائم کئے جائیں گے جن سے ہم کو تنی طاقت حاصل ہوسکے گی کہ ہم چاند کی دھاتوں کو کام میں لاسکیں۔ اس سے ہم کو روشنی حرارت اور دوسری چیزیں حاصل ہوں گی۔

لیکن وہ کہتا ہے کہ ہم کو سب سے زیادہ بھروسہ کونی شعاعوں (کاسمک ریز) پر ہے۔ یہ شعاعیں ناقابل یقین حد تک طاقتور ہوتی ہیں۔ ان کے اندر اتنی زبردست توانائی موجود ہے کہ یہ نہ صرف سارے کرۂ ہوا سے بآسانی گزر جاتی ہیں بلکہ زمین کے اندر بھی بہت دور تک نفوذ کرجاتی ہیں۔ چنانچہ زمین کی

سطح سے ایک میل کی گہرائی پر بھی ان شعاعوں کا پتہ لگا ہے چونکہ ہمارے کرہ کی تہ تک پہنچنے کے لئے ان شعاعوں کو تقریباً ۳ کھرب وولٹ کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں توانائی کا کتنا زبردست خزانہ پوشیدہ ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی یقینی ہے کہ یہ خزانہ ایک دن انسان کے کام میں آ کر رہے گا۔ جب وہ دن آئے گا تو ہماری زندگی بالکلیہ بدل جائے گی۔

سورج جو توانائی کا مرکز ہے اس سے بڑے زبردست پیمانے پر برقیے نکلتے ہیں جو زمین، چاند و دیگر سیاروں پر برابر برستے رہتے ہیں۔

زمین پر جس شخص کا وزن ۱۵۰ پونڈ ہے اس کا وزن چاند پر صرف ۴۰ پونڈ ہوگا۔

جب سورج سے برق حاصل ہوگی تو چاند کے معدنیات کو کام میں لایا جا سکے گا۔ یہ دھاتیں تیار کر کے فضائی جہازوں (اسپیس شپ) میں روانہ کر دی جائیں گی زمین پر چونکہ تجاذبی قوت کم ہے اسی لئے یہ جہاز تیرتے رہیں گے تاآنکہ زمین انھیں جذب کر لے گی۔ زمین کی معدنیات کے لئے چونکہ کھدائی زیادہ کرنی پڑتی ہے اس لئے چاند سے ان معدنیات کو حاصل کرنے میں زیادہ کفایت ہوگی۔

اب رہا یہ سوال کہ کتنی مدت میں یہ سب کچھ ہو سکے گا تو اندازہ کیا گیا ہے کہ ۱۰ تا ۲۰ برس میں یہ سب باتیں وقوع میں آ جائیں گی۔

کالی روشنی کچھ عرصہ کی بات ہے کہ چند سائنس داں اس کوشش میں تھے کہ بعض دھاتوں اور کیمیائی اشیاء کو جب برقایا جائے تو وہ روشنی دینے لگیں۔ ان کے تجربوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعض اشیاء سے ایسی شعاعیں منعکس ہونے لگیں جو انسانی آنکھ کو نظر نہ آتی تھیں۔

ان شعاعوں کو بالا بنفشئی شعاعوں (Ultraviolet Rays) کا نام دیا گیا بعد میں ان ہی شعاعوں کا عرف "کالی روشنی" پڑ گیا۔ روشنی دراصل ایک ارتعاش کا نام ہے جو بہت قصیر ہوتے ہیں لیکن کالی روشنی کے ارتعاش اور بھی قصیر تھے اس لئے نظر ان کا ادراک نہ کر سکی۔

ان شعاعوں سے غذائی اشیاء کی اصلاح، صحت کی حفاظت وغیرہ کا کام لیا جا رہا ہے جس کے لئے مختلف طریقے کام میں لائے جا رہے ہیں۔

تحقیق سے پتہ چلا کہ یہ کالی روشنی جب کسی شے پر ڈالی جاتی ہے تو اس کی صورت بدل جاتی ہے اور اس کے متعلق ایسی باتوں کا علم ہوتا ہے جو معمولی روشنی سے کبھی نہیں ہوتا۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ اگر شے پر ایسا مسالا لگا دیا جائے جو روشن ہو سکے تو کالی روشنی ڈالنے پر ان اشیاء سے دکھائی دینے والی روشنی نکلنے لگتی ہے۔

ان خاصیتوں سے فائدہ اٹھا کر کالی روشنی کو صنعت میں استعمال کیا جا رہا ہے اور ایسے میدانوں میں اس سے کام لیا جا رہا ہے جو ہماری زندگی کو متاثر کرتے ہیں۔

چنانچہ غذائی جانچ کرنے والے ایک تجربہ خانے میں ان کالی شعاعوں کی بدولت معلوم ہوا کہ جس روغن کو خالص روغن زیتون بتلایا گیا اس میں روغن بنولہ موجود ہے۔ خالص روغن زیتون سے جو روشنی ان شعاعوں کے زیر اثر نکلتی ہے وہ سبزی مائل ہوتی ہے جب اس سے نیلی دمک خارج ہوتی تو معلوم ہوا کہ اس میں بنولہ کے تیل کی آمیزش ہے۔

ایک کمپنی نے ایک مرکب تیار کیا جس کے متعلق دعویٰ کیا گیا کہ اس میں حیاتین شامل ہیں لیکن اس کے ذائقہ کے متعلق شکایتیں وصول ہوئیں تو مرکب پر بالا نفشئی شعاعیں ڈالی گئیں تو مرکب سے جو دمک نکلنا چاہئے تھی نہیں نکلی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ترکیب میں خامی ہے لہذا اس کی اصلاح کی گئی اور اس طرح ہزاروں کے نقصان سے کمپنی بچ گئی۔

کپڑے کی صنعت میں بھی اس کالی روشنی سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ایک کمپنی نے اپنے تیار کردہ کپڑے کا امتحان کیمیائی طریقہ سے کرایا تو اس میں کوئی نقص نہیں نکلا لیکن جب کالی روشنی سے جانچ کی گئی تو پتہ لگا کہ کپڑے کی رنگائی میں نقص رہ گیا ہے چنانچہ کپڑے کو دوبارہ رنگا گیا تو اس سے وہ نقص دور ہوا۔ اور کپڑے کی پائداری میں اضافہ ہو گیا۔

تبصرے

پاکستان کے چند انگریزی اسلامی رسالے

جیسا کہ توقع تھی آج کل پاکستان میں اسلامی ثقافت مذہب اور اسلامی روایات و آثار سے تعلق اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی مجلات و رسائل کی اشاعت کی بڑی گرم بازاری ہے۔ اسلامی ثقافت کے احیا اور اس کی تنظیم جدید کے مقصد کے پیش نظر نئی نئی سوسائٹیاں اور انجمنیں بن رہی ہیں اور اس مقصد کی تکمیل و اشاعت کی غرض سے اپنے اپنے آرگن نکال رہے ہیں آج ہم قارئین کرام سے ان میں سے بعض اہم مجلات کا تعارف کراتے ہیں۔

دی اسلامک لٹریچر

یہ غالباً پاکستان کا سب سے پہلا ماہنامہ ہے جو لاہور کے مشہور تاجر و ناشر کتب جناب محمد اشرف صاحب کے زیر اہتمام و انتظام نکل رہا ہے ضخامت کم و بیش ڈیڑھ سو صفحات ہوتی ہے۔ گٹ اپ بہت خوبصورت اور جاذب نظر، ٹائپ متوسط درجہ کا اور کاغذ اعلیٰ قسم کا مٹیالا ہوتا ہے قیمت فی کاپی ایک روپیہ پتہ:- شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور

اس رسالہ میں عموماً بلند پایہ مضامین و مقالات ہوتے ہیں جو اسلامیات سے متعلق ہوتے ہیں اس حیثیت سے ہم اسکو اسلامک کلچر حیدرآباد کا مثنیٰ کہہ سکتے ہیں اس رسالہ کی جنوری ۱۹۵۳ء کی اشاعت صرف ایک ہی عنوان یعنی "اسباب زوال امت" پر دو مضمونوں کے لئے مخصوص کر دی گئی تھی یہ دو مقالات علی الترتیب ہنگری میں بوڈاپسٹ یونیورسٹی کے پروفیسر عربی حاجی ڈاکٹر عبدالکریم اور پاکستان کی ایک خاتون کے قلم سے ہیں دونوں مقالہ نگاروں نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے ماتحت اسلامی تاریخ و روایات اور اسلامی فلسفہ و سیاسیات کی روشنی میں مسلمانوں کے زوال و انحطاط کے اسباب کا جائزہ لیا ہے اور ان کے تدارک کی صورتوں کی طرف اشارہ کیا ہے قارئین کی سہولت کے لئے فاضل اڈیٹر

نے شروع میں ہی دونوں مقالات کا خلاصہ دے دیا ہے اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کر دی ہے۔ اگرچہ مصنف کی طرح ہم کو بھی ان دونوں مقالات کے بعض اجزا سے اتفاق نہیں ہے علی الخصوص ان اجزا سے جو احادیث کی صحت و استناد سے یا اسلام میں عورتوں کی حیثیت۔ تعدد ازدواج یا تقدیر وغیرہ سے متعلق ہیں تاہم اس میں شبہ نہیں کہ دونوں مقالات غور و فکر اور محنت و تلاش سے لکھے گئے ہیں اور اس لحاظ سے اس قابل ہیں کہ ان کا مطالعہ کیا جائے۔ اسلامی تاریخ و فلسفہ کے ایک طالب علم کو غور و فکر کرنے کے لئے ان میں کافی مواد مل سکتا ہے اس خاص نمبر کے علاوہ اسلامک لٹریچر کی ہر اشاعت بھی اس لائق ہوتی ہے کہ ارباب ذوق اس کا مطالعہ کریں اور اس سے فائدہ اٹھائیں۔

یقین

یہ دار التصنیف لمیٹڈ کراچی کا پندرہ روزہ رسالہ ہے جس کے اب تک اکیس نمبر نکل چکے ہیں اس کا مقصد اسلام کو قرآن و سنت کی روشنی میں پیش کرنا اور ناواقفوں کو اسلام کی تعلیمات اور اس کے افکار سے واقف کرنا ہے۔ اب تک یقین کے جتنے نمبر ہماری نظر سے گذرے ہیں ان کے پیش نظر یہ بوثوق کہا جا سکتا ہے کہ رسالہ اپنے مقصد میں کامیاب ہے اور دوسرے مقالات و مضامین کے علاوہ جو مختلف اربابِ قلم کے لکھے ہوئے ہوتے ہیں خود لائق اڈیٹر اور دوسرے ارکانِ ادارت کے لکھے نوٹ اور افتتاحیے بھی دلچسپ، مفید اور موثر ہوتے ہیں، امید ہے کہ انگریزی داں اصحاب اس کی توسیع اشاعت میں حصہ لے کر ثواب دارین حاصل کریں گے۔

مغربی پاکستان میں اس کی قیمت سالانہ چار روپیہ اور مشرقی بنگال میں بذریعہ ہوائی جہاز پانچ روپیہ آٹھ آنہ۔ فی کاپی ۲ر پتہ :۔ دار التصنیف لمیٹڈ کراچی

صوت الاسلام

انگریزی میں اس کا نام Voice of Islam ہے۔ یہ ابھی حال میں کراچی سے جناب محمد فضل الرحمٰن صاحب انصاری کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا ہے کہ ایک

"مسلمانوں کی خاص تعلیمی مشکلات" خاص طور پر مفید۔ پُر از معلومات اور ولولہ آفریں ہیں یہ ماہنامہ جمعیۃ الفلاح کا آرگن ہے اس بنا پر اس کی ہر اشاعت میں جمعیۃ کی سرگرمیوں اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں اس کی کوششوں کا بھی تذکرہ ہوتا ہے تعداد صفحات ۸۰ قیمت سالانہ دس روپیہ پاکستان میں اور بیرونی ممالک میں ایک پونڈ دس شلنگ پتہ:۔ اے۔ ایم نمبر ۲۰ کراچی۔

طبقات ناصری تقطیع متوسط کتابت و طباعت بہتر۔ ضخامت ۲۳۰ صفحات قیمت تین روپیہ بارہ آنہ پتہ:۔ کتاب خانہ نورس۔ کبیر اسٹریٹ۔ اردو بازار لاہور

طبقات ناصری جو سلطان ناصر الدین محمود بن سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں ۶۵۸ھ میں مولانا منہاج سراج کے قلم سے مکمل ہوئی تھی اسلامی ہند کے ابتدائی عہد کی مشہور و مستند تاریخی کتاب ہے، جس میں اس سال تک کے عالم اسلام کے تمام اہم واقعات کا تذکرہ ہے یہ کتاب تیئیس ۲۳ طبقات پر مشتمل ہے جن میں سے ہر طبقہ میں ہر حکمران خاندان کے حالات الگ الگ بیان کئے گئے ہیں، یہ کتاب سب سے پہلی بار بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے ۱۸۶۴ء میں شائع کی تھی لیکن ایک مدت سے یہ مطبوعہ نسخہ ناپید ہے اس بنا پر ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے اس کتاب کے پانچ طبقات جن کا تعلق ہند اور پاکستان کی تاریخ سے ہے ان کو آج کل کے طریقہ کے مطابق اڈٹ کر کے شائع کیا ہے موصوف نے شروع میں ایک مختصر مقدمہ لکھا ہے جس میں مولانا منہاج سراج کے حالات ہیں اور آخر میں اعلام و امکنہ کی فہرستیں دی ہیں اس کے علاوہ متن کتاب میں جا بجا حواشی کے ذریعہ مختلف الفاظ کی تصحیح یا تشریح کی ہے امید ہے کہ ارباب علم و ذوق اس کتاب کی قدر کر کے لائق مرتب کی محنت و سعی کی داد دیں گے۔

آہنگ از جناب مجاز۔ کتابت و طباعت اور کاغذ اعلیٰ ضخامت ۲۱۶ صفحات قیمت مجلد للعہ، چار روپیہ آٹھ آنہ پتہ:۔ آزاد کتاب گھر کلاں محل۔ دہلی

جناب مجاز اردو کے ان ترقی پسند شاعروں میں ہیں جن کو پرانے جام میں بادۂ نو کو پیش کرنے کا بہت عمدہ سلیقہ ہے اور جن کا کلام "ادب برائے زندگی" کا مظہر ہونے کے ساتھ ساتھ "زندگی برائے ادب" کا بھی ترجمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام بزم اور رزم دونوں موقعوں پر پڑھا جا سکتا ہے

اور فردوس گوش نغمہ اور طبل جنگ دونوں کا کام دے سکتا ہے۔ مجاز کی اصل فطرت میں محبت کی نیازمندی، عشق کا سوز و گداز اور الفت کی خود سپردگی پائی جاتی ہے لیکن جب ان کی نیازمندی کو غرورِ حسن سے سابقہ پڑتا ہے تو یک بیک یہ نیازمندی ناز کی سرکشی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور اب مجاز کی زبان سے میٹھے اور رسیلے نغموں کے بجائے غیظ و غضب اور انتقام کی چنگاریاں برسنے لگتی ہیں۔ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب کہ وہ ایک انقلابی شاعر کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں بہرحال زیرِ تبصرہ کتاب جو مجاز کے کلام کا مجموعہ ہے اسی طرح کے نشیب و فراز اور اتار چڑھاؤ سے پُر ہے اور اس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے اور اس سے لطف اٹھایا جائے۔　　　　(س)

شانِ محفل تقطیع $\frac{۲۰×۳۰}{۱۶}$ صفحات ۱۲۸، کتابت طباعت متوسط قیمت: مندرجہ دو روپے

"شانِ محفل" منشی رگھوناتھ سنگھ ہاجر دہلوی کی غزلیات کا مجموعہ ہے جس کو ان کے لائق صاحبزادے جناب کویراج رگھنندن سنگھ ساحر نے شائع کیا ہے، پیش لفظ اردو کے مشہور و معروف محسن پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی نے تحریر فرمایا ہے اور دراصل یہ چند سطور ہی اس "گلدستہ غزلیات" کی عمدگی کی ضمانت کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔

کیفی صاحب نے ہاجر کا تعارف ان الفاظ میں کرایا ہے

"ہاجر اگرچہ بہت پرانے آدمی نہیں ان کے انتقال کو قریباً تیس برس ہوئے ہوں گے مگر اس عرصے میں جو انقلاب دہلی اور ہندوستان کی معاشرت میں ہوئے اور جنہوں نے ادب اور شاعری کی کایا ہی پلٹ دی، انھیں سب جانتے ہیں ادب کی قدریں آج وہ نہیں جو بیس برس پہلے تھیں شاعری کا رنگ اب وہ نہیں ہے جہاں اسے داغ اور امیر نے چھوڑا تھا اس لئے "شانِ محفل" کو آج کل کی کسوٹی پر کسنا نقاد کی بدمذاقی کا ثبوت ہوگا دیکھنا تو یہ ہے کہ جس کلچر کی جناب ہاجر پیداوار تھے اس کے معیار کو سامنے رکھ کر ان کے کلام کا درجہ کیا ہے، چنانچہ ایسا کیا جائے تو "شانِ محفل" کو بہت اونچی جگہ دینی ہوگی۔"

ہاجر کے کلام میں سلاست و شگفتگی، بندشوں کی چستی اور اسلوب بیان کی فصاحت، مختلف خوبیوں کے نمونے ملتے ہیں اور انھوں نے حسن و عشق، وصل و ہجر، شاہد و شراب، گل و بلبل اور طاؤس و

رباب کی پرانی داستانوں کے جسم میں خونِ تازہ دوڑانے کی کوشش کی ہے،

عام اندازِ بیان ملاحظہ ہو

مجھ سے کیا پوچھتا ہے اے زاہد دیکھ لے تو بھی مے کشی کر کے
کوئی مجھ سا نہ پارسا ہوگا توبہ کرتا ہوں مے کشی کر کے

کچھ سبب معلوم ہو تب تو کہوں پوچھتے ہیں لوگ کیوں مغموم ہے
بے وفاؤں سے وفا کرتے رہو عاشقی کا کیا یہی مفہوم ہے

آہ کیسی ہے رات فرقت کی جاگتا ہوں نصیب سوتا ہے
چھوڑ کر دل آپ جاتے ہیں کہاں یہ مکاں آباد رہنا چاہئے

ایک ایسے دور میں جب کہ ہندو مسلمانوں کے ملے جلے کلچر کی سب سے روشن اور نکھری ہوئی نشانی کے حلقوم پر فرقہ پرستی کے کند خنجر چلائے جا رہے ہیں اس طرح کے مجموعوں کی اشاعت ہمارے خیال میں ملک کے مستقبل کے لئے فالِ نیک ہے۔ (ع)

فلسفہ کیا ہے؟

یہ ملک کے مشہور فاضل اور جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کے شعبۂ فلسفہ کے صدر ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم۔اے۔ پی۔ایچ۔ڈی صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ و رفیق اعزازی ندوۃ المصنفین کے قیمتی مقالات کا مجموعہ ہے۔۔

ہیگل کا قول ہے کہ

"جس مہذب قوم کا فلسفہ نہیں ہوتا اس کی مثال ایک عبادت گاہ کی سی ہے جو ہر قسم کی زیب و زینت سے آراستہ ہے مگر جس میں "قدس الاقداس" ہی کا وجود نہیں"

ڈاکٹر صاحب کے مقالات پڑھ کر آپ نہ صرف اپنے فلسفہ سے باخبر ہو جائیں گے بلکہ اپنے آپ کو روحانیت کے حصنِ حصین میں محفوظ پائیں گے۔ مقالات کے چند بڑے بڑے سرنامے ملاحظہ فرمایئے قرآن اور فلسفہ، فلسفہ کیا ہے؟ ہم فلسفہ کیوں پڑھیں، فلسفہ کی دشواریاں۔ قیمت عہ، مجلد عا

قصص القرآن جلد چہارم حضرت عیسیٰؑ
و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور
متعلقہ واقعات کا بیان۔ دوسرا ایڈیشن جس میں
ختم نبوت کے اہم اور ضروری باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔
قیمت چھ روپے آٹھ آنے ہے مجلد سات روپے آٹھ آنے للعہ

اسلام کا اقتصادی نظام وقت کی اہم ترین
کتاب جس میں اسلام کے نظام اقتصادی کا مکمل نقشہ پیش
کیا گیا ہے چوتھا ایڈیشن۔ قیمت … مجلد …

اسلام کا نظام مساجد۔ قیمت … مجلد …

مسلمانوں کا عروج و زوال:-
جدید ایڈیشن۔ قیمت … مجلد …

مکمل لغات القرآن مع فہرست الفاظ
لغت قرآن پر بے مثل کتاب۔ جلد اول طبع دوم
قیمت … مجلد …
جلد ثانی قیمت … مجلد …
جلد ثالث قیمت … مجلد …
جلد رابع (زیر طبع)

مسلمانوں کا نظم مملکت مصر کے مشہور مصنف
ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن کی محققانہ کتاب النظم الاسلامیہ
کا ترجمہ۔ قیمت … مجلد …

ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت
جلد اول:- اپنے موضوع میں بالکل جدید کتاب
قیمت چار روپے للعہ مجلد پانچ روپے صہ
جلد ثانی:- قیمت چار روپے للعہ مجلد پانچ روپے صہ

قرآن اور تصوف حقیقی اسلامی تصوف پر
محققانہ کتاب۔ قیمت … - مجلد …

ترجمان السنہ جلد اول۔ ارشادات نبوی کا
بے مثل ذخیرہ۔ قیمت … مجلد …

ترجمان السنہ جلد دوم۔ اس جلد میں چھ سو کے
قریب حدیثیں آگئی ہیں قیمت … مجلد …

تحفۃ النظار یعنی خلاصہ سفرنامہ ابن بطوطہ
مع تنقید و تحقیق از مترجم و نقشہائے سفر قیمت …

قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات
قرون وسطیٰ کے حکمائے اسلام کے شاندار علمی کارنامے
جلد اول۔ قیمت … مجلد …
جلد دوم قیمت … مجلد …

عرب اور اسلام:-
قیمت تین روپے آٹھ آنے … مجلد چار روپے آٹھ آنے للعہ

وحی الٰہی
مسئلہ وحی اور اس کے تمام گوشوں کے بیان پر پہلی
محققانہ کتاب جس میں اس مسئلہ پر ایسے دل پذیر
انداز میں بحث کی گئی ہے کہ وحی اور اس کی صداقت
کا ایمان افروز نقشہ آنکھوں کو روشن کرتا ہوا دل کی
گہرائیوں میں سما جاتا ہے۔
جدید ایڈیشن قیمت … مجلد چار روپے

مینیجر ندوۃ المصنفین۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

REGISTERED NO. D. 183

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسن خاص جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین جو حضرات پچیس روپئے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلا کسی معاوضہ کے پیش کیا جائیگا۔

۳۔ معاونین :۔ جو حضرات اٹھارہ روپئے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا انکی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپئے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ احبّاء نو روپئے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبّاء میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دی جائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ بُرہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ر تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ر تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہیے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپئے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپئے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

جلد نمبر ۳۰ — شمارہ نمبر ۴

اپریل ۱۹۵۳ء مطابق رجب المرجب ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

ہماری زبان اردو بھی کچھ عجیب تقدیر لے کر پیدا ہوئی ہے۔ کبھی بنتی ہے اور کبھی بگڑتی ہے۔ کبھی ڈوبتی اور کبھی ابھرتی ہے ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد اس پر ایک وقت آیا تھا جب کہ سر سید احمد خاں مرحوم نے ریڈیکل کے نام سے عربی اور فارسی کی سرے سے تعلیم کی ہی مخالفت میں مضامین لکھے تھے اور مسلمانوں کی عام پستی و زبوں حالی کا سبب اسی طرزِ قدیم کی تعلیم کو قرار دیا تھا۔ اسی زمانہ میں موصوف کے بعض رفقا کو اُپج سوجھی تو انھوں نے اردو کے خلاف آواز اٹھائی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ اس زبان کو ترک کر کے یورپ کی کسی زبان خصوصاً انگریزی کو اپنی زبان بنا لینا چاہئے اور پھر لطف یہ ہے کہ ڈاکٹر مرزا محمد ہادی لکھنوی کے بقول یہ مشیرِ مشفق نہ انگریزی کی ابجد سے واقف تھے اور نہ کسی اور یورپین زبان سے یہی وہ دور تھا جب کہ ایک طرف قدیم تعلیم یافتہ طبقہ فارسی اور عربی میں خط و کتابت کرنے کے بجائے اردو کو شایستہ اعتنا نہیں سمجھتا تھا اور دوسری جانب جدید تعلیم کے لوگ انگریزی چھوڑ کر اردو میں گفتگو کرنے کو اپنے لئے ننگ و عار جانتے تھے لیکن اردو نے بڑی سخت جانی کے ساتھ ان حوادث و آفات کا مقابلہ کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو جو پہلے محض شعر و شاعری اور افسانہ و داستان سرائی کی زبان تھی ترقی کرتے کرتے ایک نہایت وسیع۔ موقر۔ ہمہ گیر اور علمی زبان بن گئی۔

ایک انقلابِ عظیم کے طوفان سے کامیابی کے ساتھ گذر جانے کے بعد آج پھر اس زبان پر ایک نازک دور آیا ہے جب کہ وہ اپنے دیس میں پردیسی اور اپنے وطن میں بے وطن ہو گئی ہے اس کے بعد توقع تھی کہ اسلام کے نام پر ایک اسٹیٹ بنی ہے وہاں اس کو پہنچنے۔ ابھرنے اور ترقی کرنے کی سہولتیں ملیں گی اور اس طرح اس کو جو چوٹ یہاں لگی ہے اس کی تلافی دوسری جگہ ہو جائے گی لیکن رموزی کے بقول وہاں بھی اس کا حال "بہر زمیں کہ رسیدیم آسماں پیداست" کا مصداق بنا ہوا ہے اور اب تک سے وہاں دلجمعی کے ساتھ بیٹھنا اور جمنا نصیب نہیں ہوا ہے اس ریاست کے ایک حصہ میں جو اس کا مشرقی بازو ہے وہاں تو اس زبان کی مخالفت کا یہ جوش و خروش ہے کہ اس کا نام سننا تک بھی طبعِ نازک پر گراں ہے رہ گیا اس ریاست کا دوسرا حصہ جو مغربی پاکستان کہلاتا ہے اور جو پہلے

حصہ کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ ۔ مہذب اور شائستہ ہے وہاں ایک طبقہ ایسا پیدا ہوگیا یا پہلے سے موجود ہے جو ریاستی معاملات میں ٹرکی کے نقش قدم پر چلنے کو ریاست کی ترقی کے لئے ضروری اور لازمی یقین کرتا ہے اس طبقہ کا قبلۂ مقصود ٹرکی یا مشرق وسطیٰ کی بعض اور مسلمان حکومتیں ہیں ۔ اس بناء پر اس طبقہ کا خیال ہے کہ پاکستان کی بھلائی اسی میں ہے کہ مغربی تہذیب و تمدن کو اختیار کر لیا جائے اور اردو کے بجائے انگریزی کو ہی ریاستی زبان کی حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے ۔

اسی سلسلہ میں ہمارے فاضل اور عزیز دوست لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب جن سے قارئین برہان اچھی طرح واقف ہیں ۱۸ مارچ کے سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور میں موصوف کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا سب سے بڑا عنوان ہی یہ ہے کہ "مسلمانوں کی پستی کا سبب اردو ہے" موجودہ عبوری دور میں بھی پندرہ بیس برس تک انگریزی کو دفتری زبان کی حیثیت سے باقی رہنا چاہئے یا نہیں ؟ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہنا چاہتے البتہ جناب موصوف نے اپنے مذکورۂ بالا مقالہ میں "برہان" اور "معارف" کے بعض مضامین کا تذکرہ کرنے کے بعد اردو زبان کی نسبت جو بعض خیالات ظاہر کئے ہیں ان کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں ۔

ہمارے فاضل دوست کو اردو زبان پر سب سے بڑے اعتراضات دو ہیں ایک یہ کہ اردو اڈمنسٹریشن کی زبان نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ اس زبان کا سرمایہ ادب شعر و شاعری ۔ افسانہ و ناول ۔ اور تاریخ و مذہب پر ہی مشتمل ہے اس میں جدید علوم و فنون کا کوئی ذخیرہ نہیں ہے ۔ امر اول کی نسبت گذارش یہ ہے کہ انگریزوں کے عہد سے پہلے ہندوستان کی عدالتی اور دفتری زبان فارسی تھی اور پھر اردو ہوگئی تھی ۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر گلکرسٹ نے فورٹ ولیم کالج میں اردو میں تراجم کا ایک مستقل محکمہ قائم کیا تھا اور خود کمپنی کے عہد میں ہی اردو زبان کی ہمہ گیری کا یہ عالم تھا کہ کلکتہ کے مڈیکل کالج میں امتحانات کے پرچے اردو میں ہوتے تھے تو پھر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں چونکہ اردو عدالتی اور دفتری زبان تھی اس بناء پر اس زمانہ کا اڈمنسٹریشن ناقص اور نامکمل تھا ۔ اور دور کیوں جائیے ابھی کل کی بات ہے ریاست حیدرآباد دکن جو ہندوستان کی بہترین ترقی یافتہ ریاست تھی وہاں کے تمام دفتری اور سرکاری معاملات ۔ احکام و فرامین وغیرہ اسی اردو زبان میں ہوتے تھے پس اگر اس زبان میں اڈمنسٹریشن کی زبان بننے کی صلاحیت نہیں تھی تو پھر حیدرآباد نے علمی ۔ تہذیبی و تمدنی اور دفتری حیثیت سے اس قدر شاندار ترقی کس طرح کی ۔

رہ گئی دوسری بات ! تو ہمارے لائق دوست کو معلوم ہونا چاہئے کہ آج عالم اسلام میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک ٹرکی ۔ مصر اور ایران ہی سمجھے جاتے ہیں اور ان تینوں ملکوں نے مغربی تہذیب و تمدن کو پورے طور پر اختیار بھی کر لیا ہے ۔ لیکن ترکی زبان سے ہم واقف نہیں ہیں اس بناء پر اس کی نسبت کوئی

بات وثوق سے نہیں کہہ سکتے۔ البتہ مصر اور ایران کے جدید سرمایۂ ادبیات اور ذخیرۂ علوم وفنون سے ہم واقف ہیں اور اس بناء پر وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ جہاں تک جدید علوم وفنون کا تعلق ہے یہ دونوں ملک بھی ابھی تک تراجم کی حد سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں اور طبعی طور پر ابھی ان کو بڑھنا بھی نہیں چاہیے" جہاں تک جدید علوم وفنون میں طبعزاد تصانیف اور تحقیقات کا تعلق ہے بحیثیت مجموعی وہ عربی اور فارسی میں ناپید ہیں اور اردو میں بھی! رہ گئے تراجم! تو واقعہ یہ ہے کہ اس لحاظ سے اردو کا قدم عربی اور فارسی سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے یہ معلوم کرنے کے لئے زیادہ زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ مطبوعات مصر وایران کی فہرستوں کے ساتھ ساتھ دار الترجمہ حیدر آباد دکن۔ انجمن ترقی اردو اور بعض اداروں کی مطبوعات کی فہرست پر بھی ایک نگاہ ڈال لینا کافی ہوگا! پھر جہاں تک فنی بصیرت ومہارت کا تعلق ہے تو ہماری رائے میں معیار تحقیق۔ فنی ژرف نگاہی اور علمی ذہانت وطباعی کے لحاظ سے بھی ہندوستان کے مسلمان مصر وایران سے آگے ہیں ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان۔ ڈاکٹر سر ضیاء الدین۔ ڈاکٹر ولی الدین۔ ڈاکٹر اقبال ڈاکٹر ظفر الحسن۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی کیا کسی اسلامی ملک میں آج ان کا جواب موجود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی پستی آج کل کی زبان میں ایک سخن تکیہ بن گیا ہے ورنہ کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ہندوستان کے مسلمان عوام غریب اور جاہل ہیں اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ بدتر مصر وایران، عراق وشام وفلسطین کے مسلمان عوام غریب اور جاہل ہیں لیکن جہاں تک تعلیم یافتہ طبقہ کا تعلق ہے تو واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے انگریزوں کے عہد میں اپنی غلامی کے باوجود پچاس ساٹھ سال میں وہ کچھ کر کے دکھایا جو نامور اسلامی ممالک اپنی آزادی کے باوجود کر کے نہیں دکھا سکے۔

انگریزی زبان کی اہمیت اور ضرورت اور اس کی بین الاقوامی اور علمی عظمت وبرتری سے انکار نہیں اور اس بنا پر ہند اور پاکستان کے مسلمانوں کے لئے اس زبان سے غفلت برتنا انتہائی نقصان رساں ہوگا لیکن برائے شگون اپنی ناک کٹانا کوئی عقلمندی نہیں ہے انگریزی کی اہمیت وضرورت جتانے کے لئے یہ آخر کیوں ضروری قرار دے لیا گیا ہے کہ اردو کا جو اصل مقام ہے اس سے ہی انکار کر دیا جائے اور مسلمانوں کی پستی کا سبب اسی کو بتایا جائے۔

کس لئے؟

از

(حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی)

ہستی کا یہ نظام محسوس جس میں ہم (یعنی بنی آدم) بھی شریک ہیں، اسی کے متعلق عموماً انسانی فطرت میں اس قسم کے بنیادی سوالات جو اٹھتے رہتے ہیں مثلاً یہی کہ اس کی ابتداء کیا ہے، انتہاء کیا ہے اسی سلسلہ کا آخری سوال یہ بھی ہے، کہ آخر یہ جو کچھ بھی ہے اس کا مدعا کیا ہے؟

اپنی کتاب "الدین القیم" کے پہلے حصہ میں اس آخری سوال کے سوا تقریباً ان تمام سوالوں کے ان جوابوں کو بیان کر چکا ہوں جن پر اسلام کے علمی اور فکری نظام کی بنیاد قایم ہے، عام طور پر ان ہی کی تعبیر لوگ "عقاید" کے لفظ سے کرتے ہیں، مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں کیا جاننا اور کیا ماننا چاہیئے گویا اسی سوال کا جواب کتاب کے اس پہلے حصہ میں دیا گیا تھا۔ متعدد بار مختلف مقامات میں یہ کتاب چھپ چکی ہے۔ اور متعلقہ حلقوں میں کافی روشناس ہو چکی ہے۔

لیکن اسلام کے عملی نظام یعنی ایک مسلمان کو دینی حیثیت سے کیا کرنا چاہیئے جو اسی آخری سوال مدعاء کیا ہے؟ اسی سوال کا گویا جواب ہے، وعدہ کیا تھا کہ اس کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصہ میں کی جائے گی لیکن ایفاء عہد کا موقعہ ہی نہیں مل رہا تھا، اب اپنے خاص کرم فرما مولانا عتیق الرحمن مدیر "برہان" (ایدہ اللہ بروح منہ) کے اصرار بلیغ سے قلم اٹھا لیا گیا ہے۔ تاکہ اس پرانے وعدہ کو پورا کیا جائے۔ نہیں جانتا کہ "اجل مسمیٰ" میں اتنی گنجائش باقی بھی رہ گئی ہے یا نہیں کہ جو کچھ ارادہ کیا گیا ہے وہ پورا ہوگا، بہرحال حق سبحانہ وتعالیٰ ہی کی طرف سے توفیق رفیق ہو سکتی ہے اس کی مشیت ہوگی، تو کام ختم ہوگا، ورنہ

گر بہ میریم عذر ما بہ پذیر — اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

طے یہی کیا گیا ہے کہ جیسے جیسے مسودہ قلم بند ہوتا جائے قسط وار مجلہ برہان میں وہ شائع ہوتا رہے کام شروع کیا جاتا ہے وَالْاِتْمَامُ عَلَی اللّٰہِ تعالیٰ وھُوَ حسبی ونعم الوکیل

کس لئے؟ کے اس عنوان کا ... مضمون کی پیشانی پر درج کیا گیا ہے، مطلب اس کا یہی ہے کہ یہ آسمان و زمین، ہوا، مٹی، پانی، جمادات و نباتات و حیوانات، انسان، الغرض وہ سب کچھ جو ہمارے سامنے ہے اس کی پیدائش و آفرینش کا مدعا کیا ہے؟ اسی سوال کا جواب دیا جائے، اور بتایا جائے کہ قدرت کے کس نصب العین کی تکمیل ان کے وجود سے ہوتی ہے،

اس سلسلہ کی سب سے پہلی دلچسپ بات تو یہی ہے کہ کائنات کی ان طویل و عریض صفوں کے درمیان سے اگر بنی نوع انسانی کو باہر نکال لیا جائے یعنی بنی آدم کے سوا دنیا کے دوسرے ماوراء انسانی حقائق و موجودات کے متعلق کس لئے کے اسی سوال کو اٹھا کر اگر پوچھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جواب گویا ان میں سے ہر ایک کے منہ پر رکھا ہوا ہے۔

آدمی کے سوا آپ دنیا کی کسی چیز کو بھی اٹھا لیجئے، ہوا ہی کو لیجئے، پانی ہی سے پوچھئے آگ ہی سے دریافت کیجئے، آپ کے سامنے ان میں سے ہر ایک اپنے وجود کے منافع کی ایک طویل فہرست لے کر کھڑی ہو جائے گی، ؟ ان اشیاء کی افادیت کا پہلو اتنا واضح اتنا بیّن اور روشن ہے کہ اس پر بحث کرنے کی بھی ضرورت نہیں، کون نہیں سمجھتا کہ صرف ہوا ہی کا عنصر اگر فضائی احاطہ سے باہر نکال لیا جائے، یا پانی ہی کا ذخیرہ کرۂ زمین پر ختم ہو جائے، تو ساری جان رکھنے والی ہستیاں پھڑ پھڑا کر اسی وقت دم توڑ دیں گی عالم کا سارا نظام ہی درہم و برہم ہو کر رہ جائے گا۔ زندگی کی ان ناگزیر ضرورتوں کے سوا کائنات کے اسی دائرہ میں بڑا ذخیرہ ایسی چیزوں کا بھی ہے جن کے متعلق تجربہ مسلسل یہی ثابت کرتا چلا آرہا ہے کہ کل تک جو قطعاً نکمی اور بے کار سمجھی جاتی تھیں پوچھنے والے ان ہی سے جب پوچھتے رہے کہ تو کس لئے ہے، تو دیکھا گیا کہ فوائد و مصالح کے سمندر ان ہی سے امنڈ پڑے، آخر شکم زمین کا یہی سڑا ہوا بدبو، متعفن، سیال مادہ جسے پٹرول یا عوام مٹی کا تیل کہتے ہیں. کل اسی غریب کا کیا حال تھا، سر پیٹ لیتا ہو گا جس بدقسمت کے کنوئیں میں بجائے پانی کے یہی مٹی کا تیل اُبل پڑتا ہو گا

لیکن زمین کے پیٹ کا یہی گندہ، غلیظ ذخیرہ کون نہیں جانتا کہ آج حکومتوں اور سلطنتوں کے بازوؤں کی سب سے بڑی قوت، اور طاقت بنا ہوا ہے، تعمیری کارروائیاں ہوں یا تخریبی، سب کی روح رواں آج یہی سڑا ہوا متعفن، بدبو یانی بنا ہوا ہے یا چند صدی پہلے ان کالے کلوٹے پتھر کے ڈھیلوں کی کیا قدر و قیمت تھی، جنہیں ہم پتھر کا کوئلہ کہتے ہیں مگر آج معدن زغال سے نکلنے والے یہی سیاہ پتھر اور ان کے ٹکڑے انسانی تمدن و عمران کے جوہری ستون بنے ہوئے ہیں، صنعتی سرگرمیاں، میکانیکی اولوالعزمیاں عموماً ان ہی کی رہین منت ہیں، ریلیں ان ہی کے بل بوتے پر دوڑائی جارہی ہیں، فیکٹریوں کا سارا زور و شور ان ہی کے دم قدم سے قایم ہے، اور زندگی کے جن جن گوشوں میں ان سے کام لیا جارہا ہے اس سے کون ناواقف ہے،

سچ تو یہ ہے کہ جنگل کی گری پڑی جڑی بوٹیاں آج ہی نہیں، تاریخ کے نامعلوم زمانے سے مسلسل یہی سبق پڑھاتی چلی جارہی ہیں کہ

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

مشاہدہ بتارہا ہے کہ کائنات کی حقیر سے حقیر شے، صرف اسی وقت تک بے کار رہتی ہے جب تک کہ کام لینے والوں نے اس سے کام نہیں لیا لیکن پوچھنے والوں نے جب کبھی ان کے سامنے کس لئے؟ کے اسی سوال کو پیش کیا دیکھا گیا کہ امرت کے دھارے اور آب حیات کے سرچشمے اسی سے پھوٹ پڑے کیمیاگر تو ان ہی کے منہ سے سونا اگلوا تے ہیں، اطباء ان ہی کے اندر انسانی زندگی کی ضمانت سمجھتے ہیں کہ مستور ہے، طرفہ تماشا یہی ہے کہ کس لئے کا یہی سوال جس کے جواب سے ماورا انسانی موجودات گویا لب ریز نظر آتے ہیں فقط چھیڑنے کی ضرورت ہے، کہ جواب کے لئے معلوم ہوتا ہے ان میں ہر ایک مضطرب اور بے چین تھا، نغموں سے جیسے ستار کے تار معمور ہوتے ہیں زخمہ کی چوٹ لگی نہیں کہ وہ گنگنا اٹھتے ہیں، کچھ یہی کیفیت اس سوال کے جواب میں ان کی نظر آتی ہے۔

لیکن جوں ہی کہ اسی کس لئے کے سوال کا رخ غیر انسانی حقایق اور ماوراء بشری موجودات سے پھیر کر بنی آدم کی طرف موڑ دیا جاتا ہے تو اب سے کیا کہئے کہ اچانک سکوت کا عالم طاری ہوجاتا ہے،

سناٹا چھا جاتا ہے، اور ہم میں ہر ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتا ہے،

مطلب یہ ہے کہ اس خاکدانِ ارضی سے بنی آدم کے ایک ایک فرد کو چُن چُن کر اگر ختم کر دیا جائے، ان کے اونچوں کو بھی ختم کر دیا جائے اور نیچوں کو بھی صاف کر دیا جائے، نہ وہی باقی رہیں جو ان میں بڑے گنے جاتے ہیں اور ان کا بھی نام و نشان مٹا دیا جائے جو سمجھے جاتے ہیں کہ چھوٹے ہیں، نہ کہتروں کو چھوڑا جائے اور نہ مہتروں کو، نہ عالموں کو نہ جاہلوں کو، الغرض بسیط زمین کو فرض کر لیا جائے کہ نسلِ انسانی سے قطعی طور پر خالی ہو چکی ہے تو اب خود سوچئے کہ یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بھی ہوائیں اپنی اٹھکیلیوں سے کیوں رک جائیں گی، پانی کا بہاؤ کیوں تھم جائے گا، یقیناً اس وقت بھی زمین کا یہی فرش اسی طرح بچھا رہے گا، جیسے اس وقت بچھا ہوا ہے، نیلگوں آسمانوں کا شامیانہ اسی طرح تنا رہے گا، جیسے اس وقت تنا ہوا ہے، آفتاب اسی طرح طلوع ہوتا رہے گا۔ جیسے اس وقت طلوع ہو رہا ہے، دریا اسی طرح فراٹے بھرتے رہیں گے جیسے آج بھر رہے ہیں، ندیاں اپنی وادیوں میں اسی طرح کھیلتی رہیں گی، درخت جھومتے رہیں گے، پھول کھلتے رہیں گے جیسے آج یہ سب کچھ ہو رہا ہے، خلاصہ یہی ہے کہ کائنات کا یہ سارا کارخانہ نسلِ انسانی کے بغیر بھی اسی طرح چلتا رہے گا جیسے اس وقت جاری ہے، قطعاً کسی چیز میں نہ کسی قسم کا خلل ہی پیدا ہوگا، نہ حرج ہی واقع ہوگا، ہر چیز اپنے حال پر رہے گی، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہواؤں میں اڑنے والے تنکوں، اور گلی کوچوں میں بکھرے ہوئے سنگریزوں اور ٹھیکریوں کو بھی اس کی پروا نہ ہوگی، کہ آدم کی اولاد کہاں جا کر دفن ہو گئی۔

سامنے کا یہی وہ واقعہ ہے جسے سوچنے والے سوچتے ہیں اور مبہوت ہو کر رہ جاتے ہیں، حیرت ہوتی ہے، کہ وہی جو یہاں سب سے زیادہ مکرم و محترم نظر آتا ہے کمالات کی ساری ارتقائی منزلیں جس پر پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ ختم ہو جاتی ہیں، وہی جو اپنی بے پناہ تسخیری قوتوں سے ہر ایک کو یہاں اپنے نیچے دبائے ہوئے ہے، پہاڑوں کو توڑ رہا ہے، دریاؤں کے رخوں کو موڑ رہا ہے تناور درختوں کو ڈھا رہا ہے جس پر جی چاہتا ہے چھا رہا ہے، چھاتا چلا جا رہا ہے۔ شیر بھی اپنے کچھاروں میں اس سے کانپتے ہیں، ہاتھی بھی جنگلوں میں اس سے پناہ مانگتے ہیں، سمندر کی مچھلیوں میں بھی تلاطم برپا ہے،

پرندوں میں بھی کھلبلی مچی ہوئی ہے، چرندے بھی جس سے سراسیمہ اور پریشان ہیں، یہ اور اسی قسم کی ساری بڑائیوں کا یہی قدرتی حقدار انسان جب کس لئے کے اسی سوال کے سامنے لاکر کھڑا کیا جاتا ہے تو اچانک معلوم ہوتا ہے، کہ جو سب کچھ تھا وہ کچھ بھی باقی نہ رہا، ہوائیں بھی اسے ٹھکرا رہی ہیں، پانی بھی اسے دررار رہا ہے، زمین بھی اسے اگل رہی ہے، آسمان بھی اسے واپس کر رہا ہے، گویا ساری خلقت ہی کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ آدم کی اولاد کے ساتھ کسی کی کوئی ضرورت وابستہ نہیں ہے۔

اللہ اللہ سب بول رہے ہیں کس لئے کے ہی سوال کے جواب میں سب کی زبانیں کھلی ہوئی ہیں، گھاس اور پھوسنا، بلکہ بول و براز جیسی عفونتوں اور غلاظتوں تک جیسی چیزیں بھی اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے خدمات کے ساتھ حاضر ہو جاتی ہیں، کس لئے کے سوال کا جواب کسی نہ کسی رنگ میں ہر ایک کی طرف سے مسلسل پیش ہوتا رہا اور ہوتا رہتا ہے، کھاد ہی بن کر سہی، یا اُپلوں ہی کا قالب اختیار کر کے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں، کہ ناکارگی اور نکماپنی کے الزام کو ان میں کوئی بھی سنجوشی برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہے، ان میں بھی ہر ایک اسی کی شہادت ادا کر رہا ہے کہ پیدا کرنے والے نے ان کو بھی بے کار بنا کر پیدا نہیں کیا ہے، جتنا ڈھونڈھا جائے پتہ یہی چلتا ہے کہ افادیت، اور نفع بخشی کے نت نئے پہلوؤں کی ضمانت ان کے وجود میں بھی پوشیدہ ہے، لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ وہی جو ذرہ ذرہ، تنکے تنکے سے کس لئے کے اسی سوال کا جواب حاصل کر رہا ہے، آہ کہ اسی انسان آدم کی اولاد سے جب پوچھا جاتا ہے کہ

آخر تیرے وجود سے بھی قدرت کے کسی نصب العین کی تکمیل ہوتی ہے، ؟

تو سب سے جواب لینے والا یہی انسان اسی کس لئے کے جواب میں ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ گویا گونگا، بہرا بن گیا، دریافت کیا جاتا ہے کہ پیدا کرنے والے نے آخر تجھے کس لئے پیدا کیا ہے؟ تیرے وجود کی غرض و غایت کیا ہے؟ تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اپنے آپ کو کس کے لئے بتائے، نیچے سے اوپر تک ساری خلقت اور اس کے مختلف طبقات کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیتا ہے ہر ایک پر اپنے آپ کو پیش کر کر کے دیکھتا ہے اور سر جھکا لیتا ہے کہ ساری کائنات میں اس کا اور اس کی

خدمات کا کوئی خریدار نہیں، اس کا گاہک کوئی نہیں، کسی کی کوئی ضرورت، کسی حیثیت سے آدمی اور آدمی کے وجود کے ساتھ اٹکی ہوئی نہیں ہے۔

اس موقعہ پر بعض لوگ کچھ مغالطوں سے کام لینا چاہتے ہیں، ایک سادہ اور سلجھی ہوئی بات کو الجھا دینا چاہتے ہیں، یعنی بجائے غیروں کے ایک آدمی کی ضرورت دوسرے آدمی سے جو پوری ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے اسی کو انسانی وجود کی کانی قیمت ٹھہرا کر چاہتے ہیں کہ خود بھی مطمئن ہو جائیں اور دوسروں کو بھی مطمئن کر دیں۔ بجائے خود یہ ایک مستقل اور جداگانہ مسئلہ ہے تفصیلی بحث تو اس کی آئندہ آرہی ہے لیکن سردست ایک مثال کو تو گوش زد کر ہی دینا چاہیے، کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بیچنے والا آپ کے سامنے بیچنے کے لئے کسی ایسے پودے کو پیش کرتا ہے جسے آپ نے نہ کبھی خود دیکھا تھا، اس کے صفات و خصوصیات کا ذکر کسی سے سنا تھا نہ کسی کتاب میں پڑھا تھا الغرض آپ کے لئے وہ قطعاً مجہول الذات والصفات پودا ہو، اسی وجہ سے آپ بیچنے والے سے پوچھتے ہیں کہ یہ کس لئے ہے اس کے پھلوں سے کیا کام لیا جاتا ہے یا لیا جا سکتا ہے جواب میں پودے کا بیچنے والا اگر یہ کہے کہ جناب والا اس پودے کی جڑ تو اس کے تنے کے لئے ہے، اور تنے شاخوں کے لئے، شاخیں پتوں کے لئے اور یہ سب مل ملا کر بالآخر اس کے ان پھلوں کے لئے ہیں جن میں تخم اور بیج پیدا ہوتے ہیں آئندہ اسی شکل و صورت کے پیدا ہونے والے پودوں کی پیدائش میں وہ کام آتے ہیں پھر یہ پیدا ہونے والے پودوں کی جڑیں تنوں کے لئے تنے شاخوں کے لئے، شاخیں برگ و بار پھولوں اور پھلوں کے کے لئے اور پھلوں کے تخم آئندہ پیدا ہونے والے پودوں کے لئے یوں ہی ایک دوسرے کے لئے بنتے چلے جاتے ہیں، پس اس ہذیانی مضحکہ خیز تقریر کو پودے کا بیچنے والا اگر آپ کے اس سوال کا یعنی یہ پودا کس لئے ہے اور اس کے پھلوں سے کیا کام لیا جاتا ہے اسی کا جواب قرار دے تو سوچئے کہ آپ کا غصہ کیا تھم سکتا ہے کیا اپنی عقلی تفضیک کے سوا اس کی یہ عجیب و غریب تقریر آپ کو کچھ اور بھی محسوس ہو سکتی ہے؟ اور ایک پودا ہی کیا کسی جانور کا فروخت کرنے والا جو خود نہ جانتا ہو کہ جس جانور کو بیچنے کے لئے وہ نکلا ہے اس کا کیا فائدہ یا اس سے کیا کام لیا جا سکتا ہے باوجود اس کے لوگوں کے سامنے کہتا پھرے کہ گو میں خود یہ نہیں جانتا کہ قدرت نے اس جانور کو کس کام کے لئے پیدا کیا ہے اور اس سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے لیکن چونکہ اس کا معدہ اس کے خون کے لئے ہے، جو اس کے جگر میں پیدا ہوتا ہے، اور خون

اس کے گوشت پوست چربی اور ہڈیوں اور اس تولیدی مادّہ کے لئے ہے جس سے پھر اسی قسم کا جانور پیدا ہوجاتا ہے یہی اس جانور کی کافی قدروقیمت ہے اگر ہڈیاں اور جنون کے سوا اس کی یہ کو اس اور کچھ نہیں ہے تو بنی نوع انسانی کے افراد کے متعلق اس سوال کے جواب میں یعنی یہی کہ وہ کس لئے ہیں؟ یہ کہنا کہ باہم ایک دوسرے کے وہ کام آتے ہیں اور اگلی نسلیں پچھلی نسلوں کی پیدائش کا ذریعہ بن کر ہر اگلی نسل پچھلی نسل کے لئے بنتی چلی جاتی ہے اور اسی قصہ پر انسانی وجود کی قدروقیمت کو ختم کرنے کی جرأت خود سوچئے کہ ابلہ فریبی کے سوا اور بھی کچھ ہے؟

مان بھی لیا جائے اور ایسا ہو بھی جائے کہ ہم میں ہر فرد اپنے خاندان کے لئے خاندان قوم کے لئے قوم سارے انسانوں کے لئے اور انسانوں کی ہر اگلی نسل پچھلی نسل کے لئے کام کرتی چلی بھی جائے، تو زیادہ سے زیادہ مطلب ان سارے طول، طویل قصوں کا وہی تو ہوا کہ پودے کی جڑ تنے کے لئے، تنہ شاخوں کے لئے، شاخیں پتوں کے لئے، پھولوں اور پھلوں کے لئے، پھل تخم کے لئے، تخم آئندہ ان ہی جیسے ان جانے مجہول الخواص والصفات پودوں کی پیدائش کے لئے، اور نئے پودے پھر ان ہی منزلوں سے گذرتے ہوئے دوسرے نئے پودوں کے لئے، "ودعلم جرّا" جیسے اس گھن چکر میں گردش دینے کے بعد بھی، یہ سوال کہ پودا کس لئے ہے؟ صرف سوال ہی بنا رہتا ہے اسی طرح آپ خود سوچئے کہ باہم انسانی افراد کے تعلقات کا یہ تسلسل اس سوال کا یعنی پیدا کرنے والے نئے انسان کو کس لئے پیدا کیا ہے؟ اس سوال کا مغالطہ آمیز اور مضحکہ خیز نہیں بلکہ واقعی صحیح منطقی جواب کیسے بن سکتا ہے میں پوچھتا ہوں کہ زید نے عمر کے منہ میں لقمہ ڈالا، اور عمر نے زید کو کپڑے پہنائے، اس میں شک نہیں کہ ایک دوسرے کے کام ضرور آئے لیکن دونوں مل کر پھر کیا کریں، سوال تو انسانیت کے متعلق ہے کہ مصائب ہستی میں اس کے وجود سے قدرت کے کس نصب العین کی تکمیل ہوتی ہے کرۂ زمین پر انسانی وجود کا جو ظہور ہوا، اس کا مقصد اور اس کی غرض و غایت کیا ہے فرد پر ہی یہ سوال عائد ہوتا ہے اور بنی آدم کی ساری اگلی پچھلی نسلوں کا مجموعہ اس سوال کے جواب میں ایک دوسرے کے کام آنے کے بعد بھی اسی مقام پر ہے جہاں پہلے تھا یقیناً سرمو، بال برابر بھی یہ سوال اپنی جگہ سے نہ ہلا ہے اور نہ ہل سکتا ہے۔

اسی لئے تو میں کہتا ہوں، اور یہی کہتا رہوں گا جس کے کہنے سے مجھے کوئی روک نہیں سکتا کہ وہی

بیٹو، نکھٹو آدمی نہیں جس کی جوانی ساری کدّ و کاوش کا آخری محور صرف اپنی ذاتی شکم پروری کو بتاتے ہوئے ہے اکبر مرحوم نے جسے سامنے رکھ کر کہا تھا کہ

جو پوچھا دل سے اس جینے کا کچھ حاصل بھی آخر ہے ۔۔۔ شکم بولا کہ اس کی فکر کیا بندہ تو حاضر ہے

ان کی اس ظرافت کو بیٹوؤں کے اسی طبقہ تک محدود نہ سمجھا جائے بلکہ اپنے ساتھ اپنے بال بچوں اقرباء و اعزہ کو بھی اپنی کمائیوں میں جو شریک سمجھتے ہیں، یا ان سے اونچے ہو کر کسی قوم و ملت کی خدمات کو اپنی کوششوں کا جو نصب العین بنائے ہوئے ہیں اور ان سے بھی آگے بڑھ کر ساری انسانیت ہی کے فلاح و بہبود کو جنہوں نے اپنے سامنے رکھ لیا ہے یا یہ جو سمجھایا جاتا ہے کہ ہر پچھلی نسل کے لئے دنیا کے ماحول کو ممکنہ حد تک خوش گوار اور مسرت بخش بناتے چلے جانے کی غیر منقطع دوامی کوشش" یہی انسانیت کا آخری بلند ترین نصب العین ہے ان سارے قصوں اور قضیوں کی بنیاد اس پر قائم ہے کہ خود انسانیت بھی بجائے خود کچھ قدر و قیمت رکھتی ہے بلاشبہ ایسی صورت میں ہر وہ قدم جو انسانیت کے ابھارنے اور سنوارنے کی راہوں میں اٹھایا جائے گا وہ قابل قدر مستحق تحسین و ستائش ہوگا۔ پھر افادیت میں جد و جہد سعی و کوشش کا دائرہ جتنا زیادہ وسیع ہوگا، اسی حد تک اس کی قیمت بھی بڑھتی چلی جائے گی بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ذاتی شکم پروری والوں کی کوششیں اپنی شخصی ذات ہی کی حد تک کیوں محدود نہ ہوں لیکن انسانیت ہی کے ایک حصہ کو یعنی خود بیٹو آدمی کو چونکہ اس سے فائدہ پہونچتا ہے اس لئے اس کی اہمیت بھی چاہئے تو یہی کہ نظر انداز کرنے کی مستحق نہ ہو، کچھ نہ سہی، لیکن بہر حال ایک آدمی ہی کی تو بے چارا بیٹو پرورش کرتا ہے لیکن سرے سے انسانیت ہی اگر نظام عالم کا ایک لایعنی، لاحاصل، عبث، غیر مفید عنصر ہے، تو انفرادی شکل میں ہو یا اجتماعی قالب میں، زمین کی پشت کے ایک ناکارہ بوجھ کے سوا وہ کچھ اور بھی باقی رہتی ہے۔ عربی کی مثل مشہور ہے ثبت الجدار ثم النقش (یعنی پہلے دیوار تو بنالو اس کے نقش ونگار آرائش و زیبائش کا مسئلہ تو اس کے بعد پیدا ہوگا) بقول شخصے "تار باقی نہیں کرتا ہے تو دامن پیدا" آخر بتایا جائے کہ فرد خاندان کیلئے خاندان قوم کے لئے، قوم ساری انسانیت کے لئے، اور انسانوں کی ہر اگلی نسل، پچھلی نسلوں کے لئے ہے، ان نصب العینوں کو مان لینے کے بعد جیسا کہ بار بار کہتا چلا آرہا ہوں، وہی

سوال کہ آخر یہ سب کس کے لئے پیدا ہوتے ہیں؟ اور کس لئے پیدا ہوتے چلے جا رہے ہیں، ہم آپ کو کھلائے جائیں، آپ ہمیں پلاتے جائیں، آپ کی مدد ہم کریں، ہماری مدد آپ کریں، یوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے ہوئے قبروں میں گرتے چلے جائیں، دھنستے چلے جائیں سڑتے چلے جائیں اور کچھ نہ سوچیں کہ دنیا کی حقیر سے حقیر شئے کا حال جب یہ ہے کہ آج ہمارے سامنے سے اگر وہ ہٹائی جائے، تو ساری انسانیت تلملا اٹھتی ہے، لیکن ایک ہم ہیں کہ نہ زمین ہی کے کام کے ہیں، نہ آسمانوں کے، نہ ہوا ہی کی کوئی ضرورت ہم سے پوری ہوتی ہے اور نہ پانی کی، کسی حقیر ذرہ کے کان پر جوں کبھی نہیں رینگتی اگر ساری نسل انسانی زمین کے اس کرے سے پوچھ لی جائے، آخر یہ کیا ہے کہ دنیا کی چیزیں تو بالواسطہ یا بلا واسطہ انسانی ضرورتوں میں کام آ آ کر اپنے وجود کے مفاد، اور اس کی قدر و قیمت کو مسلسل پوری قوت کے ساتھ ثابت کرتی چلی جاتی ہیں لیکن ساری خلقت میں ایسا کوئی نہیں جس کے لئے انسانی وجود بھی کوئی قدر و قیمت رکھتا ہو،

غور و فکر کی یہی نازک ترین منزل ہے، جہاں پہونچنے والے جب پہنچتے ہیں اور سنتے ہیں کہ قرآن پکار رہا ہے ان ہی کو خطاب کر کے پکار رہا ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا — کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تم کو نکما بنا کر پیدا کیا ہے؟

تو ان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، ان کے اندرونی احساسات میں تہلکہ مچ جاتا ہے، لرزہ براندام ہو جاتے ہیں جب یہی قرآن پوچھتا ہے کہ

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى — کیا آدمی یہ سوچتا ہے کہ وہ نکما بنا کر چھوڑ دیا جائے گا

بلکہ یہ دیکھ کر کہ دنیا کی چیزیں تو انسانی ضرورتوں میں کام آ کر اپنی قیمت حاصل کر رہی ہیں، خدا نخواستہ اگر یہ مان لیا جائے کہ خود انسان اور انسانی وجود کی کوئی قیمت نہیں ہے تو مآلاً اس کا حاصل یہی تو ہوا کہ ہر وہ چیز جس کی قدر و قیمت انسانی وجود کے ساتھ وابستہ تھی، وہ بھی بے قیمت بن کر رہ گئی آخر جس کے لئے سب کچھ ہے جب وہی کچھ نہ رہا، تو یقیناً سب کچھ بے کار، لاحاصل، عبث و باطل ہو کر رہ گیا جس باغ کے درخت ہی بے ثمر بن کر رہ گئے ہوں، یقیناً وہ باغ بھی بے کار ہوا، اور جو کچھ باغ

کی شادابی و سیرابی کے لئے کیا گیا تھا سارا سازوسامان سب ملیا میٹ ہو کر رہ گیا، انسان اور انسانی وجود کو بے مقصد ٹھہرانے کا یہی ناگزیر منطقی نتیجہ ہے قرآن میں

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا — ہم نے زمین اور آسمان کو بے کار پیدا نہیں کیا

اور اسی قسم کی بے شمار آیتوں سے آدمی کے دماغ پر جس کی ٹھوکریں لگائی گئی ہیں اپنی نکما پنی، اپنے وجود کی لاحاصلی سے جن میں چونک پیدا نہیں ہوتی شاید نظم عالم کے بطلان اور بے حاصلی ان کو فکر معقول کی طرف متوجہ کرے اسی مسئلہ کے سمجھانے کی یہ دوسری قرآنی تعبیر ہے

اف کائنات کا یہ حیرت انگیز نظام جس کی رگ رگ، ریشہ ریشہ میں حکمت و دانش کا خون دوڑ رہا ہے مصالح اور دانائیوں کی نازک ترین رعایتیں جس کے ذرہ ذرہ سے اُبل رہی ہیں کیسا عجیب تماشا ہے کہ سبک مغزوں کی ہلکی سی فکری لغزش نے کائنات کے اسی محکم و مرتب، مہیب و مدہش نظام کو لاحاصل مہملات کا ایک ڈھیر اور دفتر بے معنی بنا کر چھوڑ دیا، یہ سچ ہے کہ دنیا تو دنیا اسی دنیا کی معمولی انفرادی شخصیت، بازار کا بدترین بے فکر امتفو خیرا بھی، ناکارہ اور نکمے ہونے کے اس دشنام کو برداشت نہیں کرسکتا، واقعہ خواہ کچھ ہی ہو لیکن انسانی جبلت اس الزام کو ہضم نہیں کر سکتی، شوق ہو تو تجربہ ہی کر کے دیکھ لیجئے اس الزام کا ردعمل گالیوں اور طاحیوں ہی کی حد تک محدود ہو کر گر رہ جائے لاٹھیوں اور جوتیوں سے جواب نہ دیا جائے تو سمجھنا چاہیئے کہ جان بچی لاکھوں پائے۔

بہرحال فطرت و جبلت کا اقتضا خواہ کچھ ہی ہو، لیکن غریب عقل کیا کرے؟ دنیا میں جب ایسی کوئی چیز ہے ہی نہیں، جسے انسان اور انسانی وجود کی ضرورت محسوس کرا کے، دنیا میں آدمی کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب حاصل کیا جائے آخر کس کی پیٹھ پر لادے اس بوجھ کو جسے لادنے کے لئے یہاں کوئی تیار نہیں اور کس کے سر کا درد بنائے اس نکمی ہستی کو جس سے بات پوچھنے پر کوئی آمادہ نہیں بلکہ حق تو یہ ہے کہ خلقت ہی کے ہجوم میں جب تک انسانیت بھٹکتی رہے گی پکارنے والے اسی ہجوم میں آدمی کو کھڑا کر کے جب تک پکارتے اور چلاتے رہیں گے کہ

ہے کوئی آدم کے ان بچوں کا خریدار ؟

تو صرف یہی نہیں کہ زمین کے اس کرہ پر آدمی کے قیام و بقاء کے جواز کی سند اور کسی منطقی بنیاد کی فراہمی ہی میں عقل اپنے آپ کو ششدر و حیران پاتی رہے گی، بلکہ جن زندگی اور زندگی کے احساسات رکھنے والی ہستیوں کا وہ طبقہ جن کے گوشت سے اپنے گوشت میں اور چربی سے اپنی چربی میں آدم کی اولاد اضافہ کا کام لیتی ہے اور کام لینے کی عادی ہے، اپنے منہ کو جن جانداروں کا مذبح اور پیٹ کو جن زندہ ہستیوں کا مدفن بنائے ہوئے ہے اور وہی کیا زراعت کو سیراب کرنے کے لئے آب گیروں کے آبی ذخیروں کو اپنے کھیتوں میں جو منتقل کرتے ہیں جن کے صرف اسی ایک فعل سے خدا ہی جانتا ہے کہ خشکی اور تری کی کتنی زندگیاں موت بنتی چلی جاتی ہیں اور جیسا کہ کہنے والے کہتے ہیں کہ شاید ہی کوئی قدم آدمی کا ایسا اٹھتا ہو جس کے نیچے ہزار جانیں نہ مسلی جاتی ہوں، ایک ایک گھونٹ میں لاکھوں زندوں کو جو گھونٹ جاتا ہو اور اپنی ہر سانس میں انھیں شریک رہا ہو، الغرض دوسروں کی میت سے جو اپنی زندگی پیدا کرتا ہو، دوسروں کو اجاڑ کر اپنے گھر آباد کرتا ہو، تعمیری ضرورتوں کے لئے ایک درخت ہی جب کاٹا جاتا ہے تو کون بتا سکتا ہے کہ اس درخت پر بسیرا لینے والے پرندوں کے کتنے گھونسلے تباہ ہوتے ہیں، ان چیونٹیوں، مکڑیوں اور بھانت بھانت کے جانداروں پر کیا گذرتی ہے، جن کی واحد پناہ گاہ وہی درخت اس کے مختلف گوشے اور حصے تھے بہرم کے اس فرد کو جیسا کہ ہم میں ہر ایک جانتا ہے، جتنا چاہے دراز کیا جا سکتا ہے ایسی صورت میں آپ ہی بتائیے کہ انسان کا ناکارہ وجود اس کی بے معنی لاحاصل ہستی کے جواز کی سند بھی غریب عقل کے پاس کیا باقی رہتی ہے، آدمی کی عقل چونکہ بہرحال آدمی ہی کی عقل ہے، اس لئے بے جا طرفداری یا خواہ مخواہ کی رو رعایت، چشم پوشی اور مروت سے اگر کام نہ لے تو انسانیت کی یہ ساری تسخیری اور اولوالعزمیاں اقتداری سربلندیاں، عقل کی آزاد تنقید کے معیار پر پہنچ کر اگر زور اور زبردستی کے ظالمانہ مظاہرے کا قالب اختیار کرلیں، تو اس عقلی فیصلہ کو مشکل ہی سے غیر منصفانہ فیصلہ قرار دیا جا سکتا ہے انسانی وجود کا کوئی ایسا ہی نصب العین جب تک سامنے نہ لایا جائے، جس پر سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے، اس وقت تک یقین مانئے کہ آدمی کے سارے تسخیری کرامات اور اس کے سارے اقتداری تصرفات جنھیں

وہ اپنا پیدائشی حق قرار دے رہا ہے، یہ سارا قصہ صرف بھینس اور لاٹھی کا قصہ بن کر رہ جاتا ہے، جس کی بنیاد بجائے عقل و انصاف کے ماننا پڑے گا کہ صرف بربریت و وحشت، جہالت اور سفاہت ضد اور ہٹ پر قائم ہے،

اور یہی ایا، احترامی حقوق، اور اکرامی واجبات کے وہ سارے شریفانہ آداب و ضوابط، حکیمانہ نظریے اور قوانین، جو باہم انسانوں میں ایک دوسرے پر عاید کر دیئے گئے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں جو کچھ بھی کیا جا رہا ہے، عقل و خرد کی پشت پناہیوں میں کیا جا رہا ہے، میں پوچھتا ہوں کہ نیکیوں کے سارے ابواب غم خواروں کی غم گساری، دل افگاروں کی دل داری بے یاروں کی یاری، بیماروں کی تیمار داری یا اور اسی قسم کے مشورے جنہیں سمجھا جاتا ہے کہ انسانیت و شرافت کے غیر مسئول تقاضے ہیں جن کے خلاف لب ہلانے کی بھی کوئی جرأت نہیں کر سکتا لیکن ان نیک اور معصوم مشوروں کی بنیاد کیا ہے؟ لا حاصل ہے تو ان ہی انسانوں میں جو معذور اور اپاہج ہو چکے ہیں، کیوں ان پر توانا اور تندرست آدمیوں کی کمائی ہوئی آمدنیاں برباد کی جائیں؟ امراض کے مقابلہ میں جو اپنی سپر ڈال چکے ہیں، ان کی بیماری ہی بتا رہی ہے کہ مرض کی مدافعت کی قوت سے وہ محروم تھے، پھر ان ہی پر اس سرمایہ کو کیوں ضائع کیا جائے، جن سے مدافعت کے اسی میدان میں جیتنے والے صحت مندوں کی صحت و قوت میں اضافہ ہو سکتا ہے، شبابی توانائیوں کو بجائے بڑھنے اور ترقی کرنے کے، اس لئے کیوں پژمردہ اور افسردہ ہونے کا موقعہ دیا جائے کہ قبروں کے جھانکنے والے فرتوت از کار رفتہ بڈھے باپوں کی خبر گیری، جوان بیٹوں کا انسانی فرض ہے، پودوں کی جڑیں تنوں کے لئے، تنے شاخوں کے لئے، شاخیں برگ و بار کے لئے، پھولوں اور پھلوں کے لئے، پھلوں کا وجود آئندہ پیدا ہونے والے پودوں کے تخم اور بیج کے لئے یہ عمل تو خیر اس لئے جاری ہے اور اسے رد کیا بھی نہیں جا سکتا کہ اختیار و انتخاب کی قوت سے پودوں کا نباتی وجود محروم ہے لیکن آدمی کا اختیاری وجود خواہ مخواہ کے ان کٹھن چکروں میں کیوں پڑے، بتایا جائے کہ افراد خاندانوں کے لئے، خاندان قوم کے لئے قوم سارے انسانوں کے لئے، انسانوں کی ہر اگلی نسل پچھلی نسل کے لئے، قربانیوں سے آخر کیوں کام لے؟ راحت و آرام اور لذائذ حیات کے جس ذخیرے اور سرمایہ سے جو بھی جس حد تک

مستفید ہو سکتا ہے، ان سے بجائے خویش کے درویش کو فائدہ اٹھانے کا موقعہ آخر کیوں دیا جائے آخر ان مسلمات معروفہ کی صحیح منطقی بنیاد بھی تو ہو۔

اگرچہ اسی کے ساتھ اس کا بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقتداری تصرفات جن سے آدمی یہاں کام لے رہا ہے اور احترامی حقوق و واجبات کا وہ سلسلہ جن کی پابندی کا مطالبہ باہم بنی نوع انسانی کے درمیان کیا جاتا ہے ان دونوں راہوں میں عقل کا حال جو بھی ہو لیکن جیسا کہ پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری جبلت اور فطرت دونوں سلسلوں کی عام کارروائیوں سے اصولاً مطمئن نظر آتی ہے انسانی وجدان کا فیصلہ یہی ہے، کہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہو رہا ہے درست ہو رہا ہے نہ کسی قسم کا

لہ اصولاً سے میری غرض یہ ہے کہ دوسروں کی موت سے اپنی زندگی، اور ذرائع زندگی کی فراہمی ہی کے مسئلہ کو مثلاً لیجئے۔ بنی آدم میں ایسا کون ہے کہ جو اس سے بچ کر زمین کے اس کرے پر جی سکتا ہے، یا جینے کا تصور کر سکتا ہے، خشکی اور تری کے جانداروں کو زندگی سے محروم کئے بغیر جب آدمی اپنے پیٹ میں ایک دانہ اور پانی کے ایک گھونٹ کو بھی پہنچا نہیں سکتا تو زندگی سے محرومی کی بعض خاص شکلوں مثلاً ذبح وغیرہ کے طریقوں کو دیکھ کر کسی خاص طبقہ ہی پر یہ الزام لگانا کہ دوسروں کی موت سے وہ اپنی زندگی پیدا کرتے ہیں، بجز ایک بے بنیاد الزام کے اور بھی کچھ ہے؟ خون سے جن کے دامن تر ہیں وہ دوسروں کی آستین کے خونی چھینٹوں پر کیوں معترض ہیں، کسان تالابوں سے اپنے کھیتوں میں جب پانی دیتا ہے تو کہہ چکا ہوں کہ وہ یہ سب جان بوجھ کر کرتا ہے کہ پانی میں زندگی گذارنے والوں کی بھی بڑی تعداد میرے اس فعل سے اپنی زندگی سے محروم ہو رہی ہے اور خشکی میں رہنے والے جانوروں، کیڑوں، مکوڑوں پر بھی زیست کی راہیں بند ہوتی چلی جا رہی ہیں ایسی صورت میں ذبیحہ وغیرہ مسئلہ کے اختلافات کو اصولی اختلاف قرار دینے کی آپ خود سوچئے کیا وجہ ہو سکتی ہے بلکہ میں تو حیران ہو جاتا ہوں جب بجائے اپنے ذاتی رجحانات کے اس قسم کے اختلافات کو لوگ مذہب کی طرف منسوب کرنے کی جرأت کر گذرتے ہیں گویا وہ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ زندگی سے محروم کرنے کی یہ خاص شکل مثلاً ذبح کرنے کا طریقہ اس کو خدا ہی نے ناجائز قرار دیا ہے حالانکہ ساری چھپی ڈھکی باتوں کا خدا جب عالم ہے تو وہ ایسا حکم کیسے دے سکتا ہے جس سے بچ نکلنے کی کوئی ممکن صورت ہی نہیں ہے اس نے اس عالم کے نظام کو بنایا ہی اس طریقہ سے ہے کہ ایک کی زندگی دوسروں کی موت ہی سے پیدا ہوتی ہے ۱۲

کوئی دغدغہ ہی ہم اس فیصلہ کے متعلق اپنے اندر پاتے ہیں، اور نہ کوئی ممصہ با خرخشہ سچ پوچھئے، تو جبلت کا یہ سکون، فطرت کی یہ خنکی، اشارہ کر رہی ہے کہ عقل کے سامنے سے اس راہ میں کوئی اہم مقدمہ اوجھل ہوگیا ہے، یا ڈالنے والوں نے قصداً سے اوٹ میں ڈال دیا ہے؟ اور یہ ساری کش مکش جو اپنی عقل اور فطرت و جبلت کے انتضادوں میں ہم پاتے ہیں، اسی مقدمہ سے ذھول کا نتیجہ ہے

آیئے اور پڑھئے آسمانی کتابوں کے آخری قالب القرآن الحکیم میں نبوات و رسالات کی جو طویل تاریخ کے ناصیہ کا سب سے زیادہ نمایاں سب سے زیادہ درخشاں "نوشتہ"

یَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ لوگو! پوجے جاؤ، اللہ کو، تمہارا کوئی الہ (معبود) اس کے سوا نہیں ہے،

از آدم تا خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) پیغمبروں کے پیش کئے ہوتے لاہوتی فرامین، کی پیشانیوں کا یہی اختصاصی طغراء اور دوامی لازمی چھاپ ہے جس میں انسان کس لئے ہے؟ اسی سوال کے جواب میں جو واقعہ تھا اس سے پردہ ہٹا دیا گیا ہے حاصل جس کا یہی ہے کہ خالق کائنات نے انسان کو صرف اپنے لئے پیدا کیا ہے کھول دیا گیا ہے کہ یہی حقیقت ہے آفرینش کائنات کے سلسلے میں انسانیت کا یہی تخلیقی موقف اور قدرتی مقام ہے، اور یہی وہ ذاموش شدہ مقدمہ، یا گم گشتہ کڑی ہے جس سے ہٹ کر بے چاری عقل حیرانی اور سراسیمگی کی وادیوں میں بھٹک رہی تھی آدمی کے وجدانی و جبلی رجحانوں اور اس کے عقلی انتضادوں میں کش مکش برپا تھی، اس درمیانی کڑی سے جوڑ دینے کے بعد تزاحم و تخالف کے یہ سارے قصے اچانک ختم ہو جاتے ہیں اب عقل بھی وہی سوچتی ہے، اور اس کے سوا سوچ ہی کیا سکتی ہے، جس کے ساتھ ہمارا وجدان اور ہماری جبلت راضی و مطمئن ہے اصولی غلطی یہی تھی کہ پیدا کرنے والے نے جسے مخلوقات کے لئے پیدا ہی نہیں کیا ہے اسی انسانیت کو بغل میں دبائے مخلوقات ہی کے دروازوں پر پکارنے والے ... پکار رہے تھے کہ ہے کوئی اس غریب آدمی کا بھی خریدار؟ ظاہر ہے کہ قیود استقراء کی یہ قطعاً غیر منطقی کوشش تھی، آنکھیں جو دیکھنے کے لئے بنائی گئی ہیں ان سے سننے کا کام کیسے لیا جا سکتا ہے کانوں پر رکھ کر گلاب کے

پھول کو کوئی لاکھ سونگھنے کی کوشش کرے؟ لیکن اس میں کیا کامیاب ہو سکتا ہے، پیدا کرنے والے اور بنانے والے نے سونگھنے کے لئے جب ناک ہی کو بنایا ہے، تو قدرت کے اس قانون سے جنگ کر کے کان کو سونگھنے کے کام کا کون بنا سکتا ہے۔

بہرحال انسان خدا کے لئے ہے؟ اور خالق کائنات نے خود اپنے لئے اس کو پیدا کیا ہے اس کا مطالب کیا ہے، اور اس کی تشریح میں جن بوالعجبیوں کا انسانی ذہن شکار ہوا، تعبیروں کی کثرت نے جن پریشاں خوابوں کا طلسم اس سیدھی سادی حقیقت کو بنا دیا اس پر تو کافی بسط و تفصیل کے ساتھ انشاء اللہ آئندہ بحث کی جائے گی۔

سردست میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اپنے اس تخلیقی موقف اور طبعی مقام پر پہنچ جانے کے بعد آپ دیکھ رہے ہیں، کہ وہی انسانیت جو ساری خلقت، حتی کہ بول و براز جیسی عفونتوں اور غلاظتوں تک کے مقابلہ میں بھی بے قیمت ٹھہری چلی جاتی تھی، کم از کم ان گندگیوں سے بھی کھاد کا کام لیا جاتا ہے زرعی پیداواروں کی نشوونما میں ان سے کافی مدد ملتی ہے لیکن آدمی تو اس کام کا بھی نظر نہیں آتا تھا مگر آپ دیکھ رہے ہیں جس کا سب کچھ ہے کائنات کے اسی خالق کے لئے ہو جانے کے بعد وہ سب کچھ جو آدمی کے تسخیری اقتدارات کے نیچے دبے ہوئے ہیں اور جن سے وہ کام لے رہا ہے، قرآن میں جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے،

هُوَ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا	اللہ ہی نے تمہارے لئے آسمان اور زمین کی تمام چیزوں کو مسخر کیا ہے۔

گویا نسل انسانی کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے جب تم میرے لئے ہو، تو وہ سب کچھ جو میرا ہے وہ تمہارے لئے ہے، وقفہ وقفہ سے اسی واقعہ کو اول سے آخر تک قرآن دھراتا چلا گیا ہے، کائنات کی شاید ہی کوئی ایسا اساسی وجود یا جوہری حقیقت رہ گئی ہو جس سے استفادہ کا حق بنی آدم کو اس کتاب میں نہیں دیا گیا ہے اسی کے مطابق بے محابا، بے دھڑک لوگ اپنے اس حق کو استعمال کر رہے ہیں اور اپنے اس قدرتی حق سے مستفید ہو رہے ہیں، الغرض یہ سارے تسخیری مظاہرے اور بنی آدم کے

اقتداری تصرفات کے تماشے جو ہمارے سامنے ہیں، بتایئے کہ اس کے سوا آخر ہوتا کیا؟

جو سب کا خالق، سب کا مالک سب کا رازق، سب سے بڑا ہے انسان جب اسی سب سے بڑے کے لئے ہے تو مخلوقات میں بڑائی کا دعویٰ اس کے مقابلہ میں اب کون کر سکتا ہے آپ دیکھ رہے ہیں، اپنے طبعی موقف سے ہٹ جانے کے بعد وہی آدمی جو سب سے چھوٹا بن کر رہ گیا تھا۔ فکری تصحیح کی ایک جست نے اسی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا ساری کائنات کو چیرتا پھاڑتا، وہاں پہنچ گیا، جہاں خالق کے سوا کوئی مخلوق نہیں ہے، انسان خدا کے لئے ہے؟ اس کا مطلب جو کچھ بھی ہو اور وہ مطلب بیان ہی کیا جائے گا لیکن سوال یہی ہے کہ خدا کے لئے ہو جانے کے بعد انسانی وجود کی قدر و قیمت کا بھلا کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے بعد انسانیت خواہ کسی قالب میں ہو، طفولیت کے عہد میں ہو، یا شباب کے زمانہ میں، کہولت کی منزل میں ہو، یا پیرانہ سالی کے دور میں ہو، انفرادی شکل میں ہو، یا اجتماعی رنگ میں، مردانہ سانچے میں یہ انسانیت جلوہ گر ہوئی ہو یا صنف نازک کے حسین و جمیل پیکر میں ڈھل کر سامنے آئی ہو یقیناً اس کے بعد وہ مستحق ہو جاتی ہے کہ اس کا احترام کیا جائے، اس کی قدر و قیمت پہچانی جائے اس کی قدرتی صلاحیتیں ابھاری جائیں، ان کے سنوارنے کی ممکنہ کوششوں میں سعی و سرگرمی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا جائے، اس کی حفاظت و نگرانی کے لئے حکومت کا نظام قائم کیا جائے۔ عدل و انصاف کے قوانین بنائے جائیں، عدل و انصاف کے محکموں کا جال بچھایا جائے، پولیس رکھی جائے، فوجی دستے بنائے جائیں، اس کے بال بال کی نگرانی کی جائے شفا خانے کھولے جائیں سینیٹوریم قائم کئے جائیں، اس کے لئے مواصلات کے ذرائع میں سہولتیں پیدا کی جائیں، مدارس و مکاتب، کلیات و جوامع سے ان کی آبادیوں کو بھر دیا جائے۔ الغرض جو کچھ کیا جا رہا ہے اور ان راہوں میں جو کچھ کیا جا سکتا ہے، آدمی قدرتاً ان سارے تکریمی حقوق کا پیدائشی حقدار بن جاتا ہے لیکن یہ سب جو کچھ بھی ہے، اس وقت تک ہے جب تک کہ سمجھا جائے کہ سب سے بڑے کے لئے آدمی پیدا کیا گیا ہے، اسی وقت تک وہ سب سے بڑا بھی ہے، سب چھوٹے اس کے لئے ان ہی حالات میں تو بن سکتے ہیں کہ سب سے بڑے کے لئے اس کو سمجھا جائے، اس کی ساری قدر و قیمت، عظمت و شرافت، احترام و کرامت اس کے وجود کے صرف اسی نصب العین میں پوشیدہ ہے کہ جو سب سے بڑا ہے مانا جائے کہ اسی کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے لیکن خالق کائنات کے قدموں سے ہٹنے کے بعد آپ دیکھ چکے کہ مخلوقات کے دائرے میں پہنچ کر انسانیت کی*

* کوئی فقرہ غالباً باقی رہ گیا ہے (باقی آئندہ)

حکیم سنائی

مترجم

(جناب انعام اللہ خاں صاحب ناصر)
ایڈیٹر روزنامہ الجمعیۃ دہلی

(۳)

سرجان مالکم اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں کہ سلطان نے جو مسجد بنائی وہ شہر کی تمام عمارتوں سے ممتاز تھی۔ سنگ رخام کی وضع فرش، کارنگ اور طلائی قندیلوں کی چمک یہ تمام اسباب جو اس کی زینت کا موجب تھے۔ دیکھنے والوں کے دل میں ایک عجیب کشادگی پیدا کرتے تھے۔ مسجد جامع کا نام عروس ملک تھا۔ اس مسجد کے بیرونی صحن میں فوارے بنائے گئے تھے۔ جن کا پانی بڑی حوض میں گرتا تھا اور اس کے لبریز ہونے کے بعد چھوٹی نالیوں کے ذریعہ بڑی نہر میں چلا جاتا تھا۔ یہ منظر عجیب کیفیت پیدا کرتا تھا کہ اس میں رنگ صنعت کے ساتھ آثار ندرت ملے جلے نظر آتے تھے۔

امین احمد رازی مؤلف ہفت اقلیم لکھتا ہے کہ ہندوستان کی فتح کے بعد سلطان نے مدینۃ السلام غزنی میں خالص سنگ رخام سے ایک مسجد بنائی جسے عروس الملک کہتے تھے لیکن اب غزنی میں اس مسجد کا کوئی نشان ان سفید پتھروں کے سوا جن پر محراب کی شکلیں بنی ہوئی ہیں نہیں رہا۔ ایک محراب مزار جمع اولیاء میں نظر آتا ہے اس کے بعض حصے ٹوٹے ہوتے ہیں زیارت کی غربی دیوار کی طرف نصب ہیں اور اس کے حواشی پر آیات قرآنی منقوش ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ پتھر اسی مسجد جامع کا محراب ہے اور وہ مسجد یہیں تھی ممکن ہے کہ مسجد جامع یہیں ہو لیکن یہ قیاس کہ پتھر اسی مسجد کا محراب ہے میرے خیال سے بعید از صحت ہے۔

اول تو اس وجہ سے کہ اس پتھر کی جنسیت ایسی خوبصورت اور شاندار مسجد کے محراب کے شایاں نہیں۔ دوسرے اس وجہ سے کہ پتھر بہت چھوٹا ہے کہ اس کو ایسی بڑی مسجد کا محراب نہیں سمجھا جا سکتا۔ لیکن ایسے پتھر جنہیں جامع محمودی سے متعلق قرار دیا جا سکے غزنی میں اب بھی بکثرت ہیں۔ مزارات عرفاء اور ہر ایک قبر اور مسجد میں یہ پتھر نظر آتے ہیں۔

ان میں سے کچھ پتھر مصلوں کے برابر ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ اس مسجد سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان پتھروں پر ایک حسین خط بصورت محراب بنا ہوا ہے اور کچھ پتھروں پر جو دیوار مسجد سے تعلق رکھتے ہوں نہایت خوشنما پھول اور پتے بنے ہوئے ہیں اور ان کے وسط میں ایک شکل بنی ہوئی ہے۔ جو ہمارے امروزہ رسمی نشان سے جزئی فرق کے ساتھ ملتی جلتی ہے۔ ان پتھروں کے علاوہ جو مسجد سے تعلق رکھتے ہوں بعض اور سفید پتھر بھی برآمد ہوئے ہیں کہ ان پر گھوڑے، ہاتھی، بادشاہوں، سرداران جنگی کی صورتیں بنی ہوئی ہیں۔ ان پتھروں میں سے کچھ پتھر عمارات شاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک سنگِ سفید جو حال میں غزنی کے اندر سید مکی علیہ الرحمتہ کی تربت کی دیوار سے نکلا ہے اور کابل کے عجائب خانہ میں موجود ہے۔ اُس پر ایک آدمی کی تصویر بنی ہوئی ہے جو ایک گھوڑے پر سوار تلوار ہاتھ میں لئے ہرن پر حملہ کر رہا ہے اور دوسرے ہاتھ سے شیر کو دفع کرتا ہے جو اس پر پیچھے سے حملہ کر رہا ہے۔ اس پتھر کی دوسری طرف حاشیہ میں نفیس بیل بوٹے بنے ہوئے ہیں، اور ان پر یہ الفاظ پڑھے جاتے ہیں۔

—— زمانہ —— جمال —— کمال ——

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ پتھر اُس مکان کا ہے جو فردوسی کے لئے بنایا گیا تھا اس زمانے کے تاریخی پتھروں میں سے جو پتھر اپنی اصلی حالت میں باقی ہے وہ خود اعلیٰ حضرت سلطان محمود کا سنگِ مزار ہے یہ رخام اعلیٰ اور شفاف سے بنایا گیا ہے کہ اس کی مانند پتھر کم نظر آتے ہیں شبلی شعر العجم میں لکھتے ہیں کہ اس وقت غزنی میں دار العلوم کے علاوہ ایک عجائب خانہ بھی تھا جس میں اشیاء نادر اور گراں بہار کھی ہوتی تھیں غزنی کی ان بیش بہا اور تاریخی چیزوں میں سے مانی کی کتاب ارتنگ بھی تھی ابو المعالی محمد الحسینی علوی البلخی

نے اپنی کتاب بیان الادیان میں جو سال ۴۸۵ ہجری میں تالیف کی گئی لکھا ہے کہ کتاب ارتنگ مانی خزانہ غزنی میں موجود ہے اس وقت غزنی کو جو عظمت و شہرت حاصل تھی اس کا حال ابن اثیر کی مندرجہ ذیل روایت سے قیاس کیا جا سکتا ہے ابن اثیر ۵۱۰ھ ہجری کے واقعات میں لکھتا ہے۔ جب سلطان سنجر سلجوقی بہرام کو تخت غزنی پر بٹھانے کے لئے آیا اور بہرام شاہ کے بھائی ارسلان شاہ نے شکست کھائی تو مال غنیمت میں دوسری اموال کے ساتھ سلطان سنجر کو پانچ شاہی تاج بھی ملے۔ جن میں سے ہر ایک کی قیمت ہزار دینار تھی ایک ہزار او تین سو قطعات جڑاؤ سونے کے ہاتھ آئے امین احمد رازی مؤلف ہفت اقلیم کہتا ہے کہ اس وقت کے غزنی کی وسعت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے مدرسوں اور مسجدوں کی تعداد بارہ ہزار کے قریب تھی۔

عینی غزنی کی عمارتوں کے متعلق لکھتا ہے کہ سلطان محمود کے ہاتھیوں کے واسطے ایک ہزار احاطے تعمیر کئے گئے تھے۔ اور ہر ایک احاطے میں فیل بانوں کے واسطے ایک بڑا مکان بنایا گیا تھا۔

بیہقی لکھتا ہے کہ ایک بار مسعود پسر یمین الدولہ نے جنگ کے لئے سفر کرنے سے پیشتر پیلان شاہی میں سے ایک ہزار آٹھ سو ستر نر و مادہ ہاتھی پسند کئے غزنی کی دوسری عمارتوں میں سے وہ بند تھے جن سے غزنی کی آبیاری ہوتی تھی۔ بابر نے اپنے تزک میں ان بندوں کا ذکر کیا ہے ایک بند کا نام بند سلطان۔ دوسرے کا سخن (ممکن ہے کہ یہ زن خان ہو) اور تیسرے کا نام بند سردہ بتاتا ہے۔ یہ اب بھی اسی نام سے معروف ہے۔ جب سلطان علاء الدین نے غزنی کو تباہ کیا تو ان بندوں کو بھی تباہ کر دیا۔ (اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں شہید نے بند سلطان کی مرمت کرائی تھی) اور بند سردے کی مرمت اعلیٰ حضرت محمد نادر شاہ کے حکم سے کی گئی تھی۔

سنائی کے عہد میں غزنی شوکت و تجمل کے منتہائے عروج پر تھا اور سنائی خود اس پر مباہات کرتے ہیں۔

اگرت آرزوئے معراج است   خاک غزنی ترا بہ از تاج است

اگر تجھے عروج کی آرزو ہے تو غزنی کی خاک تیرے لئے تاج سے بہتر ہے

اور حدیقہ میں فرماتے ہیں

عرصۂ مملکت چو باغ بہشت مشک ازفر سرشتہ باگل وخشت

عرصۂ مملکت باغ بہشت ہے اس کی تعمیر میں اینٹیں مشک ازفر کے گارے سے لگائی گئی ہیں

خاک ایں مملکت شدہ کافور چشم بد باد ازیں حوالی دور

اس ملک کی خاک بھی کافور ہے چشم بد اس سے دور رہے

گر بہ بینی تو مملکت غزنین باز نہ شناسی از بہشت بریں

اگر تو غزنی کو دیکھے گا تو اس میں اور بہشت بریں میں امتیاز نہ کر سکے گا۔

معاصرین سنائی

سلاطین | اس باب میں کہ سنائی نے سلاطین غزنی میں سے کس کا زمانہ پایا۔ مورخین کے درمیان اختلاف ہے، دولت شاہ سمرقندی لطف علی بیگ آذر صاحب خزینہ وصاحب مجمع الفصحا کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سنائی سلطان ابراہیم ابن مسعود کے معاصر تھے۔ یہ لوگ۔ کہتے ہیں کہ جب سنائی مجذوب لائے خوار سے دوچار ہوا اس وقت اس نے سلطان ابراہیم کی مدح میں قصیدہ لکھا تھا۔

صاحب مجمع الفصحا کی رائے ہے کہ سنائی کا قصیدہ سلطان ابراہیم کی تعریف میں تھا اور سنائی سلطان محمود یمین الدولہ کے اخیر عہد میں پیدا ہوئے۔

فرشتہ لائے خوار کے واقعہ کو عہد مسعود سے منسوب کرتا ہے لیکن اس تحریر سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کون سا مسعود مراد ہے، سلطان محمود کا فرزند مسعود شہید یا سلطان ابراہیم کا بیٹا مسعود تذکرہ دولت شاہ سے دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سنائی نے ابراہیم کے آخر عہد میں شاعری شروع کردی تھی دولت شاہ مختاری کے اس قصیدے کو جو ردیف شین میں ہے سلطان ابراہیم کی مدح میں سمجھتا ہے اور اس کے مطلع کو اس طرح لکھتا ہے

ع مسلماں کشتن آئین کرد چشم نامسلمانش

مختاری کے تمام قصائد میں یہ مطلع کسی قصیدے کا نہیں اور اگر یہ قصیدہ وہی ہے جس کا ذکر دولت شاہ نے کیا تو اس قصیدے میں مختاری نے سنائی کی تعریف کی ہے

سنائی را ہلت ہا بخش تا او ہم چناں مدحے · بپردازد کہ ہمتا نیست اندر شعر اقرانش

فرو اندیش تا او را چہ قادر خاطری بخشد · کہ در معنی و لفظ خویش مسلم کرد عثمانش

اس قصیدے سے اور خصوصاً اشعار مذکورہ بالا سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سنائی نے عہد ابراہیم میں بھی شعر کہے تھے جامی نے نفحات میں سنائی کے قصیدے کو سلطان محمود کے نام بتلایا ہے لیکن جیسا کہ خود سنائی کے بیان اور تاریخی استدلال سے ثابت ہوتا ہے حقیقت حال صرف اسی قدر ہے کہ سنائی نے سلطان ابراہیم کا عہد تو دیکھا لیکن اس عہد میں ان کی شاعری کا آغاز نہیں ہوا تھا یا کم از کم مجذوب کی بڑ اور سلطان کی تعریف میں قصیدہ کہنے کا واقعہ نہیں ہوا اس لئے کہ سنائی نے بقول خود حدیقہ کی تصنیف ۵۲۵ھ میں مکمل کی چنانچہ فرماتے ہیں

پنج صد بست و چار رفتہ ز عام · پنج صد بست و پنج گشتہ تمام

ایک اور جگہ فرماتے ہیں

عمر دادم ۰ بہ جملگی برباد · بر من آمد ز شصت صد بیداد

میری تمام عمر برباد ہوگئی۔ ۶۰ سالہ ہونا میرے لئے تکلیفوں کا موجب بن گیا

ایک اور جگہ ارشاد ہوتا ہے

پائے بر بائم آمد از غم شصت · لا جرم دست میزنم بر دست

۶۰ سالہ ہونے کے غم نے جینے سے مجبور کر دیا۔ اب کف افسوس مل رہا ہوں

اس صورت میں کہ سنائی کی عمر حدیقہ کی تالیف کے وقت ۶۰ سال تھی اور وفات ۵۴۵ ہجری میں ہوئی ان کی عمر ۸۰ یا ۸۵ سال کے قریب تھی سلطان ابراہیم نے بقول منہاج سراج ۴۹۲ھ میں وفات پائی سلطان کی وفات کے وقت سنائی کی عمر ۲۷ سال کے قریب ہوگی اور ۴۶۲ھ میں جب سلطان ابراہیم نے

---

[1] ابن اثیر و گذیدہ ۱۲

ہندوستان پر لشکر کشی کی سنائی کی عمر سات سال کے قریب ہوگی اور یہ خود سنائی کی شاعری کے منافی ہے اس کے علاوہ سنائی کے اقوال میں کسی جگہ بھی سلطان ابراہیم کا ذکر موجود نہیں۔ صاحب مجمع الفصحا کا یہ قول کہ سنائی کی ولادت سلطان یمین الدولہ محمود کے آخر عہد میں ہوئی صحت سے بعید ہے اس لئے سلطان محمود نے بقول جملہ مورخین ۴۲۱ھ میں وفات پائی، اور سنائی نے ۵۴۵ھ میں۔ مگر سنائی کی ولادت سلطان محمود کے سال وفات میں ہوئی ہو تو اس صورت میں سنائی کی عمر ۱۲۴ سال ٹھہرتی ہے اور یہ حد عمر طبعی سے زیادہ ہے، دوسرے یہ کہ سنائی نے حدیقہ میں اپنی جو عمر بتائی ہے اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ ان کی عمر ۸۰ یا ۸۵ سال کے قریب ہوئی۔

مختاری کا قصیدہ بھی اس امر کی دلیل نہیں بن سکتا سنائی نے سلطان ابراہیم کے عہد میں شاعری شروع کی تھی اول اس وجہ سے کہ قصیدہ میں ممدوح کا نام نہیں لیا گیا اور یقین کے ساتھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ یہ سلطان ابراہیم کی مدح میں ہے دوسرے اس قصیدہ میں ممدوح کو ہندوستان کے انتظام کی ترغیب دی گئی ہے۔

بہ ہندوستاں کن کارے چناں کاسپے پراز حشمت   کہ عبرت نامہ سازند مردان در خراسانش

ہندوستان میں وہ کارنامہ کر جس سے خراسان کے لوگ سبق حاصل کریں

سلطان ابراہیم نے جیسا کہ مذکور ہوا ۴۷۲ھ میں ہندوستان پر فوج کشی کی تھی اس وقت سنائی کی عمر کم از کم بیس سال ہونی چاہئے تھی کہ سلطان کی مدح کر سکتا اور یہ پہلے ہی واضح کیا جا چکا ہے کہ سنائی کی عمر اس وقت سات سال تھی۔ اس سے ثابت ہوا کہ سنائی کی ولادت سلطان ابراہیم کے عہد میں ہوئی اور انھوں نے سلطان مسعود پسر ابراہیم کے عہد میں شاعری شروع کی جو بہرام شاہ کے عہد میں ختم ہوئی۔

سلطان ابراہیم ظہیر الدولہ | سلطان ابراہیم بن مسعود (انار اللہ برہانہ) اپنے بھائی فرخ زاد کی وفات کے بعد تخت نشین ہوئے (فرخ زاد نے ۴۵۱ھ میں بعارضہ قولنج وفات پائی) اس وقت تخت و تاج محمودی حوادث روزگار کا کھلونا بنا ہوا تھا ایک طرف امرا کا نفاق اندرون ملک سلطنت کی جڑوں پر تبر چلا رہا تھا دوسری طرف ترکان سلجوقی کا بڑھتا ہوا اقتدار اس کی بنیاد پر ہتھوڑے لگا رہا تھا۔ سلطان ابراہیم کے پیش نظر دو مقاصد

تھے ایک آلِ سلجوق کے فتنہ کو کچلنا جو خاندان سلجوق کے دیرینہ دشمن تھے اور دوسری طرف ملک کے داخلی نظام میں ترمیم واصلاح جس کی خرابی تباہی کو قریب تر لا رہی تھی۔

سلطان نے پہلا اقدام جو کیا وہ داؤد بن میکائیل سلجوقی سے صلح اور بھائی بندی کا عہد تھا۔ ابن اثیر رقم طراز ہے کہ سلطان ابراہیم نے ۴۵۱ھ میں داؤد سلجوقی سے صلح کرلی دونوں بادشاہوں کو یہ احساس تھا کہ جنگ سے خونریزی اور لشکروں کی زحمت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ اس واسطے ایک دوسرے کے متصرفات کی حفاظت کا عہد کرلیا۔ منہاج سراج رقم طراز ہے کہ جب داؤد کو سلطان ابراہیم کے جلوس کی خبر پہنچی معززین خراسان کو بھیج کر سلطان سے صلح کرلی سلطان ابراہیم خانوادہ سبکتگین کے مردان کار آزمودہ میں شمار ہوتا ہے وہ عظمت محمود کے چراغ کو مکرر روشن کرنا اور اسلاف کی مفتوحہ کشور کو از سر نو مسخر کر کے اپنی سلطنت کی حدود بڑھانا چاہتا تھا لیکن اس راہ میں بڑی بڑی مشکلیں حائل تھیں۔ سلطان محمود کی وفات کے بعد اس خاندان میں جو نفاق پیدا ہو گیا تھا وہ بڑھتا جارہا تھا اور جس نسبت سے یہ نفاق ترقی کر رہا تھا اسی نسبت سے خاندان محمودی کی طاقت کم ہو رہی تھی اور دشمنوں کی طاقت بڑھتی جاتی تھی۔

ناصر دین اللہ سلطان مسعود کا اپنے بھائی امیر محمد کے ہاتوں شہید ہونا۔ مسعود اور محمود کے جمع کئے ہوئے مال غنیمت کا غزنی کی فوج کے ہاتھ آنا۔ حق ناشناس طغرل کی شورش اور خاندان محمودی میں قتل عام کا ہونا ایسے جانگداز صدمے تھے کہ ان سے پیچھے بعد دیگر اس خاندان ذی شان کے اقتدار کو سخت نقصان پہنچا جس وقت ظہیر الدولہ ابراہیم نے تخت سلطنت غزنی پر جلوس فرمایا اس وقت سلطنت محمود کے دو بڑے حصے یہاں تک بلخ، بست اور ہرات بھی سلاجقہ کے قبضہ میں تھے[1] بہر حال ابراہیم نے غزنی میں اپنی سلطنت کی بنیاد کو مستحکم کیا اور ہندوستان میں اپنے اقتدار کا اثر بڑھایا منہاج سراج لکھتا ہے کہ سلطنت غزنی میں حوادث ایام اور وقائع عجیبہ کے باعث جو خلل پڑ گیا تھا سلطان ابراہیم کے عہد میں اس کا ازالہ ہو گیا مملکت محمودی از سر نو سرسبز و آباد ہونے لگی ابن اثیر و ابو الفداء سلطان ابراہیم کو شاہ عادل دعا گو کریم کہتے ہیں اور اس کے فضل و دانش کی تعریف کرتے ہیں ان مورخین کا بیان ہے کہ سلطان سال بھر میں

[1] اسکی تفصیل تاریخ سلاجقہ مؤلف عماد کاتب

ایک بار کلام مجید کو اپنے ہاتھ سے لکھتا اور کعبہ شریف میں بھیج دیتا۔ ہر سال تین مہینے روزہ رکھتا۔ فرشتہ بحوالہ جامع الحکایات رقم طراز ہے کہ سلطان ابراہیم ہر سال ایک بار امام یوسف سجاوندی کو اپنی مجلس میں بلاتا امام یوسف وعظ اور پند کے دوران میں جو سخت باتیں بے محابا کہتے سلطان ان سے آزردہ نہ ہوتا۔ دولت شاہ سمرقندی بحوالہ مقامات ناصری رقم طراز ہے کہ سلطان راتوں کو غزنی کے محلوں میں گھومتے اور یتامیٰ اور بیوگان کو اپنے ہاتھ سے کھانا دیتے۔ سلطان کے عہد میں تمام بیماروں کو دوا اور غذا حکومت کی طرف سے مہیا کی جاتی سلاطین سلجوقی سلطان سے تعلیم حاصل کرتے اور اس کا احترام بجالاتے۔

سلطان ابراہیم کے عہد میں غزنی کی فوج نے شہر سکلکند[1] پر حملہ کر کے اس کو لوٹ لیا اور سلطان ملک شاہ سلجوقی کے چچا عثمان کو جو امیر الامرا کا لقب رکھتا تھا گرفتار کر کے غزنی لے آئی سلطان ابراہیم نے اسی سال ہندوستان پر فوج کشی کی اور لاہور کے قریب قلعہ اجودھن[2] کو فتح کر لیا۔ محصور فوج نے جس کی تعداد دس ہزار تھی ہتھیار ڈال دئے سلطان اجودھن کی تسخیر کے بعد قلعہ رودپال پر حملہ آور ہوا۔ ابن اثیر رقم طراز ہے کہ قلعہ رودپال ایک پہاڑی پر واقع تھا قلعہ کے ایک طرف دریا رواں تھا اور دوسری طرف ایک گھنا جنگل واقع تھا قلعہ کی طرف صرف ایک پگڈنڈی جاتی تھی اس کے سوا اور کوئی راہ نہ تھی۔ اس قلعہ کی حفاظت کے لئے ایک کثیر فوج موجود تھی محصور فوج کے پاس ہاتھی بھی تھے لیکن سلطان نے عزم آہنی سے قلعہ کو فتح کر لیا۔ اس کے بعد دوسرے دو مقامات کو تین مہینے اور اٹھارہ روز کے محاصرہ کے بعد فتح کر لیا اور بکثرت مال غنیمت لے کر غزنی واپس آیا۔ ابو الفرج رونی نے اس فتح کی نسبت میں قصیدہ لکھا ہے۔ سلطان ابراہیم کے عہد کے دوسرے اہم واقعات میں سے یہ ہے کہ سلطان نے ملک شاہ سلجوقی کی بیٹی سے اپنے فرزند مسعود کا عقد کر لیا۔

منہاج سراج ملک شاہ کی دختر کا نام عہد عراق میں بتاتا ہے اور فرشتہ بھی اس کی تائید کرتا ہے ابن اثیر لکھتا ہے کہ مسعود کی شادی میں آل سلجوق کے مشہور وزیر نظام الملک نے ایک لاکھ دینار اپنے

---

[1] سکلکند بفتح اول و سکون ثانی طخارستان میں ایک بستی کا نام ہے معجم البلدان [2] یہ وہ قلعہ ہے کہ جہاں بابا فرید شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔

مال سے خرچ کئے۔

سلطان ابراہیم کے عہد کے دوسرے واقعات میں وہ حیلہ بھی قابل ذکر ہے جو اس نے ملک شاہ سلجوقی کے ساتھ کیا اور اس کو مشرق میں جنگ کا بڑا حیلہ سمجھا جاتا ہے۔

واقعہ یہ تھا کہ سلطان ملک شاہ سلطان ابراہیم کے ساتھ عہد نامہ صلح ہونے سے پہلے غزنی پر حملہ آور ہونا چاہتا تھا۔ جس وقت اس کی فوج حملہ کرنے کے لئے جمع ہوگئی سلطان ابراہیم نے ایک تدبیر سوچی اور اپنی طرف سے ملک شاہ کے امرائے لشکر کے نام ایک مکتوب لکھا اور اس میں درج کیا کہ آپ نے عہد کیا ہے کہ جس وقت ملک شاہ کا اور میرے لشکر کا مقابلہ ہوگا اس وقت ملک شاہ کو گرفتار کرکے میرے حوالہ کردوگے میں آپ کے اس عہد سے بہت خوش ہوں۔ اس مکتوب کو سربمہر کرکے ملک شاہ کے لشکر میں بھیج دیا اور قاصد سے کہہ دیا کہ ملک شاہ کے حضور میں پہنچ جانا۔ اور اول مکتوب لانے کا اقرار نہ کرنا۔ ملک شاہ مجبور کرے تو اس وقت یہ مکتوب اس کو دے دینا۔ ملک شاہ کو شکار کا بہت شوق تھا قاصد جنگل میں ہی ایک مقام پر اس کے سامنے پہنچ گیا۔ ملک شاہ نے اس سے ہر چند استفسار کیا لیکن اس نے جواب نہ دیا۔ آخر ملک شاہ نے حکم دیا کہ اس کے تازیانہ لگائے جائیں۔ قاصد کے تازیانہ زنی کے وقت مکتوب اس کے کیسہ سے نمایاں ہوگیا۔ ملک شاہ اس مکتوب کو دیکھ کر اپنے امرا سے بدظن ہوگیا اور جنگ کا ارادہ ملتوی کردیا۔ سلطان ابراہیم کی وفات کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض مورخین سال وفات ۴۸۱ھ بتاتے ہیں محققین متاخر کے نزدیک دوسری روایت صحت سے زیادہ قریب ہے۔

سلطان علاءالدولہ مسعود بن ابراہیم (مسعود ثالث) | سلطان مسعود بن سلطان ابراہیم بن سلطان مسعود بن سلطان محمود بقول ابن اثیر ۴۸۱ھ میں تخت بادشاہی پر جلوس فرما ہوتے۔ طبقات ناصری میں بقول منہاج سراج ان کا سال جلوس ۴۹۲ھ ہجری تھا۔ سلطان مسعود خاندان محمود کا نیک نام بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں غزنی راحت و آرام کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ سلطان نے سلجوقیوں کے حملے سے اپنی سلطنت کو محفوظ کرلیا تھا اور ہندوستان میں اپنی سلطنت کی حدود بڑھالی تھیں۔ مسعود کی افواج دریائے گنگا کو عبور کرکے اس مقام تک پہنچی جہاں سلطان محمود کبیر کی فوج کے سوا امرائے اسلام میں سے کسی کی فوج نہیں پہنچی تھی۔

حکیم سنائی مسعود کے عہد میں خاندان محمودی کی سلطنت کو ایک سمندر سے تشبیہ دیتا ہے خاک غزنی کو آسمان بلند اور اس خاک کے نقش کو عرش کا ہمسر ٹھہراتا ہے دوسرے شعرا نے اس عہد کو غزنی کی نئی جوانی کے دور سے تعبیر کیا اور اس کی سعادت اور خوش بختی کی تعریفیں کی ہیں۔ اس عہد میں افواج غزنی دریائے گنگا کو عبور کر کے آگے بڑھیں۔

اور طغان تگین نامی سردار لشکر نے قلعہ جنگوان فتح کر لیا۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ سلطان نے شوال ۵۰۸ھ ہجری میں وفات پائی۔ بقول فرشتہ منہاج سراج سلطان نے ۵۰۹ھ ہجری میں بمقام غزنی داعی اجل کو لبیک کہا۔

اگر سلطان کے جلوس کا سال ۴۹۲ھ مقرر کریں تو ان کی بادشاہی کی مدت ستّرہ سال تھی اگر ۴۸۱ھ فرض کریں تو یہ مدت ۲۸ سال ہوتی ہے۔ دولت شاہ نے سلطان مسعود کی حکمرانی کا زمانہ ساٹھ سال بتایا۔ اور یہ بالکل بعید از قیاس ہے۔

ارسلان شاہ تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ سلطان مسعود کی وفات کے بعد اس کا فرزند ارسلان شاہ تخت نشین ہوا لیکن حمد اللہ مستوفی تاریخ گذیدہ میں لکھتا ہے کہ مسعود کی وفات کے بعد اول اس کا بیٹا شیرزاد بادشاہ ہوا اور ایک سال کے بعد ارسلان شاہ نے اسے قتل کر کے عنان سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لی لیکن مسند فرمانروائی پر متمکن ہونے کے بعد سلطنت کے ثبات و قیام کی کوشش کرنے کی بجائے وہ اپنے خاندان کی تباہی و بربادی کا موجب بن گیا۔ اپنی والدہ مہد عراق کو ذلیل کیا اور آل سلجوق کو اپنے اوپر دلیر اور جری کر لیا جس انتظام کو مسعود اور ابراہیم نے از سر نو درست کیا تھا اس کا سلسلہ توڑ دیا۔ اپنے بھائیوں کو قید خانے میں ٹھونسا۔ بعض کو مار ڈالا۔ اور بعض کی آنکھوں میں سلائی پھروا دی لیکن بہرام شاہ اس سے بھاگ کر اپنے ماموں سنجر سلجوقی کی پناہ میں چلا گیا۔ سنجر اس وقت اپنے بھائی سلطان محمد کی طرف سے حکومت خراسان پر مامور تھا۔ اس نے بہرام شاہ کی حمایت کی اور ارسلان شاہ کو لکھا کہ بہرام شاہ کے ساتھ اچھا سلوک کرے لیکن ارسلان شاہ نے قبول نہ کیا۔ آخر کار سنجر نے بہرام شاہ کی مدد کے لئے ایک فوج تیار کی اور بہرام شاہ کو تخت و تاج دلانے کے لئے حملے کی تیاری میں مصروف ہو گیا۔

سنجر کے لشکر نے پوری تیاری کے بعد ابوالفضل نصر بن خلف حاکم سجستان کی قیادت میں غزنی پر حملہ کیا۔ارسلان شاہ کو ہزیمت پر مجبور کر دیا ارسلان شاہ نے ہر چند منت وسماجت کی اور حملہ آور فوج کے سرداروں کے لئے احسان کا جال بچھایا لیکن وہ اس میں نہ پھنسے۔سنجر خود بھی غزنی پہنچ گیا۔ارسلان شاہ نے اپنی والدہ مہد عراق کو سفارش کے لئے سنجر کے پاس بھیجا کہ اس کو بہرام شاہ کی مدد اور غزنی کی فتح سے باز رکھے۔مہد عراق بے شمار تحائف لے کر جس میں دو لاکھ دینار بھی تھے سنجر کے پاس پہنچی لیکن سنجر کو غزنی پر حملہ کرنے سے باز رہنے کی بجائے اس پر قابض اور متصرف ہونے کی ترغیب دی۔سنجر نے غزنی پر حملہ کیا شہر سے ایک فرسخ کے فاصلے پر دونوں افواج کی مڈبھیڑ ہوئی۔مورخین کا بیان ہے کہ اس معرکے میں ارسلان شاہ کے پاس تیس ہزار سوار کئی ہزار پیادے اور ایک سو بیس ہاتھی تھے ہر ایک ہاتھی پر چار سپاہی سوار تھے اور ہاتھیوں کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی گئی تھی لیکن لشکر اور اسلحہ کی کثرت کے باوجود ارسلان کو شکست ہوئی اور بقول ابن اثیر بہرام شاہ اور سنجر شوال ۵۱۰ھ ہجری میں فاتحاً اور متحداً داخل غزنی ہوئے سنجر نے چالیس روز غزنی میں قیام کیا اور ارسلان شاہ کی طرف سے پورے طور پر مطمئن ہونے کے بعد طوس چلا گیا لیکن زیادہ روز نہیں گذرنے پاتے تھے کہ ارسلان شاہ نے ہندوستان سے ایک لشکر لے کر غزنی کا قصد کیا۔بہرام شاہ مقابلے کی تاب نہ دیکھ کر بامیان چلا گیا اور سنجر سے مدد کا طالب ہوا۔سنجر نے پھر ایک لشکر جرار مرتب کر کے ارسلان شاہ کے مقابلے کے لئے بھیج دیا ارسلان شاہ لشکر سنجر کے آنے کی خبر سن کر غزنی سے چلا گیا اور ایک مہینہ تخت سلطنت پر جلوہ فرما رہنے کے بعد ایک کوہ نشین افغان قبیلہ کے پاس پناہ لی۔سنجر کی فوج نے تعاقب کر کے اسے گرفتار کر لیا اور سنجر کے پاس لے جانا چاہتے تھے لیکن بہرام شاہ نے روک دیا اور غزنی میں تلوار کے گھاٹ اتار دیا قتل کے بعد ارسلان شاہ کی نعش اس کے باپ کی تربت کے پاس دفن کر دی گئی ابن اثیر اور فرشتہ نے اس کی عمر ستائیس[۲] سال بتائی ہے اور منہاج سراج نے ۳۵ سال ابن اثیر کے نزدیک یہ واقعہ ۵۱۲ھ میں ہوا۔منہاج سراج کے نزدیک ۵۱۱ھ میں۔

بہرام شاہ | بہرام شاہ علم دوست اور معارف پرور بادشاہ تھا۔لیکن تدبیر وسیاست بادشاہی میں زیادہ دور اندیش نہ تھا۔

بہرام شاہ کے عہد سلطنت میں شعروادب کا نیا دور شروع ہوا۔ جس طرح سلطان محمود غزنوی نے شعروشاعری کو حیات جاوداں بخشی تھی اسی طرح شہریار کی عہد میں شاعری کا سنگ بنیاد اخلاق وتصوف کی اساس پر رکھا گیا۔ عصر محمودی نے فردوسی اور عنصری پیدا کئے تھے۔ بہرام شاہ کے عہد نے سنائی سے کسب افتخار کیا۔ شعراء کی جو قدر اور عزت عہد محمود انار اللہ برہانہ میں تھی وہی بہرام شاہ کے عہد میں تھی بہرام شاہ بھی سلطان محمود کبیر کی طرح اپنے ملک کے علما کی قدر کرتا تھا اور شعراء کے ساتھ محترمانہ پیش آتا تھا۔ اسی وجہ سے شعراء بھی اسے دل سے دوست رکھتے تھے۔

سید حسن شاعر کہتا ہے

سلطان یمین دولت بہرام شاہ شاہ　　　که اقبال او گرفت با انصاف در برم

سلطان یمین دولت بہرام شاہ کے اقبال نے انصاف کے ساتھ مجھے پہلو میں بٹھایا

اے کاشکہ پذیردے وکارش آمدے　　　تا جاں نہادہ در طبقے پیش او برم

کاش وہ قبول کرتا اور اس کے کسی کام آتی تو میں اپنی جان ایک طبق میں رکھ کر نذر کر دیتا

حکیم سنائی فرماتے ہیں

عرش اگر بارگاہ را زیبد　　　شاہ بہرام شاہ را زیبد

عرش اگر کسی کی بارگاہ کے لئے موزوں ہے تو بہرام شاہ کے لئے زیب دے گا

بر خور اے بر شدہ سپہر بلند　　　تو بہ پیرانہ سر از چنین فرزند

اے اونچے آسمان اپنی پیرانہ سالی میں اس فرزند سے فائدہ اٹھا

شہ جوان وجہان جوان و زماں　　　در اماں ہمچو روضۂ رضواں

بادشاہ جوان ہے جہان جوان ہے اور زمانہ روضہ رضواں کی طرح امن میں ہے

سلطنت بہرام شاہ کے عہد کی ایک یادگار کتاب کلیلہ ودمنہ کا ترجمہ ہے یہ کتاب مدتوں سے دنیا کے دانشمندوں اور عالموں کی منظور نظر تھی اول اس کو ابی جعفر منصور عباسی کے کاتب عبداللہ بن المقفع نے پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیا اس کے بعد بزمانہ خلافت مہدی ۱۶۵ھ میں عبداللہ بن الہلال الاھوازی نے

فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا اور مشہور وزیر یحییٰ بن خالد برمکی بلخی کی خدمت میں پیش کیا اور سہل بن نوبخت حکیم نے اس کو یحییٰ بن خالد کے لئے رشتۂ نظم میں منسلک کیا۔ آل سامان کے عہد میں نصر بن احمد نے اپنے معاصر علماء میں سے ایک کو حکم دیا کہ اس کتاب کو عربی سے فارسی میں ترجمہ کریں اس خاندان کے مشہور شاعر استاد رودکی نے اس کو فارسی میں منظوم کر دیا۔ دولت غزنوی کے عہد میں بہرام شاہ نے نصر اللہ بن عبد الحمید (۵۴۳ - ۵۵۹ء) کو حکم دیا کہ اس کو دوبارہ عربی سے فارسی میں عبد اللہ بن المقفع کے نسخہ سے ترجمہ کرے۔ نصر اللہ نے بہرام شاہ کے نام پر اس کا ترجمہ کیا۔ اور اس طرح ادب کی بڑی خدمت کی۔ اس کی محنت سے اس کتاب کو جو کئی ملتوں کے دانشمندوں کے افکار کا نچوڑ اور تجربات کا نتیجہ تھی زندہ کر دیا۔

بہرام شاہ پینتیس[۳۵] سال تک مسند فرمانروائی پر متمکن رہا اور اس مدت میں کئی بار ہندوستان پر فوج کشی کر کے نمایاں فتوحات حاصل کیں ایک بار محمد باہلیم نے جو ہندوستان میں ارسلان شاہ کا سپہ سالار تھا بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا۔

بہرام شاہ نے ۵۱۲ھ ہجری میں اس کو گرفتار کر لیا لیکن چند روز بعد اس کی جاں بخشی کر کے پھر ہندوستان کی سپہ سالاری پر سرفراز کر دیا۔ باہلیم نے پھر بہرام شاہ کی مخالفت پر کمر باندھی۔ بہرام شاہ اس کی گوشمالی کے لئے ایک لشکر جرار لے کر ہندوستان پہنچا نواح ملتان میں دونوں لشکروں کی مڈبھیڑ ہوئی۔ باہلیم کے لشکر نے شکست کھائی اور اپنے فرزند سمیت ایک دلدل میں اس طرح پھنس گیا کہ راکب اور مرکوب کا کوئی نشان نہ رہا۔ لیکن افسوس بہرام شاہ کے عہد میں غزنی کو جو خوشحالی نصیب ہوئی تھی وہ دولت مستعجل تھی اور جلد ہی محو اور ناپدید ہو گئی۔ بہرام شاہ نے غور کے شہریار آتش کردہ علاء الدین جہاں سوز کے بھائیوں کو قتل کر کے جس غلطی کا ارتکاب کیا وہ سلطنت غزنی کی بنیاد کو تباہ کرنے کا موجب ہوگئی۔

غزنی اور جہاں سوز یہ واقعہ اس طرح ہے کہ سلطان علاء الدین کا بھائی قطب الدین محمد بن عز الدین حسین معروف بملک الجبال غور میں اپنے بھائیوں سے کسی قضیہ کی بنا پر ناراض ہو کر غزنی چلا آیا۔ بہرام شاہ نے اس کو اپنا داماد بنا لیا اور غزنی میں ٹھہرا لیا۔ مخالفین نے بہرام شاہ کو قطب الدین کی طرف سے یہ کہہ کر

بدگمان کردیا کہ یہ آپ کے تخت وتاج کی فکر میں ہے۔ بہرام شاہ کے حکم سے قطب الدین کو پوشیدہ طور پر شربت میں زہر ملاکر ہلاک کردیا گیا یہ واقعہ قتل سوری کے بعد دوسری بار خاندان غزنوی اور غوری میں عداوت کا موجب بن گیا۔ سیف الدین غوری نے اپنے بھائی کے خون کا بدلہ لینے کے لئے ایک لشکر کے ساتھ غزنی پر حملہ کردیا۔ اور بقول فرشتہ بہرام شاہ مقابلہ کی تاب نہ لاکر کرمان چلا گیا۔ و بقول ابن اثیر ہندوستان چلا گیا۔ سیف الدین نے ۵۴۳ھ ہجری میں غزنی کو فتح کرلیا۔

باشندگان غزنی اگرچہ ظاہر میں سیف الدین غوری کے حامی تھے لیکن باطن میں اس نسبت وفا کے باعث جو سلاطین غزنی سے رکھتے تھے اور احسان و مروت کے ان حقوق کی بناء پر جو خاندان محمودی کے متعلق اپنے زیر سمجھتے تھے۔ بہرام شاہ کے ہواخواہ تھے اور اس سے خفیہ خط وکتابت جاری رکھتے تھے۔ سیف الدین نے مطمئن ہوکر اپنا لشکر غزنی سے غور بھیج دیا۔ بہرام شاہ نے وقت سے فائدہ اٹھاکر ۵۴۴ھ میں ایک بڑا لشکر مرتب کیا اور ابراہیم علوی کو سردار سپاہ بناکر غزنی پر حملہ کردیا۔

سیف الدین بھی غزنویوں کا ایک لشکر فراہم کرکے بہرام شاہ کے مقابلے کے لئے نکلا۔ لیکن جونہی دونوں لشکر مقابل ہوئے سپاہِ غزنی سیف الدین سے برگشتہ ہوکر اپنے قدیم ولی نعمت سے جا ملی۔ اور سیف الدین کو گرفتار کرکے بہرام شاہ کے حوالے کردیا۔ بہرام شاہ نے حکم دیا کہ سیف الدین کا منہ کالا کریں اور ایک مریل سے بیل پر بٹھا کر محلات غزنی کے گرداگرد گھمائیں اور غزنی کی عورتیں اس بیل کے گرد ایک دائرہ کی صورت میں دف بجا بجا کر سیف الدین کی ہجو میں باآواز بلند اشعار گاتی جائیں اور اس کے بعد سیف الدین کو پھانسی پر چڑھا دیں۔ جب سلطان علاء الدین کو یہ معلوم ہوا کہ اس کے بھائی کو ایسی ذلت اور رسوائی کے ساتھ ہلاک کیا گیا ہے تو اس کے انتقام کے لئے کمر باندھی اور غور اور غرجستان سے ایک لشکر مرتب کرکے سیف الدین کے خون کا بدلہ لینے کے لئے غزنی پر حملہ کردیا اور اس سے پہلے یہ رباعی جو خود اس نے تصنیف کی تھی قاضی القضاۃ غزنی کے پاس بھیج دی۔

اعضائے ممالک جہاں را بدنم جوئندۂ خصم خویش و لشکر شکنم

اعضائے ممالک جہاں کے لئے میں بدن کی حیثیت رکھتا ہوں میں اپنے دشمن کو تلاش کرتا ہوں اور لشکر شکن ہوں

گر غزنی را ز بیخ و بن بر نکنم بس من نہ حسین ابن حسین حسنم

اگر میں غزنی کی بنیاد اکھیڑ کر نہ پھینک دوں تو حسین کا بیٹا حسین نہیں ہوں۔

جہاں سوز اور بہرام شاہ کے لشکر کے درمیان تین بار لڑائی ہوئی تینوں بار بہرام شاہ کے لشکر کو شکست ہوئی آخری بار بہرام شاہ کی فوج کا سپہ سالار دولت شاہ جو اس کا فرزند تھا ہلاک ہو گیا اور بہرام شاہ دل شکستہ ہو کر ہندوستان بھاگ آیا۔

خواجہ رشید وزیر تاریخ جامعہ میں لکھتا ہے کہ بہرام شاہ اور علاء الدین کا مقابلہ آب باراں کے قریب ہوا۔ بہرام شاہ کے پاس بائیس۲۲ ہاتھی بھی تھے لیکن اس کے باوجود علاء الدین سے شکست کھائی۔ اور سردی سے بچنے کے لئے ایک کسان کی جھونپڑی میں پہنچا اور اس سے کہا تمہارے پاس کھانے کے لئے کیا چیز ہے۔ کسان نے فطیری روٹی اور پودینہ پیش کیا۔ بہرام شاہ طعام سے فارغ ہونے کے بعد استراحت کے لئے لیٹ گیا۔ اور کسان سے کہا کہ کوئی کپڑا لاؤ۔ اس نے کہا کہ اے جوان خدا کی قسم بیل کی جھول کے علاوہ میرے پاس کوئی کپڑا نہیں اگر تو اجازت دے تو وہ ہی تیرے اوپر ڈال دوں۔ سلطان نے کہا کہ اے بدبخت اس کا نام کیوں لیا۔ خیر اب جلدی کر اور میرے اوپر ڈال دے دوسرے روز کسان نے سلطان کو پہچان لیا اور کہا کہ اس شجاعت اور فیلان جنگی اور مردان شجاع کے باوجود آپ نے ایک غوری سے کیوں شکست کھائی سلطان نے کسان سے کہا اپنا بیلچہ اٹھاؤ کسان نے اس کی تعمیل کی۔ سلطان نے کمان اٹھا کر بیلچے پر تیر چلایا۔ تیر بیلچے سے بآسانی گذر کر زمین میں جا گرا۔ سلطان نے تبسم کیا اور کہا کہ زور بازو کا یہ تو حال ہے لیکن نصیب روگرداں ہے۔

کہتے ہیں کہ سلطان علاء الدین اس حد تک خشمگیں تھا کہ لڑائی کے وقت سرخ اطلس کا جامہ پہنا۔ حاضرین نے عرض کی کہ اس میں کیا حکمت ہے۔ فرمایا کہ جب میرے اعضاء زخمی ہو جائیں اور خون جسم پر رواں ہو تو میری فوج کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ میں زخمی ہوں اور میری آنکھ بھی خون کو نہ دیکھے۔ آخر کار علاء الدین نے غزنی کو فتح کر لیا اور اپنے دو بھائیوں کا انتقام لینے کے لئے ایک قول کے مطابق تین شبانہ روز اور ایک قول کے مطابق سات شبانہ روز شہر میں قتل و غارت اور آتش زنی کا بازار گرم رکھا۔ دارالعلوم شرقی

کو جلادیا۔ محمود کی خوابگاہ کو اس کی اولاد کے خون سے رنگین کیا۔ اور حکم دیا کہ سبکتگین اور محمود اور مسعود اور ابراہیم کے سوا تمام سلاطین محمودی کی ہڈیاں قبروں سے نکال کر جلادی جائیں ان سات روز میں علاءالدین غزنی کے قصر سلطنت میں محو عیش رہا۔ سات روز کے بعد لشکر کو قتل غارت سے ہاتھ کھینچنے کا حکم دیا اور یہ اشعار اپنی مدح میں لکھے اور مطربوں کو اپنے حضور میں گانے کا حکم دیا۔

جہاں داند کہ من شاہ جہانم چراغ دودمانِ غوریانم

دنیا جانتی ہے کہ میں شاہ جہاں ہوں۔ اور خاندان غوریان کا چشم و چراغ ہوں

علاءالدین حسین ابن حسینم کہ دایم باد ملک جاودانم

علاءالدین حسین ابن حسین ہوں میرا ملک ہمیشہ رہے

چو بر گلگونِ دولت بر نشینم یکے باشد زمین و آسمانم

جب میں سمندِ دولت پر سوار ہوتا ہوں تو میرے لئے زمین اور آسمان ایک ہو جاتے ہیں

ہمہ عالم بگردم چو سکندر بہر شہرے شہے دیگر نشانم

لوگ سکندر کی طرح میرے گرد بھی جمع ہیں ہر شہر میں ایک نئے بادشاہ کو تخت نشین کرتا ہوں

بر آں بودم کہ از نعماں بہ غزنی ز تیغ تیز جوئے خوں برانم

میرا ارادہ تھا کہ نعمان سے غزنی آکر تیغ تیز سے خوں ریزی کروں

ولیکن گندہ پیرانند و طفلاں شفاعت می کند بخت جوانم

لیکن یہاں بوڑھے اور بچے رہ گئے ہیں اور میرا بخت جواں ان کی جاں بخشی کی سفارش کرتا ہے

بہ بخشیدم بہ ایشاں جان ایشاں کہ بادا جان شاں پیوند جانم

میں نے ان کی جاں بخشی کردی ہے ان کی اور میری جان ہمیشہ وابستہ رہے

ہمارا عروج و زوال

از
جناب پروفیسر عبدالماجد صاحب
(سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیمات اسلامی (بہار))

اوروں کی بے عملیوں کے الزامات ہمارے سر تھوپے جاتے ہیں ہمیں حیرت ہے کہ اس علم و روشنی کے دور میں اتنی تاریکی اور واقعات و حقایق سے اتنا بُعد ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ رہبانیت کی تعلیم اور ترک عمل کی تلقین ترک دنیا کی ہدایت کاروباری عالم سے ہمیں کتنا دور پھینک سکتی ہے یونان اور روم کے عروج و ترقی کی راہ میں پوپ سدراہ ہوئے طرح طرح کی مشکلیں پیدا کیں یہاں تک کہ بالآخر قوم کو ان سے بغاوت کرنی پڑی۔ اس سے تو ہم واقف ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ برآمد کرنا کہ مذہب اسلام کی تبلیغ و ہدایت بھی دنیاوی ترقی کی منافی ہے بڑا ظلم ہے۔ میں ایک عام فضا دیکھتا ہوں کہ دورِ حاضر کے نوخیز نَو دادگانِ سیاست مذہب کے نام سے بدکتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مذہب ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ وہ نہ تو اپنی پچھلی تواریخ سے استفادہ کرتے ہیں اور نہ مذہبی زندگی کو غور سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی ایک جماعت انھیں ایسی بھی نظر آتی ہے جو دنیا و مافیہا سے بے تعلق رہتی ہے۔ وہ صوفیاء کرام کی جماعت ہے یا علماء کا ایک ایسا گروہ ہے۔ جس نے اپنا فرض منصبی محض پڑھنا پڑھانا مقرر کر رکھا ہے۔ موخرالذکر جماعت تو آج بھی ترقی یافتہ دنیا میں بکثرت پائی جاتی ہے۔ یعنی اکثر فنون کے پروفیسر رات و دن اپنی فنی تحقیقات میں مصروف رہتے ہیں۔ میں نے سر، بی۔ سی۔ رائے سے ایک دفعہ ملاقات کی خواہش کی اور تیس منٹ وقت مانگا تو انھوں نے بہت غور کرکے کہا کہ تم بہار سے کلکتہ آئے ہو اور مجھ سے ملنا چاہتے ہو تیس منٹ وقت تو میں دو ہی صورتوں میں دے سکتا ہوں ایک تو شام کے ٹہلنے کے دوران میں دوسرے لابوریٹری کے اندر جب میں اپنے آلات

کیمیائی، مرتب کرتا جاؤں گا تم سے باتیں بھی کرتا رہوں گا۔ میں نے موخر الذکر وقت کو پسند کیا اور بجائے تیس منٹوں کے ایک گھنٹے باتیں کیں۔ غرض یہ ہے کہ جب تک علم و فن میں اتنا انہماک نہ ہو کوئی کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ہمارے علماء جو اپنے علم و فضل میں بلند مقام رکھتے ہیں وہ درس دینے کے بعد جو اوقات ہوتے ہیں وہ مطالعہ میں صرف کرتے ہیں اور دنیا و مافیہا سے کم تعلق پیدا کرتے ہیں۔

دوسری جماعت صوفیائے کرام کی ہے۔ اس جماعت کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ یہ سیاست کی شکست خوردہ جماعت ہے کیونکہ ابتدائے اسلام میں کوئی ایسی جماعت سنی نہیں جاتی جو عمل و جہاد سے الگ رہ کر عبادت میں وقت صرف کرتی سوائے چند اصحاب صفہ کے جن میں اکثر معذور تھے اور بعض عشق الٰہی میں از خود رفتہ۔ دنیا سے علیحدگی کنارہ کشی اور گوشہ نشینی کی ابتدا تو اس وقت سے وجود میں آئی جب یزید کی خلافت پر جبر یہ بیعت لی جانے لگی اور حق شناس بزرگ اس فتنہ سے بچنے کے لئے شہر سے دیہات اور دیہات کی بستیوں سے پہاڑوں کے دروں میں جا چھپے کیونکہ جنگ صفین کا نتیجہ دیکھ لینے کے بعد ان کی ہمت مقاومت پست ہو چکی تھی اور یہ سلسلہ دور عباسی کے اخیر تک جاری رہا کیونکہ اس دور میں اہل بیت رسول کے شیدائیوں کا گذر شہروں میں دشوار ہو گیا تھا۔

میں آپ کو اس جماعت کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہوں۔ جس نے عرب کے دور ظلم و استبداد کا مقابلہ کیا اور جس نے روم کی بڑھتی ہوئی ترقی کو پامال کر دیا جس نے ایران کی شہنشاہیت کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ جس نے نصف صدی کی مدت قلیل میں آباد دنیا کے نصف حصہ پر اپنا غلبہ قائم کیا اور ایک صدی ہوتے ہوتے فرانس سے ہندوستان اور ملایا تک اپنا سکہ بٹھلایا۔

اور یہ نہیں کہ کسی ملک پر انگریزوں کی طرح جس کی ترقی کی روشنی نے آپ کی نگاہوں کو چکا چوندھ کر دیا ہے۔ صرف سو ڈیڑھ سو برس تک کمزور سی سلطنت کی ہے اور جس نے سلطنت کا دار و مدار محض حکمت عملی اور فریب پر رکھا ہو بلکہ وہ جہاں گئے وہاں جڑ کاٹ دی آپ کو یہ خیال دلا کر پست کیا جا رہا ہے کہ اسپین سے مسلمان نکال دئے گئے۔ ہاں نکال دئے گئے کب نکال دئے گئے سات آٹھ سو برس کے بعد اور کب نکال دئے گئے اپنے دین سے غافل ہونے کے بعد کب نکال

دئے گئے۔ افتراق اور جنگ باہمی میں بری طرح الجھنے کے بعد۔ وہ نکال دئے گئے خدا اور رسول سے بغاوت کرنے کے بعد۔

میں آپ کو ان ہی برے دنوں سے متنبہ کرنا چاہتا ہوں۔ جو مجھے تیزی کے ساتھ سامنے آتے نظر آرہے ہیں۔ لیکن میں انھیں روکنے سے اپنے آپ کو معذور نہیں سمجھتا۔ میں ان کو اپنی قوت ایمانی سے زیادہ قوی نہیں پاتا۔ میں اپنے عزم اور اپنی جرأت کو سارے آنے والے خطروں پر غالب پاتا ہوں بشرطیکہ آپ ہماری باتوں کو دیوانوں کی بڑ نہ سمجھیں۔ ہمارے سامنے دلائل ہیں۔ میں اصول سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں سلسلۂ عروج وزوال سمجھانا چاہتا ہوں۔ میں آپ کو نفسیاتی اثرات سے پاک کرنا چاہتا ہوں میں آپ کے احساس کمتری کو دور کرنا چاہتا ہوں۔ میں آپ میں وہ اعصابی انحطاط پاتا ہوں۔ جس میں نروسنس (nervousness) کے جراثیم نشو ونما پاتے ہیں۔ اور بالآخر اعضاء انسانی کو مفلوج کردیتے

میرے دوستو اور عزیزو ہمارے طبیب حقیقی (حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) نے جب صدیق اکبر میں خوف وہراس کے آثار پائے۔ تو کیا کیا۔ وہ نسخۂ مجرب استعمال فرمایا جس کا اثر آج بھی ایک ایماندار انسان کے اعصاب میں تناؤ اور دل میں جوش اور خون میں گرمی پیدا کرنے کو کافی ہے وہ تھا آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک فقرہ " لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا نہ ڈرو اور نہ مغموم ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے عزیزو لفظ " معنا " (ہمارے ساتھ) کا اطلاق ہر اس شخص اور اس جماعت پر صادق آتا ہے جو " معہم " (ان کے ساتھ) ہے یوں سمجھو کہ جب تک ہم ان کے ساتھ ہیں اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ اور جب اللہ ہمارے ساتھ ہے دنیا کی کوئی طاقت کوئی جادو کوئی سحر ہم پر غالب نہیں آسکتا۔

اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ ہماری ترقی کا سبب کیا تھا۔ اور اب زوال کا سبب کیا ہے گبن (Gibbon) نے مسلمانوں کے عروج کا سبب یہ بتایا ہے کہ بانیٔ اسلام نے اپنے متبعین کے دل سے موت کا خوف اٹھا دیا تھا۔ لین پول (Lane Poole) نے کہا کہ مسلمانوں کی ترقی کا سبب ان کا اتحاد ہے۔ گلیڈاسٹن (GLADSTON) نے کہا ہے کہ جب تک مسلمانوں میں مساوات اور

رواداری ہے۔ کوئی ان کو مٹا نہیں سکتا اور ایک دوسری جگہ کہا کہ جب تک مسلمانوں میں قرآن ہے یہ قوم مٹ نہیں سکتی۔ یہ اخیر تجویز زیادہ وقیع ہے۔

دوسروں نے اسلام کو دور سے دیکھا اور اپنی عقل کے مطابق ایک رائے قائم کی جو ایک حد تک صحیح ہے۔ لیکن میں آپ کو آپ کی ترقی اور عروج کا گر بتا دینا چاہتا ہوں جس کی تفصیل فخرالدین رازی آٹھ آٹھ سو صفحے کی آٹھ جلدوں میں پورا نہ کر سکے وہ ہیں یہ دو فقرے۔ "ایمان" اور "اتباع سنت" میں دو پیراگراف میں دونوں کی تفصیل کا اختصار کر کے آپ پر چھوڑ دینا چاہتا ہوں کہ واقعی محض یہی دو چیزیں ساری ترقیوں کا سبب بن سکتی ہیں کہ نہیں۔

خدا کو ماننا۔ کائنات کا ایک خالق ماننا۔ اس کو ہر جگہ حاضر و ناظر ماننا۔ ہر چیز کا موجد۔ اور سبب ماننا یہ ماننا کہ وہی مارتا ہے وہی جلاتا ہے۔ وہی رزاق ہے۔ وہی مصائب کو دور کرنے کی طاقت رکھتا ہے اسی نے اشیاء میں افعال و خواص دئے ہیں۔ وہی ان کو بدل سکتا ہے۔ وہ نیکی پسند کرتا ہے اور برائی ناپسند کرتا ہے۔ نیکوں کی مدد فرماتا۔ ظلم و زیادتی کو بالآخر فنا کرتا ہے۔ وہی قوموں کی اور افراد کی قسمت بدل سکتا ہے۔ وہی فتح دیتا ہے۔ وہی مغلوب کرتا ہے۔ غرض وہ قادر مطلق ہے۔ حکیم ہے دانا ہے کوئی دوسرا اس کی قدرت میں شریک نہیں۔

اتباع سنت کیا ہے۔ خدا سے اتنا ڈرنا جتنا ڈرنا چاہئے۔ اس پر بھروسہ رکھنا۔ انسانوں کے ساتھ محبت کا برتاؤ۔ جانوروں کے درد دکھ کا خیال رکھنا۔ محتاجوں کی مدد کرنا۔ کسی کو اپنے آپ سے نیچا نہ سمجھنا۔ بے ضرورت وقت ضائع نہ کرنا۔ جسم اور کپڑے کو صاف وستھرا رکھنا بے ضرورت کوئی عمل نہ کرنا۔ اسراف نہ کرنا۔ مال جمع کرنے کے شوق میں نہ پڑنا۔ وقت کی پابندی کرنی۔ ہر وقت کے لئے کاموں کا مقرر کر دینا۔ خود غرضی اور نفس پروری سے باز آنا۔ حلال کھانا اور سچ بولنا۔

سنت کا اصل الاصول نیک عمل اور نیک اخلاق اور یہی انسانیت کا راز ہے۔ اقوام کے زوال کا سبب اخلاق کا بگڑ جانا ہوتا ہے اور نیک اخلاق پیدا ہو جانے سے قومیں بنتی ہیں۔ آپ یہ فرمائیں گے کہ بس اسی ایمان اور سنت پر عمل کرنے سے ساری دنیاوی ترقیاں ہو جائیں گی عقل کے

خلاف میں یہ کہوں گا کہ اس کو سچ ماننا ہی خلاف عقل ہے۔ کیونکہ عقل کے موجد عقل کے خالق اور عقل کو نشوونما دینے والے کا بتایا ہوا یہ راز ہے۔ مجھے خدا نے عقل بتائی ہے اور خدا کے بتائے ہوئے یہ طریقے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ جب مسلمانوں کو مصر کے قلعہ کے فتح کرنے میں دقت ہوئی تو رسول خدا کے فدائیوں نے یہ سوچنا شروع کیا۔ کہ شاید کوئی سنت ترک ہوئی ہے جس کی وجہ سے فتح میں دقتیں واقع ہو رہی ہیں۔ چنانچہ یہ بات بالاتفاق طے پائی کہ مسواک کرنا بھول گئے ہیں چنانچہ سب لوگوں نے مسواک کرنا شروع کی۔ مصریوں نے دیکھا کہ آج سب کے سب دانت سجا رہے ہیں شاید آج ہمیں چبا جائیں گے خوف کھا کر قلعہ خالی کر دیا۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کہاں تک خوش خیالی کو دخل ہے لیکن کیا آپ اس کو محال سمجھتے ہیں کہ اللہ پاک ہمارے کسی عمل یا کسی نیک خیال سے خوش ہو کر ہمارے دشمن کے دل پھیر دے۔

ہمارے نوجوان کہیں گے کہ عروج و ترقی کے لئے کوئی اقتصادی پلان ہونا چاہئے۔ اور کسی صنعت و حرفت کی طرف قوم کو متوجہ کرنا چاہئے نہ کہ محض بوسیدہ اور پارینہ خیالات کو قوم کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ میرے عزیزو کاشتکار جب کوئی فصل لگانا چاہتے ہیں پہلے زمین کی تیاری کرتے ہیں زمین کی تیاری میں جتنا وقت صرف کرتے ہیں۔ اور جس قدر سرگرمی سے مشغولِ کار ہوتے ہیں اس سے ہزار ہا گونا کم بیج بونے میں وقت لگاتے ہیں اس طرح قوموں کی ترقی اور عروج کے لئے پہلے اصلاحِ خیال اور اصلاحِ اخلاق کی ضرورت ہے۔ ورنہ بہتر سے بہتر اسکیم اعلیٰ سے اعلیٰ تدبیر بیکار ہو جاتی ہے جیسے بانگر زمین میں دانہ چھٹنے سے دانہ کو ضائع کرنا ہے۔ کیونکہ زمین میں صلاحیت دانوں کو چھپانے کی نہ ہوگی تو دانے پرندے کھا جائیں گے۔ اور جو پرندوں سے بچیں گے وہ کیڑے کھا جائیں گے۔ نہ کھیت سرسبز ہوگا اور نہ فصل تیار ہوگی۔

میں نے اس زندگی میں بہت ساری تجویزیں اور ان گنت پلان دیکھے۔ لیکن کسی کو پروان چڑھتے نہ دیکھا بلکہ اکثر ایسے ہوئے جن سے الٹا اثر پیدا ہوا۔ ابھی ہمارے سامنے کی مثالیں ہیں ہندوستان ہی کو لیجئے۔ کانگرس نے بڑی ترقی کی یہاں تک کہ تیس سال کی تگ و دو کے بعد ہندوستان کو غیر ملکی اثرات سے پاک کیا۔ غلامی دور کی آزادی لی۔ لیکن آج دیکھئے گلی کوچے میں غریب انسان یہی کہتے

کہتے ہیں کہ گاندھی جی کے سوراج سے انگریز راج کہیں بہتر تھا۔ کھانے کو غلہ اور پہننے کو کپڑا ملتا تھا۔ آج تو کھانے اور پہننے کو ترس گئے۔ وہ بات کیا تھی زمین ہموار نہیں تھی۔

گورنمنٹ نے طرح طرح کے پلان تیار کرتے ہیں لیکن غربت بڑھتی جاتی ہے سبب یہ ہے کہ افراد کی تربیت پوری طرح نہ ہو سکی۔ نفاق، عداوت، جنگ جدل، لوٹ مار، دھوکا فریب، جوا، بلیک مارکیٹنگ، رشوت، فضول خرچی۔ بخل، خود غرضی سارے عیوب موجود ہیں، ابھی چند دن ہوئے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے جاپان کا اقتصادی عروج دیکھا۔ صنعت اور تجارت کی ایسی ترقی کہ ہندوستان میں ہر یا ہر گزرہ جھلملے اور چمکدار کپڑے گھر گھر پہنچا دئے۔ جن کو دیکھ کر حیرت تھی۔ آج وہ قوم ہم سے زیادہ حقیر، ہم سے زیادہ پریشان اور ہم سے زیادہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔

جرمنی کی سائنس کی ترقی کا کیا پوچھنا ہے۔ جنگ اعظم میں طرح طرح کے حربے نکال دئے۔ وہ تیس من کا گولا کہ جس کی حالت سن کر ہم ہندوستان میں سہمے جا رہے تھے۔ انگلستان والوں کا کیا حال ہوگا۔ خدا ہی جانتا ہے۔ یکایک التوائے جنگ ہو گیا۔ جرمن کو اخراجات جنگ ادا کرنے پڑے۔ بیس برس تباہ حالی میں گذرے لیکن سائنس اک چیز تھی۔ پھر دوبارہ دم خم حاصل کر لیا۔ اور ساری دنیا سے لڑنے اور سب کو مغلوب کرنے کو تل گیا۔ وہ حیرت انگیز ایجادیں اور وہ روح فرسا حملے اور وہ ہمت شکن منصوبے کہ اللہ اللہ دنیا چشم براہ تھی کہ جرمنی کہاں کہاں پہنچتے ہیں اور کیا کیا اودھم مچاتے ہیں۔ مگر دیکھا یکایک کیا ہوا۔ ایٹم بم کی ایجاد بھی مکمل ہو گئی لیکن جرمنی کا وقار صفحۂ ہستی سے مٹ گیا برطانیہ کا وہ عروج کہ سلطنت میں آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا۔ وہ حکمت عملی وہ چاپلوسی۔ وہ ہشیاری وہ کیا دی کہ دنیا مقابلہ کرنے سے عاری تھی۔ ان کی ہر روش پسندیدہ ان کی ہر بات دلآویز۔ ہر ادا دلکش۔ اور ہر حکمت عملی عقلوں کو مفلوج کرنے والی۔ آج مصداق انھیں انگلیوں پر نچا رہا ہے۔ اور کوئی داؤ نہیں چلا اور کوئی جادو اس کے سر نہیں چڑھتا۔

آپ کیا مجھ سے یہ ہی توقع رکھتے ہیں میں آپ کو وہی ہلکی پھلکی تدبیریں بتاؤں جس سے چند دنوں کے تماشے دکھا کر سمینٹ لیا جائے۔ نہیں میں وہ بتاؤں گا جس میں اصلیت ہوگی حقیقت ہوگی۔

جس میں پائداری ہوئی۔ زراعت کرو تو وہ بیج لگاؤ افغان کی سرزمین پر بار آور ہوا اور ہزاروں سال سے قایم ہے۔ وہ پودا اجماؤ جو ایران کی سرزمین پر اگا اور آج تک موجود ہے۔ وہ پیڑ سجاؤ جو مصر میں بار آور ہوا اور ہو رہا ہے۔ وہ درخت اگاؤ جو عرب و شام میں جڑ پکڑ گیا ہے۔ پھیلا اور پھولا پھلا وہ کام کرو جس میں تائید غیبی شامل حال ہو جس کی طاقت انسانی تدبیر و کوشش سے کہیں بلند و بالا ہو جس کو حقیقت سے لگاؤ ہو۔

وہ کھیل کھیلو جو کھیلا جاتے اس مادی مجازی چند روزہ اور مٹ جانے والی دنیا میں اور اس کی داد ملے۔ نہ مٹنے والے۔ نہ بدلنے والے۔ ہمیشہ قایم رہنے والے عالم میں "رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً" میں وہ تدبیر بتاتا ہوں جس میں دنیا و آخرت دونوں عالم کی فلاح ہے قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى

میرے دوستو کیا تمہیں اس کا یقین نہیں کہ دنیا و مافیہا۔ اسی ایک مالک کے قبضہ و اختیار میں ہے۔ اس پر جس کو چاہتا ہے تسلط دیتا ہے۔ اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ جو دینے والا ہے اور جو دے کر چھین لینے والا ہے۔ اُس کی طرف جھکو۔ اُس سے اپنے تعلقات استوار کرو اس کو اپناؤ۔ میں اس سے بہتر کیا تدبیر بتاؤں اس سے اچھی کون سی اسکیم پیش کروں۔ وہ مسبب الاسباب ہے وہ تدبیریں سجھانے والا ہے۔ وہ راہیں نکالنے والا ہے اس وقت تو مجھے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ ساری راہیں بند معلوم ہوتی ہیں اور ساری تدبیریں مفلوج۔ اس لئے میں اسی کی طرف متوجہ کرانا چاہتا ہوں جو قوتوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ جو راہیں کھولنے والا ہے۔ جو اسباب پیدا کرنے والا ہے۔

آپ کو عرب کا حال معلوم ہے، عرب کی وہ پستی۔ وہ تاریکی و ظلمت، وہ دشمنی وہ عداوت، وہ خانہ جنگیاں، اور قبائلی استبداد، غربت و پستی کا حال نہ پوچھئے فردوسی نے ان کی معاشرتی زندگی کو یوں بلا اختصار بیان کیا ہے۔

پس از خوردن کرگس دسوسمار عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو تفو بر تو اے چرخ گردوں تفو

اس پستی اور بد حالی سے عربوں کو یکایک سربلندی اور عروج تک جس تدبیر نے کھینچ کر پہنچا دیا وہ محض طاقتِ ایمانی تھی۔ یا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اخلاق۔ اپنے پچھلے دور پر نگاہ ڈالو اور موجودہ حالت سے ملاؤ۔ اور اس تنزل اور انحطاط کے اسباب و علل پر غور کر دیکھو جو تدبیر اور جو علاج سمجھ میں آئے اس پر ہم اور آپ سب مل کر کاربند ہو جائیں۔

بمبئی، دلی اور کلکتہ جیسے بڑے شہروں میں دیکھتا ہوں کہ۔ ایک بٹن دبانے سے سارا گھر روشن ہو جاتا ہے پنکھے بھی چل پڑتے ہیں۔ چولہے بھی روشن ہو جاتے ہیں اور ہیٹر بھی گرم۔ کبھی ایسا بھی اتفاق ہوتا ہے کہ یکایک سارے گھر کے قمقمے بجھ جاتے ہیں پنکھے بند۔ چولہے ٹھنڈے۔ اور ہیٹر سرد۔ تفتیش ہوتی ہے کہ آخر کیا سبب ہے کہ یکایک جگمگاتے ہوئے قمقموں کی روشنی کیا ہوئی اور پنکھے بھی بند ہو گئے چولہے اور ہیٹر ٹھنڈے پڑ گئے۔ پاور ہاؤس میں تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ نہیں سڑکوں پر روشنی تو ہے۔ لامحالہ معلوم ہوتا ہے کہ کنکشن خراب ہو گیا ہے۔ یا تو عدم ادائیگی ٹیکس کی وجہ سے کمپنی نے تار کاٹ دیا یا یوں ہی تار کمزور ہو کر ٹوٹ گیا ہے یا تار کا رخ کسی اور طرف جا ملا۔

ان ہی اسباب میں سے کوئی سبب تو ہوگا۔ ورنہ وہ ہماری چمک دمک وہ شان و شوکت وہ رعب و داب وہ عزت و وقار یکایک کیوں مٹی میں مل گیا۔ اس خلاق عالم کا کاروبار اپنی جگہ پر ہے۔ وہ قومیں جو پست تھیں۔ وہ جماعتیں جو گری ہوئی تھیں وہ عروج پر ہیں اور ہم مائل بزوال۔ عرب نے تو فیکٹریاں کھول کر وہ دولت نہیں حاصل کی تھی کہ خیرات لینے والا کوئی منفرد ڈھونڈھنے سے نہیں ملتا تھا وہ امن و سکون کہ ایران سے مدینہ تک ہاتھوں میں اشرفیاں لئے چلا جائے کوئی اس کی طرف نگاہ بھی نہ کرے۔ کہاں کی چوری اور کیسا ڈاکہ، بات یہ تھی کہ ہمارا ایمانی سلسلہ اس قادر مطلق سے ملا ہوا ہمارا عمل تعلیم محمدی کے مطابق تھا اسی لئے ہماری ترقی بھی عقلوں کو متحیر کر دینے والی ہماری طاقت طاقتوروں کی ہمت توڑ دینے والی تھی۔

ہمارا سخن تکیہ ہوگیا ہے کہ زمانے کے مطابق کام کرنا چاہئے۔ زمانہ کے ساتھ چلنا چاہئے۔ لیکن تجربہ تو یہ ہے کہ ہر زمانے کی ترقی کو پست کرنے کے لئے اس قادر مطلق نے ایک نیا طریقہ کار ایجاد فرمایا۔ قوم عاد کی بڑی بڑی عمارتوں کو منہدم اور پست کرنے کے لئے تو منجنیق یا قلعہ شکن ڈائنامائٹ (Deanamaite) تیار کرنا تھا۔ لیکن ایک زلزلے نے اس قوم کو تباہ کردیا۔ اور ساری عمارتیں منہدم ہوگئیں۔ ثمود نے دیکھا کہ عاد زلزلے سے برباد ہو گئے، مکانات گرجاتے اور آدمی اس سے دب جاتے ہیں اس لئے پہاڑ کے چٹانوں میں کھود کھود کر مکانات بنائے تاکہ زلزلوں سے تباہ نہ ہوسکیں، تراخے کی ایک آواز پیدا ہوئی جس سے ساری قوم ہلاک ہوگئی۔ مکانات پڑے کے پڑے رہ گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا مقابلہ کرنا تھا اور فرعون کے پاس تو گھوڑوں کی کثیر التعداد فوج تھی۔ موسیٰ علیہ السلام کو گھوڑے خریدنے تھے، اور ایک فوج مرتب کرنی تھی۔ لیکن وہ کس طرح تباہ ہوا اور اس کی فوج کس طرح غارت ہوئی دریائے نیل میں ڈبا دیا گیا اور پوری فوج غرق ہو کر ہلاک ہوئی۔

ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں۔ روم اور ایران کی دو بڑی طاقتیں تھیں جو آپس میں ایک دوسرے سے لڑتی تھیں تو کبھی یہ ہارتی اور کبھی وہ بعثت کے تھوڑے دن قبل۔ دونوں میں جنگ ہوئی تھی تو ایرانیوں نے وینس پر اس طرح قبضہ کرلیا تھا کہ نئی قسم کی کشتیاں بنالی تھیں جس پر رومی حملہ نہیں کرسکتے تھے۔ ایرانی اپنی آہنی کشتی کی ٹھوکروں سے رومی کشتیوں کو ڈبا دیتے تھے غرض کہ دونوں کے پاس طرح طرح کے اسلحہ موجود تھے لیکن جب اسلامی فوج تبوک کو روانہ ہوئی تو ادھر چند ہزار فوجی اور بوسیدہ اسلحہ اور نہایت ناکافی رسد ساتھ لے گئے۔ ادھر رومیوں کی فوج دو لاکھ سے زیادہ اور مسلح جس میں پیدل کم اور گھوڑ سوار زیادہ یہاں دو آدمیوں پر ایک سواری مشکل سے تھی۔ دو ماہ تک وہاں ٹھہرے لیکن رومیوں کو مقابلے کی ہمت نہ پڑی۔ اور رفتہ رفتہ تمام سلطنت پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا۔

میں یہ بتانا چاہتا ہوں زمانہ ہمیشہ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ آپ کے لئے کسی منزل پر پڑاؤ نہ ڈالےگا کہ آپ اس کی رفتار سے آگے بڑھ سکیں۔ قومیں جب آگے بڑھی ہیں تو اسباب غیبی سے۔

بس قامت خوش کہ زیرِ چادر باشد! چوں باز کنی مادرِ مادر باشد!!

زبان جس میں تصورات و مفہومات کو ادا کیا گیا ہے علامہ عنایت اللہ مشرقی کے "تذکرہ" سے مستعار لی گئی ہے اور شروع سے آخر تک رَجز ہی رَجز ہے! کتاب کی زبان کو الہلال مرحوم کی لفاظیت کا احیاء قرار دینا صحیح نہیں! الہلال کے مدیر کا قلم جو جمالیاتی بوقلمونی رکھتا ہے اس کا یہاں ہلکا سا اثر بھی نہیں ملتا، تذکرہ، کے مصنف اور ہمارے مصنف دونوں کی زبان فلسفے اور شعر کے وقار و رنگینی سے یکساں بے گانہ ہے اور دونوں کے ہاں "ادعائے ہمہ دانی" بہ یک انداز فراوانی موجود ہے! بزرگوں کی نصیحت تھی کہ ع گرمی مجوئے الا ز آتش درونی، یہاں گرمی ملتی ہے لیکن یہ آتش درونی کا اثر نہیں معلوم ہوتی، درون تو تودہ خاک نظر آتا ہے "ملتِ ابلیسی" — انا خیر منہ "ہم عصروں پر مکروہ تنقید و خردہ گیری کی صورت میں پڑھنے والے کی رگوں میں آتش انتقام بھڑکا دیتی ہے اور وہ کتاب کو ہاتھ سے پھینک کر کہتا ہے ؎

نہ ہمرہی تو مرا، راہِ خویش گیر و برو ترا سعادت بادا، مرا نگوں ساری

علامہ اقبال کو سمجھنے کے لئے ہمارے مصنف کا دعویٰ ہے کہ فلسفے و عمرانیات (صفحہ ۵/ ۲۶۵) جدید و قدیم کے ساتھ نہایت بلند ادبی و شاعرانہ تخیل کی بھی ضرورت ہے لیکن پیش نظر کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا بلند بانگ رجز خواں مصنف دونوں دائروں میں اپنی محرومی کے خلاء کو زورِ الفاظ سے اس طرح پُر کرنے کی جرأت کرتا ہے کہ گویا دنیا میں اس کے سوا کوئی صاحبِ نظر موجود نہیں! پڑھنے والے کو حضرت مومن کا معاملہ یاد آتا ہے:

مومن تم اور عشق بتاں! اے پیر و مرشد خیر ہے یہ ذکر اور منہ آپ کا، صاحب خدا کا نام لو

دعویٰ تو یہ ہے کہ اقبال کے ہمہ گیر فلسفہ کی دراست کے لئے مقدمہ لکھا گیا ہے، تنقیدی (CRITICAL) اور تحلیلی (ANALYTICAL) طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور کتاب میں اقبال کے فلسفے کی نہ تحلیل ہی موجود ہے اور نہ تنقید ہی! ان کے ہم عصروں نے اقبال کے بنیادی خیالات کی جو تنقید و تحلیل کی ہے اس کو منہ زوری سے باطل و خرافات قرار دینا کافی نہیں! اپنی صحیح و باصواب تحقیق بھی پیش کرنی ضروری ہے اور اس کا

ان ۱۳۲ اوالے بقامت کہتر" عجالۂ ناقصہ" میں کہیں نشان تک نہیں ملتا! نقاد کو کہنا ہی پڑتا ہے:

طلب منصب فانی نکند صاحب عقل　　　عاقل آنست کہ اندیشہ کند پایاں را

بات یہ ہے کہ ع پایہ پیش آمد پس دیوار، دیوار کھڑی کرنے سے پہلے پایہ یا بنیاد قایم کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، مصنف رجز خواں کے ہاں زور الفاظ کے سوا نہ فلسفہ کی قابلیت نظر آتی ہے نہ عمرانیات کی، نہ بلند پایہ شاعرانہ تخیل ملتا ہے، نہ سیرت ساز ادبیت! کتابچہ میں نہ اقبال کے فلسفیانہ افکار کی تحلیل ہے نہ شاعرانہ خیالات کی توضیح یا تنقید! بتلائیے اقبال کے فلسفہ کے مخصوص و منفرد افکار نظریۂ خودی، رمز بے خودی، نظریۂ عشق و عقل، جبر و قدر، نظریۂ آرزو یا تمنا کے سوا اور کیا ہیں؟ شاعرانہ تخیل میں اقبال کی انفرادیت بس یہی تو ہے نہ کہ وہ ایک نصب العینی (IDEAL) شاعر ہیں، ہماری صدیوں کی بے مقصد شاعری کو وہ ملی نصب العین سے باندھتے ہیں، وہ اس صدی کا ایک عظیم الشان مصلح ادبیات اسلامی ہے! وہ ہم سے چھین لیا گیا اور اس کے اٹھ جانے سے ہماری دنیا تاریک ہوگئی ہماری بزم برہم ہوگئی۔

رفتم و از رفتن من عالمے تاریک شد　　　من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم!

مصنف کے ہم عصر علماء نے اقبال کے ان منفردات کی وضاحت کی ہے، ہمارے رجز خواں نے ان سب کی تصنیفات کو "مجموعہ اباطیل و خرافات" قرار دیا ہے اور خود ان پر ایک سطر بھی نہیں لکھی! وہ ان سب پر حملہ کرتا ہے نہیں جانتا کہ وہ خود اپنے ہی پر حملہ کر رہا ہے!

حملہ بر خود کنی اے سادہ مرد!　　　ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد!

زیر نظر کتابچہ پر سب سے زیادہ اہم تنقید بس یہی ہے، لیکن کہیں کہیں اس نے مذہب و فلسفہ پر اپنے خیال کا اظہار کیا ہے اور جہاں کہیں اس نے کوئی ایجابی بات کہی ہے اس کو پڑھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے،

نہ متبعت ز دنیا نہ ز دیں نصیب مظہر　　　بہ فنونِ بے کمالی چہ قدر کمال داری

ہمارے اس بیان کی تائید میں اس "عجالۂ ناقصہ" کے ان مقامات کی نشاندہی ہمارے لئے ضروری ہے:

ہم اہلِ حق سے انصاف کے خواہاں ہیں، یہ معاملہ دین و مذہب کا ہے، اس کے ماخذ کا ہے، اس سے معاشرہ کے تعلق کا ہے!

(۱) حقیقت وحی کے متعلق ہمارے مصنف کا الحاد: فرماتے ہیں کہ "اقبال نے حسب معمول (؟!!) اپنے پُر تمکین اور باوقار لہجہ میں کہا:

عقل بے مایہ امامت کی سزاوار نہیں — راہبر ہو ظن و تخمین تو زبوں کارِ حیات

فکر بے نور ترا اور عمل بے بنیاد — سخت مشکل ہے کہ روشن ہو شبِ تارِ حیات

خوب و ناخوب عمل کی ہو گرہ وا کیونکر — گر حیات آپ نہ ہو شارحِ اسرارِ حیات

"حقیقت وحی کے اس ملہمانہ خیال کو... سن کر ایک عجیب وجد اور سرشاری کی کیفیت تھی جو صرف محسوس ہی کی جا سکتی ہے الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی... یہ واقعہ ہے کہ حقیقت وحی کو جس ساحرانہ بلاغت ملہمانہ اختصار کے ساتھ اقبال نے اس قطعہ میں سمودیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے! الٰہیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے دیانت داری کے ساتھ اپنے اس تاثر کے اظہار میں مجھ کو کوئی تامل نہیں ہے کہ آج تک اسلامی فکر کی پیداوار عقاید و کلام کی بڑی سے بڑی سنجیدہ بحث میں بھی حقیقتِ وحی کے متعلق اتنی دور رس اور اتنی دل نشین فکر نہیں دیکھنے میں آئی...... اس نادر تخیل نے وحی کے متعلق اجنبیت اور غیریت کے ہر گونہ احساس کو یک لخت دور کر کے یہ محسوس کرا دیا کہ وحی باہر سے مجبور پر مسلط کیا ہوا کوئی اجنبی حکم نہیں بلکہ یہ تو خود انسانی ضمیر کی گہرائیوں سے ابلا ہوا چشمہ ہے.... اس طرح شریعت جس کا سرچشمہ وحی ہے انسان پر تھوپا ہوا کوئی اجنبی حکم نہیں بلکہ اعماقِ حیات سے نکلے ہوئے احکام کا مجموعہ ہے۔" (صفحہ ۲۳)

ع گر حیات آپ نہ ہو شارح حیات والے مصرعہ میں ہمارے لفاظ مصنف کے خیال کی رو سے علامہ اقبال نے حقیقتِ وحی کو ملہمانہ انداز میں ادا کر دیا ہے! اور وحی کی حقیقت کیا ہے؟ وحی حدیث نفس ہے! خدائے کائنات کی طرف سے "روح القدس کے ذریعہ خارج سے، الفنس و آفاق سے ماوراء قلوبِ انبیاء پر نازل کی ہوئی کوئی چیز نہیں، بلکہ حدیثِ نفس کی طرح اپنے ہی اندر سے نکلی ہوئی کوئی چیز ہے! "اعماقِ حیات" سے "ضمیر کی گہرائیوں سے ابلا ہوا چشمہ ہے"!!

قرآن مجید میں وحی کے مختلف مراتب کے متعلق کیا کہا گیا ہے؟

(۱) وحی بلا واسطہ مکالمۂ الٰہی ہے:

ثُمَّ دَنٰی فَتَدَلّٰی فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ	پس خدا آپ سے قریب ہوا اور نزول اجلال فرمایا
اَوْ اَدْنٰی فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِہٖ مَا اَوْحٰی	اور دو کمان بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب ہو گیا
(سورۂ نجم)	اور اپنے بندے کی طرف وحی بھیجی جو کچھ بھی بھیجی یعنی کلام بے کیف

(۲) وحی تکلیم الٰہی من وراء الحجاب ہے:

وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا	اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا
وَلَمَّا جَآءَ مُوْسٰی لِمِیْقَاتِنَا وَکَلَّمَہٗ رَبُّہٗ	اور جب موسیٰ علیہ السلام وقت معین پر پہنچے اور
قَالَ رَبِّ اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْکَ....	رب العالمین نے ان سے کلام کیا تو موسیٰ نے کہا
یٰمُوْسٰٓی اِنِّی اصْطَفَیْتُکَ عَلَی النَّاسِ	کہ اے رب تو مجھے دکھا کہ میں تجھ کو دیکھوں....
بِرِسٰلٰتِیْ وَبِکَلَامِیْ	اے موسیٰ میں نے تجھ کو اپنے پیغام اور کلام سے برگزیدہ بنایا

(۳) وحی: ارسال ملک، کما قال تعالےٰ:

اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِہٖ مَا	یا بھیجتے ہیں حق تو کوئی فرشتہ پس وہ نازل کرتا ہے
یَشَآءُ	ان کے حکم سے جو وہ چاہتے ہیں!

ابتداء نبوت میں جبرئیل امین اصلی شکل میں وحی الٰہی لے کر نمودار ہوئے، باقی اکثر اوقات حضرت دحیہ کلبیؓ کی شکل میں تشریف لاتے تھے جیسا کہ سنن نسائی میں باسناد صحیح عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے۔

(۴) وحی: صلصلۃ الجرس۔ گھنٹے کی طرح گونج اور آواز کا سنائی دینا، جیسا کہ صحیح بخاری میں ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے:

ان الحارث بن ھشام سال رسول	حارث بن ہشام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
اللہ صلعم فقال یا رسول اللہ کیف	سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے پاس

یاتیك الوحی ؟ فقال رسول اللہ صلعم احیانا یاتینی مثل صلصلة الجرس وھو اشدہ علی فیفصم عنی وقد وعیت عنه ما قال، واحیانا یتمثل لی الملک رجلا فیکلمنی فاعی مایقول، قالت عائشہ رض ولقد رایته فی الیوم الشدید البرد فیفصم عنه وان جبینه لیتفصد عرقا

کیسے وحی آتی ہے ؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ کبھی کبھی تو گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور وحی کی یہ قسم میرے اوپر سخت ہے پھر وحی مجھ سے منقطع ہو جاتی ہے حالانکہ میں اس کو بہت محفوظ کر چکا ہوتا ہوں جو کچھ کہ فرشتہ نے کہا ہے اور کبھی کبھی فرشتہ مرد کی صورت میں آتا ہے اور مجھ سے کلام کرتا ہے اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس کو میں محفوظ کر لیتا ہوں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے آنحضرت کو سخت سردی کے دن میں دیکھا ہے کہ وحی آپ سے منقطع ہوتی تھی اور پسینا آپ کی پیشانی سے ٹپکتا تھا

پھر قرآن کریم کی یہ اور اس قبیل کی دوسری آیتیں:

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۔ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ

إِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ

ثابت کرتی ہے کہ وحی خالق کائنات کی طرف سے قلوبِ انبیاء پر نازل کردہ شے ہے نہ کہ جبرئیل انداز کی حدیث نفس، نہ کوئی پر قوت اخلاقی جذبہ کی مجوبی !! اب میں مصنف "کہانی" سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ اپنے تخیل کی من مانی شرح اقبال سے دست بردار ہوتے ہیں یا ان آیات و احادیث پر مبنی کل دین سے دست بردار ہوتے ہیں ؟ مصنف جامعہ عثمانیہ میں شعبہ دینیات کی صدارت کی کرسی پر فائز ہیں وہ کرسی جس پر کسی زمانہ میں علامہ عبدالقدیر صدیقی مدظلہ اور علامہ مناظر احسن گیلانی مدظلہ جیسے اکابر فائز تھے ! ع

شرمے بشرمے کہ رفت ایماں شرمے

(۲) شریعت و معاشرت دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں!

ہمارے فاضل مصنف فرماتے ہیں:

"اوضاعِ معاشرت کو اوضاعِ شریعت کے ساتھ خلط ملط کر دینے کا میلان بھی درحقیقت فکری جمود اور انحطاط کی پیداوار ہے" صـ۶۸

اس فیصلہ کا نفاذ ڈرامائی انداز میں ہوا ہے، اس کے لئے اسٹیج اچھی طرح سٹ کیا گیا ہے، اچھے اچھے ایکٹر پردہ پر پیش کئے گئے ہیں، خوب رجز خوانی ہوئی ہے اور پھر فیصلہ سنایا گیا ہے!!

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا معاشرت کی بنا شریعت کے علاوہ کوئی اور چیز ہے؟ اگر ہے تو براہِ کرم اس کو واضح کیا جائے اور ساتھ ہی "معاشرت" اور "شریعت" کی وضاحت کے ساتھ تعریف کر دی جائے اور دونوں کے حدود متعین کر دیئے جائیں!

اگر شریعت و معاشرت کے باہمی ربط و تعلق اور ان کی اپنی اپنی حدود کو سمجھنے سے پہلے یہ ملفوظات قلم بند کر دئے گئے تھے تو اس کا بھی اعلان کر دیا جائے، ہم یقین دلاتے ہیں کہ جزنی اردو کی حیثیت سے کتابچہ کی قیمت میں کوئی فرق نہ آئے گا!

فمن یکن الغراب له دلیلا یمرّ به علی جیف الکلاب!

(۳) مولویت کی تضحیک و تذلیل!

ہمارے رجز خواں مصنف نے اپنے اس کتابچہ میں مولویت کی جو تضحیک و تذلیل کی ہے اس کا جواب جمعیۃ العلماء کے کسی عالم کا کام ہے ہم صرف اتنا پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ہمارے تمدن میں مولویت جس خلا کو پر کرتی ہے اس کا کوئی بدل منصرم صدر شعبہ مذہب و ثقافت جامعہ عثمانیہ نے دریافت کر لیا ہے؟ اگر کر لیا ہے تو اس کو کب پیش فرمایا جائے گا۔ علماء اس کے منتظر ہیں! ع

نفت بر رو ستے تمر بر روئے خود است!

(۴) ہمارے مصنف کی فلسفہ دانی: شیخ محی الدین ابن عربی کی اعیان ثابتہ اور افلاطون کی اعیان (IDEAS) دونوں ایک ہیں! صـ۸۶ - ۹۰

سارے کتابچہ میں سب سے زیادہ مکروہ اور مخبس چیز مصنف کی وہ ذہنیت ہے جو "ملت ابلیسی۔ انا خیر منہ" سے پوری طرح منضبغ ہو کر ہم عصر علماء کو جنہوں نے اپنی تحقیقات سے قوم کو فائدہ پہنچایا ہے مکروہ القاب سے یاد کر کے (مثلاً "مسٹر۔ مولانا" "جامد فکر" "تنگ نظر" "لکیر کے فقیر" "نام نہاد صوفی" وغیرہ) ان پر بعض اقوال، افعال، حرکات کا اتہام رکھ کر، خاص فرضی واقعات کو ان کی طرف منسوب کر کے فاتحانہ شان سے ان فرضی اقوال و واقعات کی تردید کرتی چلی جاتی ہے اور (DON QUIXOTE) کی طرح اپنے ہی پیدا کردہ وہمی بھوتوں کو قتل کرتی جاتی ہے اور اپنے ہیرو ہونے کا اعلان کرتی جاتی ہے اور لذت، شیطانی لذت لیتے جاتی ہے!

اسی سلسلہ میں ارشاد ہوا ہے کہ

"اقبال تو افلاطون کے نظریہ اعیان ثابتہ کو سلک گوسفندی قرار دیتا ہے الخ (ص ۹۰)

پہلے تو افلاطون کے (IDEAS) کا ترجمہ "اعیان ثابتہ" نہیں ہو سکتا، اقبال نے "اعیان نامشہود" کے الفاظ سے ایک جگہ ان کو ادا کیا ہے

منکرِ ہنگامۂ موجود گشت خالقِ اعیان نامشہود گشت

دوسرے افلاطون کے (IDEAS) اور وحدت الوجود کے قائلین کے "اعیان ثابتہ" میں زمین آسمان کا فرق ہے اقبال نے اگر (IDEAS) کی تردید کی ہے تو یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ وہ "اعیان ثابتہ" کی تردید کر رہے ہیں۔

افلاطون کے IDEAS

(۱) جوہر میں (SUBSTANCE) جو اپنا مستقل بالذات وجود رکھتے ہیں، اپنے وجود میں کسی کے محتاج نہیں خدا کے بھی محتاج نہیں، وہ مطلق و انتہائی حقائق ہیں، تمام چیزیں ان کی محتاج ہیں وہ کسی کے محتاج نہیں۔ وہ خدا کے تصورات نہیں معلومات نہیں،

اس کے برخلاف شیخ اکبرؒ کے ہاں اعیان ثابتہ خدا کے تصورات یا معلومات ہیں، وہ خدا کے ذہن یا علم میں پائے جاتے ہیں اور ان کا اپنا کوئی مستقل بالذات وجود نہیں۔

(۲) افلاطون کے (IDEAS) کلیات میں (UNIVERSALS) ہیں۔ افلاطون کے خیال میں کوئی جزی شے نہیں مثلاً گھوڑے کا IDEAS کوئی جزی گھوڑا نہیں۔ وہ تو تمام گھوڑوں کا کلی نوعی تعقل یا تصور ہے۔ اسی وجہ سے زمانہ جدید میں IDEAS کو کلیات (UNIVERSALS) کہا جاتا ہے اس کے برخلاف شیخ اکبرؒ کے ہاں اعیان ثابتہ کی تعداد اتنی ہی ہے جتنی کہ عالم شہود یا عالم غیب میں جزی مخلوقات ہیں، چیزیں ہیں، جزئیات ہیں اور وہ ایک دوسرے سے مختلف و متمیز ہیں۔ ان کا ایک نظام ہے۔

ہمارے "الہیات کے اس طالب علم" کی الہیات دانی پر افسوس ہوتا ہے کہ وہ اتنے فرق کو نہ سمجھ سکا خدا عالم ہے، جاہل نہیں، اس کا علم قدیم ہے، جیسی اس کی ذات قدیم ہے، عالم میں علم اور معلومات کا ہونا ضروری ہے، عالم، علم، معلومات لازم و ملزوم ہیں جیسے قتل اور مقتول اور قاتل، جس طرح قاتل بدون قتل ممکن نہیں اسی طرح عالم بدون علم ممکن نہیں اور نہ علم بدون معلوم کے اور نہ معلوم بدون علم کے بلکہ یہ تینوں عقلاً متلازم ہیں، ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ جو شخص عالم کو علم سے علیحدہ سمجھتا ہے اس کو چاہئے کہ عالم کو معلوم سے اور علم کو عالم سے جدا سمجھے کیونکہ ان نسبتوں میں کوئی فرق نہیں، سب ایک ہی سے ہیں۔

عالم (حق تعالیٰ) کے ان ہی معلومات کو شیخ اکبرؒ "اعیان ثابتہ" قرار دیتے ہیں۔ یہ ان کی اصطلاح ہے اس اصطلاح کے وضع کرنے کا ان کو حق حاصل ہے جس طرح محدثین و فقہا کو اپنی اپنی اصطلاحات وضع کرنے کا حق حاصل ہے اور بموجب "لامناقشۃ فی الاصطلاح" تمام علوم ایجابی (میں اصطلاحات کے بغیر گفتگو کرنی محال ہے

قرآن کریم میں حق تعالیٰ کہتا ہے اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ۔ وہ ہر چیز کو جان کر پیدا کرتا ہے، نہ جان کر جہل سے نہیں اب ہر چیز قبل تخلیق و بعد تخلیق خدا کی معلوم ٹھہری۔ کسی عامی کو بھی اس سے اختلاف نہیں ہو سکتا ورنہ اس کا خدا جاہل ٹھہرتا ہے! کیا ہم سمجھ سکتے ہیں کہ اقبال کا خدا اس کے عقیدے کی رو سے جاہل ہے، علم سے موصوف نہیں، معلومات نہیں رکھتا؟ اگر یہ محال

ہے تو کیا پھر اقبال اعیانِ ثابتہ حق سے انکار کر سکتا ہے؟ ہرگز نہیں وہ "اعیانِ نامشہود" کا ضرور منکر ہے جو افلاطون کی تخلیق ہیں، جو خدا کے معلومات نہیں مستقل بالذات حقایق ہیں، جو اظہر صول کائنات ہیں! "کہانی" لکھنے والا اس نازک فلسفیانہ نکتہ سے کیسے واقف ہو سکتا ہے۔

وَاِنْ کُنْتَ لَا تَدْرِیْ فَتِلْکَ مُصِیْبَۃٌ وَاِنْ کُنْتَ تَدْرِیْ فَالْمُصِیْبَۃُ اَعْظَمُ!

اقبال کا مقام ہماری ملیات کی تدوینِ جدید میں کہاں ہے؟

اس سوال کا تعلق صرف ہمارے رجز خواں مصنف سے نہیں بلکہ پوری نسل سے ہے۔ علامہ اقبال ہماری صدیوں کی بے مقصد ادبیت کو اپنے ملی نصب العین سے باندھنے والے پابند رہنے کی کوشش کرنے والے ایک نصب العینی شاعر ہیں! ہندوستان میں ہماری ادبی با مقصدیت کا دور حالی نذیر احمد، شبلی، اکبر سے گذرتا ہوا اقبال میں آکر اپنے معراجِ کمال پر پہنچ جاتا ہے اقبال ہماری اس صدی کا سب سے بڑا مصلحِ ادبیاتِ اسلامی ہے! یہ اس کا ٹھیک مقام ہے! یہاں پر یہ سوال مجبوراً اٹھانا ہی پڑتا ہے کہ کیا کسی ملت کی اساس اس کا دین ہوتا ہے اور ادبِ صالح بعد میں خود اس سے پیدا ہوتا ہے اور قصرِ ملت میں محض آرائش و زیبائش کا کام دیتا ہے اور اس طرح اس ملت کی طہارت نظر و فکر کو باقی رکھنے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتا ہے یا برعکس معاملہ یہ ہے کہ کسی ملت کی اساس تو ادبِ صالح کو قرار دیا جائے اور حقایقِ دین کو اس ادب کی تشریح میں محض ضمنیات کی حیثیت سے محض تیزی و شوخی کی خاطر استعمال کیا جائے؟ ان دو میں سے ہم کس موقف کو صحیح قرار دے سکتے ہیں؟

ہم بھی اقبال کے مداحوں میں رہے ہیں، مگر ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں اگر ہم نے کہیں اقبال کو ایک مذہبی شخصیت قرار دیا ہو کہ جن کے اشعار ہمارے لئے اساسِ دینی کے متعلق محاکمہ کا کام دے سکیں! اگر ہم سے کبھی ایسا مبالغہ ہوا ہے تو رب العزت ہمیں معاف کرے!

الٰہی! استغفرک لکل نعمۃ انعمت بہا علی فقویت بہا علی معصیتک!

بین الاقوامی جمہوریت کا جو طوفان مغرب سے اٹھ کر پورے ایشیا و مشرق کو گھیر رہا ہے پوری ملت اسلامی کو بھی ایک دور رس معاشرتی تجدید کے لئے بہت جلد مجبور کر دے گا۔ اس وقت ہمارے سفیرِ فرزندی

فکری الجھاؤ سے اور ہماری ناہموار سطح اعتقاد ممکن ہے کہ ہمیں کوئی صحیح راہِ عمل اختیار کرنے سے عرصہ دراز تک روک دے۔ ہمیں اچھی طرح جان لینا چاہئے کہ اقبال، سعدی و رومی کے مثیل ہیں اور یہ تینوں ہمارے ادب صالح کے اجزا تو ضرور ہیں لیکن ہمارے ذہن خالص کی اساس مطلق نہیں۔ اس دوسری حیثیت سے ان کی جس قدر تعبیر کی گئی اور کی جا رہی ہے اسی قدر ملت کے اعتقاد و عمل کے لئے الجھاؤ سے پیدا ہوتے اور ہو رہے ہیں۔ زیر تنقید کتابچہ میں اقبال کو اس دوسری حیثیت ہی میں پیش کیا گیا ہے مگر ع

پشہ کے داند کہ بستان از کیست ؟

کچھ عرصہ سے یہ دھیمی آواز ہمیں کہیں سنائی دیتی ہے کہ چونکہ اقبال کے تخیل نے آج کے ہندوستان کی اس متحدہ قومیت (نیشنلزم) کو نہیں سراہا تھا جو ایک غیر قومی اقتدار کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے ملک کے طول و عرض میں پرورش پا رہی تھی اور اس کے مقابل اس نے مسلمانوں کو اتحاد اسلامی کا سبق دیا لہذا ہند سے اس کے اثر کو ختم کر دینا چاہئے۔ ہندوستان کی تعمیری روح سے میری برادرانہ درخواست ہے کہ وہ اپنے "برہمن نژاد شاہکار" اقبال کو اس نظر سے دیکھے کہ گویا بیسویں صدی کے ہندوستان نے اقبال کے روپ میں اسلام کا وہ قرض ادا کیا ہے جو امیر خسرو اور عبدالرحیم خانخاناں کی شکل میں ملت اسلامیہ نے ہندوستان کو صدیوں پہلے دیا تھا۔ اس اقبال کو جو اپنے آپ کو "برہمن زادہ رمز آشنائے روم و تبریز" اور "آبا میرے لاتی و مناتی" کہتے نہیں چوکتا اور پھر بھی ملت اسلامیہ کو توحید باری اور اخوت انسانی کے پیغام کو زندہ کرنے کی دعوت دیتا ہے، ہندوستان کا اپنے جدید قومی سرمایہ کے ایک قیمتی ہیرے کی حیثیت سے تسلیم کرنے کی بجائے اس کو اپنے اثاثہ سے خارج کرنا اپنے آپ پر ظلم عظیم کرنا ہے! خدا ہمارے دوراندیش مفکروں کو اس تنگ نظری کا مقابلہ کرنے کی توفیق دے!

اقبال کی شاعرانہ حیثیت کس قدر بلند تھی اس کا اندازہ کرنے کے لئے میری خواہش ہے کہ ڈاکٹر تیج بہادر سپرو کا وہ بیان تلاش کر کے اخباروں کی فائل سے نکالا جائے جو انھوں نے کچھ عرصہ پہلے علامہ اقبال اور شاعر اعظم ٹیگور کا تقابل کرتے ہوئے دیا تھا۔ ہر ادیب کے لئے ضروری ہے کہ اس پر ایک نظر ڈال لے فلسفے کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میری رائے میں ایک فن کار شاعر (AR TIST POET) و ادیب کی حیثیت سے ٹیگور کا درجہ اقبال سے بلند ہے لیکن ایک نصب العینی شاعر کی حیثیت سے اقبال ٹیگور سے بدرجہا بلند ہے ایک زبان و تشبیہ و استعارے کا۔

ادبیات

غزل

(جناب آلم مظفر نگری)

حسن تو چھایا ہوا کونین کی محفل پہ تھا
یہ نہ لیکن کھل سکا خود عشق کس منزل پہ تھا

بار کشتی لگ گئی تو بار شورش دل پہ تھا
میں ہی کیا ساحل پہ تھا طوفان بھی ساحل پہ تھا

ڈوبنے پر اس حقیقت سے ہوا آگاہ میں
جو تہِ دریا میں جا پہنچا وہی ساحل پہ تھا

شمع کے دل پر سحر تک سوز برساتا رہا
وہ فسانہ جو پرِ پروانۂ محفل پہ تھا

عمر گزری ہے امید و بیم کے گرداب میں
میں کبھی طوفان کی موجوں میں کبھی ساحل پہ تھا

یہ نہ کہیے تھا جنوں پرور فقط لیلیٰ کا ناز
حسن پیرِ قیس بھی ہر پردۂ محمل پہ تھا

عمر بھر کرتا رہا روشن شبِ تاریکِ غم
صرف وہ اک داغ ناکامی جو میرے دل پہ تھا

دیکھتا تھا جب تمہیں کو دیکھتا تھا ہر طرف
اعتبار اتنا مجھے ہر جلوۂ باطل پہ تھا

حاصلِ دردِ شکستہ پائی اچھا تو ملا
ساری دنیا راہ میں تھی اور میں منزل پہ تھا

اب ہوا محسوس رنج حسرتِ آسودگی
دوسرا طوفان تھا وہ شور جو ساحل پہ تھا

دیکھ اے منعم یہی تھا مجھ میں تجھ میں امتیاز
تیرا قبضہ تھا جہاں پر میرا قبضہ دل پہ تھا

قدر مشکل کا نہ اندازہ محبت میں ہوا
دل جو آمادہ مرا آسانیٔ مشکل پہ تھا

ان کے کوچے میں آلم کو آج دیکھا اس طرح
آنکھ سوئے آسماں تھی دستِ حسرت دل پہ تھا

شئون علمیہ

عمر کی گنتی

پچاس برس کی عمر تک انسان اپنی زندگی کے لمحوں کو کس طرح گزارتا ہے اس کا ایک تخمینہ مغربی طرز کی زندگی کے لئے شائع ہوا ہے۔اس کے اعداد و شمار دلچسپی سے خالی نہیں۔

ایک شخص ۷ بجے صبح اٹھتا ہے۔اور ۱۱ بجے شب کو گھر واپس آتا ہے۔اور کہتا ہے کہ اس نے بہت مصروف دن گزارا۔اب اس کی اس نام نہاد مصروفیت کا جائزہ لینا ہے۔

کناڈا کے مشہور ماہر طبعیات ڈاکٹر ہبری مسیل نے ڈاڑھی چھوڑ دی ہے وہ کہتے ہیں کہ ڈاڑھی مونڈنے میں وقت بہت صرف ہوتا ہے۔چنانچہ انھوں نے حساب لگایا کہ اگر ہر "مونڈ" پر ۶ منٹ صرف ہوں تو روزانہ ۶ منٹ کے حساب سے ۵۰ برس میں ۱۸۰۰ گھنٹے "مونڈن" کی نذر ہو جاتے ہیں۔ یہ مساوی ہوئے کام کے ۲۲۵ دن کے۔جن میں جوہری طبعیات کی بہت کچھ تحقیق کی جا سکتی ہے۔

یہ تو "صاحب خانہ" کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہوا۔اب "اہل خانہ" کو لیجئے۔روزانہ جو کام اسے کرنا پڑتا ہے اس میں وہ سال بھر میں ۳۰۰۰ میل کی مسافت طے کرتی ہے۔تو ۵۰ برس میں مسافت ۱۵۰۰۰۰ میل کی ہو جاتی ہے۔

اب ذرا سگرٹ نوشی کو دیکھئے۔برطانیہ میں ہر سال ۸۹،۶۹،۰۲،۰۰،۴۰۰ (۵۴ ارب ۸۹ کروڑ ۶۹ لاکھ دو ہزار ۴ سو) سگرٹ نوش کئے جاتے ہیں ہر سگرٹ پر اگر ۲ منٹ صرف ہوں اور ہر سگریٹ نوش اوسطاً ۲۰۰۰ سگرٹ سالانہ نوش کرے تو تخمیناً ۶ا گھنٹوں کی مدت ہوئی جس میں سے نصف تو یوں ہی گزر جاتے ہیں۔

پس ہر سال کے ۸ گھنٹے نکالے جائیں تو ۵۰ برس میں یہ مدت تقریباً ۱۷ دن کی مدت ہو گی ۲۲۵ دن کی میزان پہلے آ چکی۔لہذا اب جملہ ۲۴۲ دن ہو گئے۔

یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ۵ کروڑ کی آبادی میں کوئی ۲ کروڑ ٹکٹ ڈاک کے فروخت ہوتے ہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک شخص ڈھائی دن کے اندر ایک مرتبہ ضرور ٹکٹ چسپاں کرتا ہے۔ اگر ہر "چسپ" کے لئے ۲ سکنڈز رکھے جائیں تو سال بھر میں چسپیوں کی تعداد ۱۴۴ ہوگی اور پھر ۵۰ برس میں جملہ مدت ۴ گھنٹہ ہوگی۔

آدمی مصافحہ بھی کرتا ہے یا اس کے قایم مقام جو عمل ہوا سے انجام دیتا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ اپ سکنڈ کی مدت صرف ہوتی ہے۔ لیکن احتیاطاً اگر ہم ۵ سکنڈ کی مدت اس عمل کی قرار دیں تو پھر ۵۰ برس میں ۲۵ گھنٹے مصافحہ بازی کے ہوئے۔

پھر ہاتھ منہ کا دھونا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس میں روزانہ ہر شخص کو ۵ ۲ منٹ صرف کرنا پڑتے ہیں۔ پس ایک اوسط پاک صاف آدمی کو ۵۰ برس میں ۳۲ دن اس کی نذر کرنا پڑتے ہیں۔

ایک نوزائیدہ بچہ ۲۲ گھنٹہ روزانہ سوتا ہے۔ آگے چل کر نیند کے ۸ گھنٹے رہ جاتے ہیں۔ کوئی کتنا ہی زور مارے لیکن مسلسل ۱۰۰ گھنٹوں سے زیادہ جاگ نہیں سکتا۔ پس ایک نہائی عمر بستر پر کروٹ بدلنے میں صرف ہو جاتی ہے۔ ۵۰ برس میں یہ مدت ۱۷ برس کی ہوئی۔

اب ذرا لباس کو لیجئے۔

مرد کے مقابلے میں عورت لباس پر وقت زیادہ صرف کرتی ہے لیکن اوسطاً ہر روز ۱۸ منٹ کپڑے اتارنے اور پہننے میں صرف ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ جلد جلد لباس تبدیل کر لیتے ہوں۔ مگر یاد رکھئے یہ اوسط ہے۔ اس لئے ۵۰ برس میں ۲۴۵ دن لباس میں طے ہو جاتے ہیں۔

پھر کھانا پینا الگ رہا۔ روزانہ ۴۰ منٹ اس پر صرف ہوتے ہیں۔ عمر زیادہ ہو جاتی ہے تو یہ مدت ایک گھنٹہ ہو جاتی ہے۔ پس محتاط اندازہ یہ ہوا کہ ۴۰ منٹ روزانہ اس چکی پیسنے میں صرف ہو جاتے ہیں۔ ۵۰ برس کی مدت میں یہ سب مدت ۱۸۸ دن کی ہوئی۔ اور ۲۴۵ کے دن جمع کئے تو مدت ۲ برس ۸۶ دن ہوئی۔

غرضکہ ۵۰ برس میں سے ۲۱ برس کے قریب ان سب باتوں کے نذر ہو گئے۔ اب یہ نہ بھولئے کہ آدمی خاموش نہیں رہتا ہے۔ بولتا بھی ہے بحث بھی کرتا ہے اگر اوسطاً ۵ منٹ اس روزانہ مشق کے لئے رکھئے تو ۵۰ برس میں ۲۲ دن ہو گئے۔ پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ بعض لوگ بھولتے بہت ہیں اس لئے ان کو ایک ہی کام دو بار یا تین بار کرنا پڑتا ہے۔ روزانہ ۲ منٹ اس کو دیجئے تو ۵۰ برس میں ۳۱ دن ہوئے اسی طرح کی اور باتیں ہیں جن کو اگر حساب میں لایا جائے تو ۵۰ برس میں سے ۲۶ برس

م یوں ہی نکل گئے۔ پس شاعر نے کیا غلط کہا اگر کہا کہ ؎ صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے ٭ عمر یوں ہی تمام ہوتی ہے۔ اس آئینہ میں ہر شخص اگر اپنے کو دیکھے تو امید ہے کہ نفع سے خالی نہ رہے گا۔

تبصرے

پارۂ اول قرآن مجید مع ترجمہ و تفسیر از جناب مولانا عبدالماجد دریابادی، تقطیع کلاں ضخامت ۸۴ صفحات کاغذ۔ کتابت اور طباعت نہایت اعلیٰ اور شاندار دو دیدہ زیب، ہدیہ مرقوم نہیں، شائع کردہ تاج کمپنی لمیٹڈ۔ لاہور۔ کراچی۔

اردو میں قرآن مجید کے تراجم کی کمی نہیں ہے، لیکن ان میں سے بعض تو ایسے تحت اللفظ ہیں کہ انہیں پڑھکر مطلب سمجھنا انتہائی مشکل ہے اور بعض ترجمے صاف اور سپاٹ ہیں تو ان میں بعض دوسری قسم کے نقائص ہیں مثلاً مترجم خود اگر عقائد صحیح نہیں رکھتا تو اس نے ترجمہ میں کھینچ تان کرکے مطلب کچھ سے کچھ کردیا ہے یا کم از کم ترجمہ اجتہادی شان کے ساتھ کیا ہے جس کے باعث سلف صالحین کے مسلک سے بُعد پیدا ہوگیا ہے، اس بناء پر ضرورت تھی کہ قرآن مجید کا ایک ایسا اردو ترجمہ کیا جائے جو عام فہم سلیس، شگفتہ و رواں ہونے کے ساتھ آزاد ترجمہ بھی نہ ہو اور جس میں سلف صالحین کے مسلک سے عدول بھی نہ پایا جائے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ جناب مولانا عبدالماجد دریابادی نے ایک عرصہ کی محنت شاقہ کے بعد قرآن مجید کا ترجمہ لکھ کر اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کردیا ہو ترجمہ میں اس بات کی پوری رعایت رکھی گئی ہے کہ اردو کے الفاظ قرآن مجید کے الفاظ کے مطابق ہی رہیں، نہ کم ہوں اور نہ زیادہ، لیکن چونکہ اس پابندی سے بعض اوقات مطلب گنجلک ہوجاتا تھا، اس لئے اس قسم کے مواقع پر قوسین میں کچھ الفاظ بڑھاکر عبارت کو مربوط قابل فہم اور آسان بنادیا ہے۔ اس اہتمام کے باعث اب یہ ترجمہ اس لائق ہے کہ جو متوسط الاستعداد اردو داں ان کو پڑھیگا اسے قرآن مجید کی آیات کا مطلب سمجھنے میں دشواری نہ ہوگی! ترجمہ کے علاوہ تفسیر بھی نہایت مفید۔ پُر از معلومات اور بصیرت افروز ہے، تفسیر میں مولانا نے پہلے الفاظ کی لغوی تحقیق عربی لغت کی مشہور و مستند کتابوں کی روشنی میں اور ان کے حوالہ سے کی ہے، اور اس سلسلہ میں بلا تخفف عبارتیں تک نقل کرتے چلے گئے ہیں، پھر کسی آیت کا مطلب یا اس سے مستخرج حکم کے بارہ میں جو

مشہور تفاسیر منقول ہیں ان کو نقل کیا ہے اور اس کے بعد جو قول مرجح ہے اس کو دلائل و براہین کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اس ذیل میں فرق باطلہ کا ذکر آگیا ہے تو ان کی تردید بھی ہوتی گئی ہے اور جہاں کہیں موقع ملا ہے قرآن مجید کی سچائیوں کو ثابت کرنے کے سلسلہ میں عہد حاضر کے جدید علمی اکتشافات یا بعض علماء مغرب کے اقوال و آرابھی بیان کر دئے گئے ہیں اس میں شبہ نہیں کہ مولانا دریابادی نے ترجمہ و تفسیر کا یہ کام بڑی محنت و عرق ریزی اور مسلسل انہماک و مصروفیت سے انجام دیا ہے۔ خود انہوں نے کتب لغت و تفاسیر اور دوسرے علوم متعلقہ کی کتابوں کا مطالعہ دیدہ ریزی کے ساتھ کیا، اور دوران مصروفیت میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے جن کے جگہ جگہ حوالے بھی ہیں۔ ایک ایک آیت اور لفظ کے ترجمہ و تفسیر کے متعلق تحریراً مشورہ بھی کرتے رہے ہیں، ان خصوصیات کی بنا پر ترجمہ و تفسیر موجودہ اردو تراجم و تفاسیر میں ایک نمایاں مقام کا مستحق ہے۔ حق تعالیٰ فاضل مؤلف کو اس کا اجر جزیل اور مسلمانوں کو اس سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے اور جناب ناشر نے جس ذوق و شوق اور اہتمام و انتظام کے ساتھ شائع کیا ہے اللہ تعالیٰ ان کو بھی اس کا بدلہ عنایت فرمائے ۔۔

اسلام اور عربی تمدن

از مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی تقطیع کلاں، ضخامت ۴۰۵ صفحات کتابت و طباعت اعلیٰ قیمت ۶ چھ روپیہ آٹھ آنہ۔ پتہ دار المصنفین اعظم گڈھ۔

استاذ کرد علی شام کے نامور فاضل اور محقق ہیں۔ موصوف نے عرصہ ہوا ایک کتاب الاسلام والحضارۃ العربیہ کے نام سے لکھی تھی جو اسی زمانہ میں عربی دنیا میں بہت مقبول اور مشہور ہوئی تھی، اس میں اسلام اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب و تمدن سے متعلق علماء مغرب کے اعتراضات کے مدلل اور محققانہ جوابات دینے کے ساتھ ساتھ عربوں کے تہذیبی و تمدنی کمالات اور اس کا خط و خال اور یورپ پر عربوں کے علمی و تمدنی احسانات اور ان کے نتائج و اثرات کو بڑی خوبی اور عمدگی سے بیان کیا گیا ہے اگرچہ کتاب سے مصنف کی عربی عصبیت جگہ جگہ نمایاں ہے جس کے باعث وہ عربوں کے مقابلہ میں مغلوں اور ترکوں کو نہ صرف یہ کہ کوئی اہمیت ہی نہیں دیتے بلکہ بعض یورپین مصنفوں کی تقلید میں ظلم و جور اور اسلام ناشناسی کے ایسے

الزامات ان پر عائد کردئے ہیں جو تاریخی اعتبار سے کسی طرح صحیح نہیں ہیں پھر جہاں تک فنونِ لطیفہ اور مادی زندگی کے مرغوبات و مستلذات کا تعلق ہے۔ مصنف نے ان کے بیان کرنے میں بھی اسلامی نقطۂ نظر کا خیال نہیں رکھا اور کتاب الاغانی وغیرہ جیسی کتابوں کی بنیاد پر عربی تمدن میں ان چیزوں کی اہمیت کو بھی نمایاں کرکے دکھایا ہے۔ تاہم مجموعی اعتبار سے یہ بہت قابل قدر اور پراز معلومات کتاب تھی اور اس بنا پر اردو خواں طبقہ کو فاضل مترجم کا شکرگذار ہونا چاہئے کہ انہوں نے اس کو اردو میں منتقل کرکے اردو ادب میں ایک اچھا اور مفید اضافہ کردیا، ترجمہ بہت صاف اور شگفتہ ہے جس سے ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ پھر کہیں کہیں مختصر حواشی بھی ہیں جن میں مصنف کی رائے سے اپنا اختلاف ظاہر کردیا گیا ہے حق یہ ہے کہ اس کتاب کے اردو ترجمہ کا اور حواشی میں اس کتاب کے بعض بیانات سے اختلاف ظاہر کرنے کا حق اردو میں مبسوط تاریخ اسلام کے مصنف کے علاوہ اور کس کو ہوسکتا تھا۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے۔

تصوف کیا ہے؟ | مرتبہ مولانا محمد منظور نعمانی تقطیع خورد ضخامت ۱۴۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ایک روپیہ چار آنے ؏ پتہ:۔ کتب خانہ الفرقان لکھنو۔

تصوف آج کل کی علمی دنیا کا بہت مقبول و محبوب موضوع ہے جس پر آئے دن انگریزی۔ عربی۔ اردو۔ ہندی اور دوسری زبانوں میں کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں لیکن جہاں تک اسلامی تصوف کا تعلق ہے تو افسوس ہے کہ بعض اربابِ ضلال کی علمی و عملی گمراہیوں کے باعث اس کی اصل حقیقت اس طرح گم ہوئی ہے کہ اس کا پتہ چلانا بھی مشکل ہے۔ اس کتاب میں اسی حقیقت گمشدہ کو ڈھونڈ نکالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ دراصل کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ لائق مرتب نے جو غالباً اب تک تجربہ۔ تلاش۔ اور تحقیق و جستجو کے دور سے ہی گذر رہے ہیں پہلے اپنی ایک سرگذشت بیان کی ہے اور پھر ایک بزرگ کے فیضان صحبت سے تصوف کی جو حقیقت ان پر واضح ہوئی ہے اس کی اور اس کے اعمال و اشغال کی نسبت آپ نے چند یقین بیان کئے ہیں اس کے بعد مولانا محمد اویس ندوی اور مولانا

ابوالحسن علی ندوی کے مختصر مختصر چند مقالات ہیں۔ جن میں تصوف سے متعلق بعض شکوک و شبہات کا جواب دیا گیا ہے اور تصوف کے لطائف و مزایا۔ اور اس کی دینی برکات بیان کی گئی ہیں اگرچہ تصوف جیسے اہم۔ وسیع اور گراں مرتبت موضوع پر اس کتاب کو سیر حاصل نہیں کہا جا سکتا تاہم تصوف کے ایک طالب علم اور مبتدی کے لئے اس کا مطالعہ مفید ہوگا اور اس کو اس میں بہت سی کام کی باتیں بھی نظر آئیں گی

عقاید الاسلام قاسمی از مولوی محمد طاہر قاسمی مرحوم تقطیع متوسط کتابت و طباعت بہتر ضخامت ۱۹۲ صفحات قیمت ۱۲؍ پتہ :۔ محمد آصف قاسمی مہتمم کتب خانہ قاسمی دیوبند ضلع سہارنپور (یو۔پی)

اس کتاب میں پہلے مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم سے اسلام میں عقاید کی حقیقت و اہمیت پر ایک مقالہ ہے اور اس کے بعد بچوں کو خطاب کر کے اسلام کے مختلف عقاید اور ان کے علاوہ دوسرے دینی، علمی، اخلاقی اور تمدنی مسائل و احکام پر آسان اور سلیس و دلنشین پیرایہ میں گفتگو کی گئی ہے اور اس طرح اگرچہ یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی گئی ہے لیکن اس لائق ہے کہ بڑے بھی اس کا مطالعہ کریں اور اس سے فائدہ اٹھائیں اور اس کو اسکولوں اور مکاتب کے نصاب دینیات میں شامل کیا جائے

غلامانِ اسلام

اسّی کے قریب ان صحابہ تابعین، تبع تابعین، فقہا اور محدثین اور ارباب کشف و کرامات اور اصحاب علم و ادب کے سوانح حیات اور کمالات و فضائل بڑی تحقیق و تدقیق سے جمع کئے گئے ہیں جنہوں نے غلام یا آزاد کردہ غلام ہونے کے باوجود ملت کی عظیم الشان خدمتیں انجام دیں جنہیں اسلامی سوسائٹی کے ہر دور میں عظمت و اقتدار کا فلک الافلاک سمجھا گیا اور جن کے علمی، مذہبی، تاریخی اور سماجی کارنامے اس قدر شاندار اور اس قدر روشن ہیں کہ ان کی غلامی پر آزادی کو رشک کرنے کا حق ہے اور بجا ہے، یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی محققانہ، دلچسپ اور معلومات سے بھرپور کتاب اس موضوع پر اب تک کسی زبان میں شائع نہیں ہوئی اس کے مطالعہ سے غلامانِ اسلام کے حیرت انگیز اور شاندار کارناموں کا نقشہ آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ دوسرا اڈیشن صفحات ۴۸۴ بڑی تقطیع قیمت پانچ روپے ۸؍ مجلد ۶؍

REGISTERED NO. D. 183

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسنِ خاص جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین جو حضرات پچیس روپئے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلاکسی معاوضہ کے پیش کیا جائے گا۔

۳۔ معاونین:۔ جو حضرات اٹھارہ روپئے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقۂ معاونین میں ہوگا انکی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالۂ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپئے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ احبّاء نو روپئے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبّاء میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دی جائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲؍ آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہیے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپئے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپئے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰؍

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

جلد نمبر ۳۰ شمارہ نمبر ۵
مئی ۱۹۵۳ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

افسوس ہے پچھلے دنوں چند گھنٹوں کے فصل سے ہندوستان کی عموماً اور دہلی کی خصوصاً دو نامور ہستیوں نے اس دنیا کو خیرآباد کہا۔ آصف علی مرحوم نے وطن سے بہت دور دیار غیر میں جان جانِ آفریں کو سپرد کی لیکن وطن کی خاک نے یہ کشش دکھائی کہ ان کی نعش ہوائی جہاز کے ذریعہ سوئٹزرلینڈ سے دہلی پہنچی اور شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی اور وہ دونوں یہیں دفن ہوئے، سیاسی مسلک کے علاوہ دلی کی خاص وضعداری اور شرافت، خوش اخلاقی اور وسعتِ نظر و عالی حوصلگی۔ کے اعتبار سے دونوں میں بہت کچھ مشابہت و مماثلت تھی۔ تاہم ہر ایک کی چند خصوصیات تھیں جن کے باعث دونوں اپنا اپنا الگ مقام رکھتے تھے۔ آصف صاحب نہایت ذہین، انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے خوش بیان مقرر اور ادیب تھے اور اردو زبان کے خوش گو شاعر بھی تھے چنانچہ انجمن ترقی اردو ہند کے سہ ماہی رسالہ اردو کے ابتدائی دور میں ان کی بعض نظمیں شائع ہوئی تھیں، اردو طرز تحریر میں ان پر ٹیگور یت غالب تھی جس کا ثبوت ان کی کتاب پریشاں سے ملتا ہے تحریکِ آزادی کے زمانہ میں ان کا شمار صف اول کے کانگریسیوں میں رہا آزادی حاصل ہونے کے بعد وہ امریکہ میں ہندوستان کے سفیر رہے پھر اڑیسہ کے گورنر بنا دیئے گئے اور اب آخر میں سوئٹزرلینڈ میں اپنے ملک کی سفارت کی خدمات انجام دے رہے تھے کہ اسی عہدہ پر داعیٔ اجل کو لبیک کہا ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی اگرچہ آصف علی صاحب کی طرح آل انڈیا شہرت کے مالک نہیں تھے لیکن اس میں شبہ نہیں کہ نہایت مخلص قومی کارکن تھے ملک کی تحریک آزادی کے سلسلہ میں وہ جیل

بھی گئے لیکن وہ طبعاً ہنگامہ پسند اور اسٹیج کے لیڈر نہیں تھے۔ خاموشی مگر نہایت مستعدی اور گرم جوشی کے ساتھ ٹھوس اور تعمیری کام کرنے کے عادی تھے۔ انھیں سب سے زیادہ دلچسپی تعلیم بالغان کے کام سے تھی اس سلسلہ میں انھوں نے جس بیدار مغزی۔ تن دھی اور قوت تنظیم و عملی سرگرمی کا ثبوت دیا ہے وہ ان کی تاریخ حیات کا روشن باب ہے، اسی بنا پر یونیسکو کی طرف سے وہ انڈونیشیا میں تعلیم بالغان کے ناظم اعلیٰ بنا کر بھیجے گئے۔ وہاں سے واپسی پر دہلی اسٹیٹ کے وزیر تعلیم منتخب ہو گئے اس حیثیت سے ان کا ایک یادگار کارنامہ یہ ہے کہ اردو زبان دلی کی علاقائی زبان تسلیم کر لی گئی لیکن غالباً ان کی آزاد طبیعت وزارت کی گراں بار ذمہ داریوں کی متحمل نہیں ہو سکی۔ اور وہ چند ماہ بیمار رہ کر ۵۲، ۵۳ سال کی عمر میں ہی عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ نجی زندگی میں مرحوم بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔ نماز روزہ اور اسلامی شعائر کے پابند۔ نہایت سادہ اور بے تکلف ہر ایک کے ساتھ ہمدردی اور خلوص کا تعلق رکھنے والے۔ بڑے ملنسار اور ہنس مکھ۔ متواضع اور بامروت۔ ذہین اور معتدل المزاج حق تعالیٰ ان پر اپنے انوار و برکات کا نزول فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کو مقام عطا فرمائے۔ آمین

مسلمانوں کی زندگی کے دو ہی شعبے ہیں ایک دنیوی اور دوسرا دینی" اور ان دونوں شعبوں کے بہتر اور کامیاب ہونے سے ہی زندگی بہتر اور کامیاب ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی ان دونوں کی حسنات کے لئے دعا مانگنے کی تلقین کی گئی ہے دنیوی زندگی کی خوشحالی کے معنی یہ ہیں کہ انسان تندرست ہو۔ معاشی اعتبار سے خوش حال اور فارغ البال ہو اور وہ اس خوش حالی سے خود اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال کے لئے نفع بھی اٹھا سکے۔ دنیوی زندگی کی خوشحالی کے ثمرات و نتائج میں اگرچہ تندرستی کا نمبر سب سے پہلا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تندرستی اور صحت کا دارومدار بھی معاشی رفاہیت پر ہے۔ جو شخص دونوں وقت اپنا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ وہ کس طرح ایسی غذائیں مہیا کر سکتا ہے جن کو انسانی صحت کی حفاظت و بقا میں بڑا دخل ہے وہ ایک صحت بخش مقام پر ایک عمدہ پرفضا اور کھلے مکان میں کیوں کر رہ سکتا ہے اس بناء پر یہ بات صاف طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ دنیوی

زندگی کی خوشحالی کا سب سے بڑا ذریعہ معاشی رفاہیت ہے۔

پھر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ معاشی رفاہیت کا ثمرہ صرف یہی نہیں ہوتا ہے کہ انسان کی دنیوی اور مادی زندگی بہتر ہو جاتی ہے بلکہ اس کا اثر اخلاقی اور سماجی زندگی پر بھی پڑتا ہے۔ کارل مارکس تو ایک عرصۂ دراز کی ریسرچ اور تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا میں جنگ و فساد، جرائم اور اخلاقی زبوں حالی و معاشرتی ابتری ان سب کا واحد سبب اقتصادی زبوں حالی اور معاشرتی ابتری ہے۔ لیکن اسلام کے داعی نے تو تقریباً ڈیڑھ ہزار برس پہلے کاد الفقر یکون کفرا فرما کر اس فلسفہ کے پورے دریا کو ایک کوزہ میں بند کر کے پیش کر دیا تھا۔

آج ہندوستان میں جگہ جگہ مسلمانوں کے عظیم الشان جلسے اور کانفرنسیں ہوتی ہیں مختلف مسائل پر تقریریں کی جاتی ہیں متعدد معاملات پر غور و خوض کیا جاتا ہے۔ لیکن کبھی کسی نے اس پر بھی غور کیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی اقتصادی حالت روز بروز ابتر ہی ہوتی رہی اور صورتِ حال یہ رہی کہ ان کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی بے روزگاری کی مصیبت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ کاروبار اور تجارت میں بھی آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے مواقع زیادہ نہیں ہیں زمینداریاں الگ ختم ہو گئیں تو پھر آخر ان چار ساڑھے چار کروڑ افراد کا کیا ہوگا اور یہ کس طرح اپنے ملک کے مفید اور اچھے شہری بن کر عزت کی زندگی بسر کر سکیں گے قوم محض جلسے کرنے اور پر جوش تقریریں سن لینے سے زندہ قوم نہیں بنتی۔ اگر مسلمانوں کو ایک زندہ اور تندرست قوم کی حیثیت سے رہنا ہے تو لازمی طور پر یہ بھی سوچنا ہوگا کہ معاشی رفاہیت کے جو دروازے ان پر بند نظر آتے ہیں انھیں کس طرح کھولا جائے۔ اور اس راہ میں جو دشواریاں اور دقتیں ہیں انھیں کیوں کر دور کیا جائے۔

کس لئے؟

از

حضرت مولانا مناظر احسن صاحب

(۲)

لیکن کیا کیجئے، آدمی کس لئے ہی ہے اس کا یہ جواب کہ خالق کائنات نے خود اپنے لئے اس کو پیدا کیا ہی اپنے اپنے ذاتی رجحانات اور میلانات کے زیر اثر اسی کی تشریح و توضیح میں عجیب و غریب شگوفے کھلتے رہے۔

رہبانیت روحانیت

ایک طرف تو سمجھنے والوں نے یہ سمجھ لیا کہ خالق کے لئے جو پیدا ہوا ہے اس کا فرض ہو جاتا ہے، کہ مخلوقات سے جہاں تک دوری اختیار کر سکتا ہو، دور ہوتا چلا جائے۔ رہبانیت اور جوگیت اسی رجحان کی تعبیر ہے جس کی ابتدائی منزل میں سمجھایا جاتا ہے کہ غذا جیسی ناگزیر ضرورت سے تعلق کو کمزور کرنے کے لئے چاہیئے، کہ بغیر کسی رغبت اور لذت گیری کے اس کو اس طرح کھایا جائے کہ کھانے والا مسلسل کھاتے ہوئے یہ بھی سوچتا چلا جائے کہ اس کی مثال اس شخص کی ہے، جو جنگل سے گذر رہا ہو، اور اپنے آپ کو زندہ رکھنے کے لئے اپنے بچے کا گوشت کھا رہا ہو (ترجمہ کتاب ہندی فلسفہ از ڈاکٹر گپتا ج ا ص۱۵۲ دار الترجمہ سرکار عالی)

یہ ہندوستانی رہبانیت کے دائرہ کا مشہور اور عام فقرہ ہے، بعض خاص مصلحتوں کی بنیاد پر اسی طریقۂ زندگی کو رہبانیت و جوگیت کے ساتھ ساتھ روحانیت کے نام سے بھی موسوم کرتا ہوں، موجودہ مغربی اصطلاح میں چاہیئے تو اسے اسپر چوزم بھی کہہ لیجئے۔ اس مسلک کی بنیاد یا روح یہی ہے کہ جو بڑائیاں آدمی کو اپنے وجود کی اسی غرض و غائیت کی وجہ سے حاصل ہوئی ہیں کہ وہ خالق کائنات کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی ان ہی بڑائیوں نے ادراراً انسانی مخلوقات سے استفادہ کے حق کو اس کا پیدائشی اور قدرتی حق بنا دیا ہے، اس مسلک میں گویا سمجھنا چاہیئے آدمی کے اسی پیدائشی حق سے دست برداری کا عملاً اعلان کیا جاتا ہے، اسی طرح اپنے وجود کے اسی بلند ترین نصب العین یعنی آدمی کا خدا کے لئے ہونا، اسی کی بدولت انسانیت سے متعلق یہ عام احساس جو پایا جاتا ہے کہ تمام پیداواروں کے مقابلہ میں وہی زمین کی سب سے زیادہ قیمتی اور انمول پیداوار ہے۔

اسی بنیاد پر انسانی صلاحیتوں کی حفاظت و بقاء اور پوشیدہ امکانات کے بہبود و ارتقاء کی کوششوں کو جو غیر معمولی اہمیت عام طور پر حاصل ہے، اس کی اہمیت کی چنداں پرواہ رہبانیت یا روحانیت کے دائروں میں نہیں کی جاتی، کیوں کہ کچھ بھی ہو، انسان بھی بہرحال خالق نہیں، بلکہ مخلوق ہی ہے، بال بچوں کے جھگڑوں یا سوسائٹی اور اجتماع کے جھگڑوں سے ممکنہ حد تک آزاد رہنے کا میلان اس طبقہ میں اسی نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے، کہ خدا یا خالق کائنات کے لئے ہونے کا مطلب ان کے نزدیک اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اپنی اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ، خالق ہی کی تلاش و جستجو دھیان و گیان میں بسر کر دیا جائے۔

عملی مادیت یا پریکٹیکل میٹرلزم

رہبانیت و روحانیت کے مذکورہ بالا طریقۂ فکر، اور طرز زندگی کے بالکل برعکس ہر زمانہ میں دوسرا گروہ بھی پایا گیا ہے، بلکہ عموماً عددی اکثریت اسی گروہ کی پہلے بھی رہی ہے، اور آج کل بھی ہے، جس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا، کہ خدا جو ہر قوم کی حاجتوں اور ضرورتوں سے پاک ذات کی تعبیر ہے، آدمی بھلا اس کے کام کا کیا ہو سکتا ہے، اسی لئے آدمی خدا کے لئے ہی ہے۔ سمجھا جاتا ہے اس کا مطلب اگر کچھ ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی خدا کے مخلوقات کے کام آئے، اور جو چیزیں آدمی کے لئے پیدا کی گئی ہیں ان سے مستفید ہو، ان کے افادہ کے ممکنہ پہلوؤں کو اجاگر کرے یہی وہ لوگ ہیں جن کی زندگی کے عملی خانوں میں خدا یا خالق کائنات کے لئے نہ کسی قسم کی کوئی گنجائش ہوتی ہے اور نہ اس گنجائش کو وہ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے کاروبار کی ساری سرگرمیاں مخلوقات ہی کو محور بنا کر ان ہی کے ارد گرد گردش کرتی ہیں، وہ بھی کرتے ہی اہیں اور اس کے سوا کچھ کرنا بھی نہیں چاہتے، یہ ممکن ہے کہ بعض گنے چنے افراد ان میں ایسے بھی ہوں جو خدا کے یقین ہی سے اپنے قلوب کو محروم پاتے ہوں، اسی لئے روحانیت کے مقابلہ میں چاہا جائے تو زندگی کے اس خاص رویّہ کا نام مادیت یا میٹرلزم بھی رکھ دیا جا سکتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ کافی معقول بڑی تعداد اس طبقہ میں ان ہی لوگوں کی ہمیشہ رہی ہے اور آج بھی ہے، جو بجائے مادّہ کے خدا ہی کو کائنات کا خالق و آفریدگار تسلیم کرتے ہیں لیکن بایں ہمہ اس خدا کی ذات سے ربط پیدا کرنے کا میلان ان میں نہیں پایا جاتا، وہ خدا کا انکار نہیں کرتے لیکن ان کی عملی زندگی بتاتی ہے کہ خالق کی ذات و صفات سے نہ ان کو کوئی دلچسپی ہے اور نہ ان سے تعلق قائم کرنے کی کوئی خواہش یا آرزو اپنے اندر وہ رکھتے ہیں بلکہ جہاں تک

مشاہدہ کا تعلق ہے ان کی اکثریت دنیا کے کسی نہ کسی مذہب و دین کی طرف بھی اپنے آپ کو عموماً منسوب کرتی رہی ہے اور آج بھی کسی نہ کسی مذہبی ٹولی میں اپنے آپ کو شمار کرنے والے ہی ان میں اکثر دیکھے جاتے ہیں مگر ان کے مشاغل کی فہرست آپ کو بتلائے گی، کہ خالق کے لئے اس میں کوئی مد نہیں رکھی گئی ہے اسی لئے ایسے سارے اعمال و افعال جو مذاہب و دیانات میں خالق ہی کے تعلق سے انجام دئے جاتے ہیں وہ چنداں اہم اور مستحق توجہ نہیں سمجھے جاتے[1]

اسی لئے بجائے خالص مادیت (میٹیرلزم) کے زندگی کے اس طریقہ کی تعبیر عملی مادیت (پریکٹیکل میٹیرلزم) سے کرنا غالباً زیادہ موزوں ہوگا، کیوں کہ مادیت جو فلسفہ کے ایک خاص مکتب خیال کی تعبیر ہے اس میں بجائے خدا کے مادّہ ہی کو عالم کا مصدر و سرچشمہ سمجھا جاتا ہے کچھ بھی ہو یہ واقعہ ہے کہ عملی مادیت کی اسی ذہنیت کے زیر اثر زندگی گذارنے والے آپ کو عیسائیوں، یہودیوں، ہندوؤں وغیرہ کے سوا خود مسلمانوں میں بھی ملیں گے بلکہ اکثریت پر یہی رنگ روز بروز ہوتا چلا جا رہا ہے

عبادت بجز خدمتِ خلق نیست　　　　بہ تسبیح و سجادۂ و دلق نیست

سے خود شعر کہنے والے شاعر کی مراد واقع میں جو کچھ بھی ہو، لیکن اسی قسم کی شاعرانہ تعبیروں سے ان فطری جذبات و عواطف کے تقاضوں کی تسکین بخشی میں عموماً سہارا لیا جاتا ہے جو براہ راست خالق ہی سے ربط پیدا کرنے کے لئے انسانی سرشت میں محفوظ کئے گئے ہیں،

بلکہ کہتے ہوئے اسی لئے جی ڈرتا ہے کہ شاید پہلی دفعہ کہا جا رہا ہے۔ پڑھنے والوں کو ممکن ہے تعجب ہو مگر کیا کیجئے کہ اپنی سمجھ میں یہی آیا ہے۔

---

[1] آج کل مسلمانوں میں بھی ایک ایسی ٹولی اُٹھ کھڑی ہوئی ہے جو اپنے کاغذی اور زبانی اعلانات میں دعویٰ کرتی ہے کہ عصرِ حاضر میں دین اسلامی کی تنہا علم بردار وہی ہے، لیکن اسی کے ساتھ بغیر کسی خوف اور جھجک کے اسی ٹولی کے لوگ بھی کہتے ہی پھرتے ہیں اور لکھتے بھی ہیں کہ نماز روزہ وغیرہ جیسی دینی عناصر دین کے جوہری عناصر میں ہیں اور کاروبار کے ان ہی شعبوں کو دین کا وہ سب کچھ قرار دیتے ہیں، جن میں جو کچھ بھی کیا جاتا ہے اس کا تعلق مخلوقات ہی سے ہوتا ہے اپنے اسی میلان کو اپنی دینی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت باور کرتے ہیں۔

بت پرستی یا اصنامیت بھی عملی مادیت کی ایک شکل ہے

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بت پرستی، یا مشرکانہ ذہنیت جس کا دور دورہ تاریخ کے مختلف قرون، ادوار میں مختلف ممالک و اقوام میں رہا ہے اور اب بھی بنی آدم کی اچھی خاصی آبادیوں میں اس کا رواج مردہ نہیں ہوا ہے۔

میرا خیال یہی ہے کہ یہ بھی عملی مادیت ہی کا ایک قدیم بلکہ پارینہ و فرسودہ قالب ہے، سمجھ میں یہی آتا ہے کہ خالق سے بے گانگی اور مخلوقات میں استغراق جو اس ذہنیت کی سب سے بڑی خصوصیت ہے جب اس ذہنیت کی تشکیل قوموں میں ہوئیں، جیسا کہ اس وقت تک ہوتی رہتی ہیں تو گو خالق کے وجود کا انکار نہیں کیا جاتا لیکن تعلق صرف مخلوقات ہی کی حد تک محدود ہو کر رہ جاتا ہے پھر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں منجملہ دوسرے کاموں کے مخلوقات سے استفادہ کی راہ میں آج کل تو صرف یہی کیا جاتا ہے کہ عقلی قوت کی مدد سے استفادہ کا دائرہ جس حد تک وسیع ہو سکتا ہو لوگ اپنی کوششوں کو اس دائرے تک محدود رکھتے ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عقلِ انسانی ارتقائی مدارج کے گذشتہ ابتدائی منزلوں ہی میں جب تک رہی اس وقت تک کبھی ایسی مخلوقات جن سے لوگ فائدہ اٹھاتے تھے یا منافع کی توقع رکھتے تھے یا ضرر رسانی کے پہلوؤں کو جن چیزوں کے متعلق کم کرنا چاہتے تھے خصوصاً نفع و ضرر کے اس باب میں جن مخلوقات کو گونہ اہمیت حاصل تھی ان کی افادیت یا ضرر رسانی کا پہلو زیادہ نمایاں تھا، ان ہی چیزوں کو قابو میں لانے کے لئے جہاں عقل و دانش سے کام لیا جاتا تھا وہیں عام طریقہ یہ بھی مروج تھا کہ خالق سے رشتہ قائم کرنے کے لئے جو جذبات و عواطف فطرت انسانی میں ودیعت کئے گئے ہیں یعنی دعا، عبادت وغیرہ کے فطری رجحانات کا جو حال ہے ان ہی جذبات کا رخ بجائے خالق کے اسی "عملی مادیت" کی ذہنیت والے مخلوقات کی طرف پھیر دیا کرتے تھے۔ مثلاً کسی ملک کے مختلف حصے یا قطعات پانی کے کسی سیلابی راہ کے بن جانے کی وجہ سے ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے تھے، یعنی کوئی دریا یا ندی نالہ درمیان میں حائل ہو کر لوگوں کی آمد و رفت کی سہولتوں کو دشواریوں سے اگر بدل دیتا تھا، تو آج کل کے دستور کے مطابق ان دریاؤں ندیوں نالوں سے گذرنے کے لئے میکانیکی ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں انجینیری کی مہارتوں سے کام لیا جاتا ہے لیکن عقلِ انسانی جب تک ترقی کر کے اس درجہ تک نہیں پہنچی تھی جہاں آج پہنچ چکی ہے تو ابتدا میں کچھ شادی اور

پیراکی کے ذریعہ سے عبور و مرور کی دشواری کو لوگ حل کرتے تھے یا اس سے بھی آگے بڑھ کر کشتیوں اور ہوا کے بہاؤ پر چلنے والے بادبانی جہازوں سے بھی کام لینے لگے۔ مشکلات پر قابو پانے کی یہ عقلی تدبیریں تھیں لیکن ظاہر ہے کہ بسا اوقات کشتیاں ڈوب بھی جاتی تھیں، جہاز پانی کی موجوں سے ٹکرا ٹکرا کر برباد ہو جاتے تھے اسی قسم کے مواقع جہاں دیکھا جاتا تھا کہ عقلی سہارے ختم ہو چکے ہیں اپنی فطرت کے دعائی اور عبادتی رجحانات کا رخ پانی کے اسی مجموعہ کی طرف پھیر دیا کرتے تھے جو نام بھی اس مجموعہ کا رکھدیا جاتا تھا۔ اسی نام کے ساتھ جیکارے لگاتے تھے ہمارے ملک میں آج تک یہ رواج موجود ہے کہ گنگا یا جمنا کے کنارے پہنچ کر گنگا ماتا کی جے جمنا جی کی دہائی وغیرہ الفاظ کے ساتھ لوگ چلانے لگتے ہیں اور پانی جیسی غیر قرار پذیر حقیقت جب پوجی گئی جو ہر سال ندیوں اور دریاؤں کی راہ سے گذر کر سمندر میں گم ہوتی رہتی ہے اور نیا سال پانی کے نئے ذخیروں کو لاتا رہتا ہے تو سورج چاند تارے جو نامعلوم زمانہ سے ایک ہی حال میں نظر آتے ہیں، ان کے معبود بن جانے پر کیوں تعجب کیا جائے، الغرض عناصر جمادات نباتات حیوانات جن میں نفع و ضرر کا پہلو نمایاں تھا، بہ تدریج معبودوں کی فہرست میں ان کا اضافہ ہوتا رہا حتیٰ کہ ایسے انسانی افراد جن سے کسی قسم کا نفع لوگوں کو پہونچا تھا، جب اپنی مدتِ حیات ختم کر کے اس دنیا سے چلے گئے تو ان سے استفادہ کی راہ پوجا پاٹ کی اسی راہ سے کھلی رکھی گئی اور ان کی مورتیاں بنا بنا کر لوگ پوجتے رہے۔

بہرحال عقلی ذرائع کے ساتھ ساتھ دعائی اور عبادتی رجحانات کا بھی نفع بخش اور ضرر رساں مخلوقات کے ساتھ تعلق قائم کر کے ان سے استفادہ یا ان کے ضرر رساں پہلوؤں سے استحفاظ اور بچاؤ کا سامان کرنا، میرے نزدیک بت پرستی کی یہی صحیح توجیہ واقعات کے مطابق ہے، کوئی شبہ نہیں کہ ہے تو یہ عقل انسانی کے عہدِ طفولیت اور نابالغی ہی کی یادگار لیکن اسی کے ساتھ یورپ کے عام مفکرین و مصنفین کی مشہور و معروف توجیہ، جہاں تک میرا خیال ہے ایک قسم کے فریب ستم ظریفی کے سوا شائبہ دہ اور کچھ نہیں ہے انسانی عقل و دانش کے ساتھ ایک تمسخر ہے لیکن ذکر اس کا ہر علم و فن کی چھوٹی بڑی کتابوں میں کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ گویا واقعہ کی اصل حقیقت بھی وہی ہے یعنی یہ جو کہا جاتا ہے کہ شروع میں اپنی کم عقلی کی وجہ سے لوگ آفتاب و ماہتاب، برق و رعد، الغرض ہر ایسی چیز جس سے آدمی مرعوب یا غیر معمولی طور پر اثر

ظہور پذیر ہو جاتا تھا، وہ خدا مان لی جاتی تھی، لیکن ترقی کی منزلوں کو جوں جوں عقل طے کرتی چلی جاتی تھی خداؤں
کی تعداد بھی گھٹتی چلی گئی تا آنکہ آخر میں ایک خدا کو مان لیا گیا جس سے گویا یہ سمجھانا مقصود ہے کہ توحید کا عقیدہ
شرک ہی کے عقیدے کا جانشین ہے، آدمی پہلے مشرک تھا اور عقلی ارتقاء کے بعد لوگ موحد ہوئے اور
اور گو اپنی اس توحید کو بیان کرنے والے عموماً اسی نقطہ تک پہنچا کر خاموش ہو جاتے ہیں، لیکن درحقیقت
ایک خاص قسم کا الحادی اشارہ اس توجیہ میں بھی پوشیدہ ہے، انسانی ذہن کو اس توجیہ کی راہ سے
ایک ایسی لغزش گاہ تک پہنچا دیا جاتا ہے جس پر پہنچنے والا بآسانی انکار خدا کے نتیجے کی طرف پھسلا کر پہنچا
دیا جاسکتا ہے یہ خود ہی بہ یک عنود اسی الحادی چٹان پر منہ کے بل گر سکتا ہے یعنی بآسانی لہذا یا جاسکتا ہے کہ موجودہ
زمانہ میں آدمی کی عقل جیسا کہ دیکھا جارہا ہے پچھلے دنوں کے لحاظ سے چونکہ بہت زیادہ ترقی یافتہ ہو چکی ہے
اس لئے "ایک خدا" کی ضرورت بھی آخر کیوں باقی رکھی جائے۔ بت پرستی کی اس خود تراشیدہ مغربی
توجیہ کا یہ ایک فدرتی لیکن ایک ایسا نتیجہ ہے جس کی طرف اس راہ پر چلنے والے یا چلائے جانے والے
چاہئے تو یہی کہ پھنسل کر خود پہونچ جائیں۔ حیرت تو اس پر ہوتی ہے کہ یورپ کے عام پیشہ ور ارباب فکر و نظر
ہی نہیں بلکہ مستند پادریوں بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کی کتابوں میں بھی کسی پس و پیش کے بغیر بت پرستی
کی توجیہ کا تذکرہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ اس طور پر کیا جاتا ہے کہ گویا جس دین یا مذہب کے وہ ماننے والے
ہیں اس پر کسی قسم کی کوئی زد اس توجیہ سے نہیں پڑتی بلکہ افسوس کے ساتھ اس کے اظہار پر اپنے آپ کو مجبور
پاتا ہوں کہ یورپ والوں کی اس ذہنی پھندے کا شکار کچھ دنوں سے یہ دیکھا جارہا ہے کہ ہمارے ہاں کے
مولویوں کا ایک طبقہ بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر ہو چکا ہے اپنی تحریروں اور تقریروں میں شرک و
بت پرستی کی اسی توجیہ کا چرچہ وہ بھی کرنے لگے ہیں، حالانکہ اور کچھ نہیں تو ان کو یہی سوچنا تھا کہ پہلے انسان
جب تورات و انجیل اور قرآن کے بیان کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔

العیاذ باللہ اگر اسی کو واقعہ مان لیا جائے کہ توحید کا عقیدہ بنی آدم میں عقیدۂ شرک کے بعد پیدا ہوا
تو اس کا مطلب آپ خود سوچئے اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ آدم علیہ السلام اور ان کے بعد ابنائے آدم
شرک میں مبتلا رہے، توحید کا عقیدہ پچھلی نسلوں میں عقیدۂ شرک کے بعد پیدا ہوا ان کو سوچنا چاہئے

کہ یہ مان لینے کے بعد کیا ان کی آسمانی کتابیں جنھیں وہ خدا تعالیٰ کی کتابیں یقین کرتے ہیں خدا کی کتابیں باقی رہتی ہیں خود ہندوستان کا حال بعد کو جو کچھ بھی ہوا لیکن مہابھارت جیسی آسمانی کتاب تک میں یہ اطلاع آج تک پائی جاتی ہے یعنی یہ بیان کرتے ہوئے کرت جگ جس کو ست جگ کہتے ہیں"

بھرست جگ جو انسانی تاریخ کے سب سے پہلے دور کی ہندی تعبیر ہے، اسی عہد کی دوسری خصوصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے یہ خبر بھی دی گئی ہے کہ

اس جگ میں دھرم (ایمان) کا ناش نہیں ہوتا تھا (یعنی اس میں خلل نہیں پیدا ہوتا تھا

دھرم کے ناش نہ ہونے کا مطلب آگے یہ بیان کیا گیا ہے، کہ

دیوتا، دانو، گندھرب، اکنھر، جلش، نش ایک پرشوتم[1]، بھگوان کی پوجا کرتے تھے (بن پرب الکتھدان ادھیائے)

شرک اور بت پرستی زمین کا جو حصہ سب سے زیادہ بدنام ہے، بلکہ آج تو شاید ساری دنیا میں سمجھا جاتا خود ہندوستان کا حال بعد کو جو کچھ بھی ہوا لیکن مہابھارت جیسی کتاب میں یہ اطلاع آج تک پائی جاتی ہے کہ بت پرستی اور مشرکانہ کاروبار کا سب سے بڑا علم بردار صرف ہمارا یہ ملک ہی باقی رہ گیا ہے، اب دیکھ رہے ہیں کہ اس کی بھی ایسی کتابوں میں جو دینی کتابوں ہی کے ذیل میں شمار ہوتی ہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آدمی پہلے موحد اور تنہا خالق کائنات کا پرستار تھا، دھرم میں ناش ہونے کی کیفیت یعنی مشرکانہ جراثیم بعد کو شریک ہوتے تو پھر یورپ والوں کا یہ پھیلاتے پھرنا کہ آدمی پہلے مشرک تھا، اور یہ تدریج عقلی ترقیوں کے بل بوتے پر وہ توحید کے موجودہ عقیدہ تک پہونچا ہے کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔

اور یہ تو خیر نقلی شہادتیں ہیں لیکن ان کے سوا انسانیت کی تاریخ کا جو حصہ اس وقت تک محفوظ رہ گیا ہے۔ اسی کا مطالعہ کیا جائے اور بتایا جائے کہ خالق عالم کے ساتھ دوسری چیزوں کو

[1] مختلف قسم کے غیبی مخلوقات جن میں بعض ادنیٰ اور بعض اعلیٰ سمجھے جاتے تھے ان ہی کو ہندوستان قدیم میں مذکورہ بالا ناموں سے موسوم کیا کرتے تھے آخری دو لفظ جکش ونش کے معنی وہی ہیں جو ہمارے جن وانس کے الفاظ سے مراد لیتے ہیں [2] پرشوتم لاند لہ ولاضد لہ کی تعبیر ہے، یعنی جس کی نظیر اور جس کا کوئی مدمقابل نہ ہو۔

پوجنے والے وقتاً فوقتاً جو پوجتے رہے ہیں، اور اپنے معبودوں میں ان کو شریک کرتے رہے ہیں کیا کسی زمانہ میں ان کو خدا یعنی یہ مانا گیا ہے کہ عالم کی آفرینش و تخلیق کا کام انہوں نے انجام دیا ہے۔ اس سلسلہ میں پرانی تاریخ ملک مصر کی ہے، اس میں شک نہیں کہ اپنے عروج و اقبال کے زمانہ میں مصر والوں کے ہاں بے شمار معبودوں کے پوجنے کا رواج تھا، کچھ دن ہوئے برہان میں حقیری ہی کا ایک مقالہ شائع ہو چکا ہے جس میں بتایا گیا تھا کہ سانڈ، کتے، بلی وغیرہ جیسی چیزیں بھی مصر میں پوجی جاتی تھیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے ان سارے معبودوں کو مصر والے خدا کے مخلوقات ہی میں شمار کرتے تھے ان میں کسی کے متعلق یہ خیال نہیں پایا جاتا تھا کہ دنیا کو وہ پیدا کرنے والے اور اس کے خالق ہیں، اسی مقالہ میں میں نے لکھا تھا کہ مصر والوں کے چند ممتاز معبودوں میں وہ کیڑے بھی شریک تھے جنہیں عربی زبان میں جعلان اور ہم لوگ گبریلے کہتے ہیں، ان مصریوں کے متعلق یہ کیسے مان لیا جائے کہ اسی گبریلے کیڑے کو عالم کا خالق کسی زمانہ میں وہ مانتے تھے یہ تو یورپ کے مادہ پرستوں ہی کا دل و جگر ہے کہ کائنات کے اس جیتے جاگتے نظام کے متعلق یہ ماننے پر تیار ہو گئے ہیں، کہ بے جان مردہ مادّہ سے ابل پڑا ہے جس میں زندگی نہ تھی اسی سے زندگی، جس میں علم و ادراک نہ تھا اسی سے علم و ادراک الغرض ہر قسم کے کمالات سے جو مادّہ خالی تھا اچانک اسی سے کمالات کا یہ سمندر ٹھہرا جس کا نام عالم ہے بہرحال پوجنے والے اس میں شک نہیں کہ مختلف زمانہ میں مختلف چیزوں کو پوجتے رہے ہیں اور آج تک ان پوجنے والوں کی کافی تعداد آدم کی اولاد میں باقی ہے ان میں جو گذر چکے ان کو جانے بھی دیجیے لیکن جو باقی رہ گئے ہیں ان ہی سے پوچھیے اور سنئے جواب میں بالاتفاق وہ یہی کہیں گے کہ چاند ہو یا سورج، آگ ہو یا پانی سانپ ہو یا گائے بیل یہ سب کچھ خدا ہی کی پیدا کی ہوئی چیزیں ہیں یہی خیال ان کے بزرگوں کا بھی تھا اور اب بھی وہ یہی مانتے ہیں، باوجود اس کے وہی نفع و ضرر کے پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے بزرگوں نے بھی ان خدائی مخلوقات کے ساتھ دعا، وعبادت کا رشتہ قائم کر لیا تھا اور اپنے باپ دادوں کی اسی روش پر اب بھی وہ گامزن ہیں۔

الغرض بت پرستی کی یہ مضحکہ خیز مغربی توجیہ کہ بہت سے خداؤں کو بہ تدریج گھٹاتے ہوئے ایک خدا کے عقیدے تک عقلِ انسانی پہنچی ہے، عقلاً نقلاً تاریخاً بجز ایک ایسی ادعائی توجیہ کے اور کچھ نہیں۔ ہے جس کا تعلق

وواقعات سے قطعاً کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رہے،

بالکل ممکن ہے کہ دنیا کی موجودہ موحد قوموں یعنی خالق عالم کے سوا کسی مخلوق کی عبادت کو جو دین نہیں بلکہ بے دینی ہی کا سب سے زیادہ خطرناک اور مہیب تالب یقین کرتے ہیں، ان کے قلوب میں بت پرستی کی اس مغربی توجیہ سے اس اغوائی وسوسہ کا بھی ڈالنا توجیہ کرنے والوں کا مقصود ہو کہ پرانی مشرک اور بت پرست قوموں ہی کی یادگار اور جانشین دنیا کی موجودہ موحد قومیں ہیں، دونوں میں فرق اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ آہستہ آہستہ کثرت سے ہٹتے ہوئے وحدت کے نقطہ تک عقل و خرد نے ان کو پہنچا دیا ہے، قطع نظر اس سے کہ ذہنِ انسانی اس توجیہ کے زیر اثر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں طبعاً اس لغزش گاہ تک پہنچ جاتا ہے۔ جس پر پہنچنے کے بعد الحاد یعنی ایک خدا کے انکار کی گھاٹیوں میں پھنس کر گر پڑنے کا خطرہ سامنے آجاتا ہے، گویا الحادی ذہنیت کی زمین کی تیاری کا کام جہاں اس منحوس توجیہ سے لیا جا سکتا ہے وہیں خالق پرستوں کے دل میں اس خیال کو پیدا کر کے کہ پرانی مخلوق پرست مشرک قوموں ہی کی وہ یادگار اور جانشین ہیں اس سے استقامت و اطمینان، سکینت و ثبات کے ان جذبات کو مضمحل کرنا بھی مقصود ہو، جو ہر موحد توحید کے عقیدہ کے متعلق اپنے اندر پاتا ہے تو اس پر متعجب نہ ہونا چاہئیے، دجل و فریب کے اس عہد تار میں آنے والے جن جن راہوں سے آرہے ہیں، اور سبیل اللہ سے اللہ کے بندوں کو روکنے، بلکہ بھٹکانے بدکانے کی بے پناہ کوششیں نت نئی گوناگوں شکلوں میں ہر طرف جاری وساری ہیں ان کو دیکھتے ہوئے میرے اس خیال کو صرف بدگمانی قرار دینے کی جرأت مشکل ہی سے کوئی کر سکتا ہے حالانکہ اس راہ میں بھی اگر حقیقت پر نظر رکھی جائے تو باسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ خالق سے بے گانہ ہو کر مخلوقات ہی مخلوقات میں آج یورپ کے باشندے جو ڈوبے ہوئے ہیں صحیح معنوں میں پرانی مخلوقات پرست قوموں کی یادگار یا جانشین ہونے کی عزت اگر حاصل ہو سکتی ہے تو اس عزت کے جائز حقدار اور وارث وہی ہو سکتے ہیں آخر خود سوچئے بت پرست قوموں کی سب سے بڑی خصوصیت جیسا کہ آپ سن چکے ہی تو تھی کہ بجائے خالق کے مخلوقات ہی سے اپنا رشتہ انہوں نے قائم کر لیا تھا، ان کا دستور ہی یہ تھا کہ نفع اور ضرر کے پہلو جن مخلوقات میں زیادہ نمایاں تھے۔ ان ہی سے عقلی رشتہ کے سوا عبادتی اور دعائی رشتہ بھی قائم کر لیا کرتے تھے، وہ دریاؤں پر قابو حاصل کرنے

کے لئے عقل کے زور سے کشتی اور جہاز جیسی چیزیں بھی بناتے اور چلاتے تھے اور جہاں عقلی سہارا ختم ہوجاتا تھا وہاں دیکھا جاتا تھا کہ دعاء وعبادت کے جذبات جو خالق ہی سے ربط پیدا کرنے کے لئے انسانی فطرت میں ودیعت کئے گئے ہیں ان جذبات کا رخ بھی دریاؤں اور اس کے پانی کی طرف پھیر دیا کرتے تھے۔ میں یہ مانتا ہوں کہ یہ جو کچھ تھا ان کے عقول کی خامی ہی کا نتیجہ تھا شنوائی کی قوت جو آوازوں کے سننے کے لئے آدمی میں رکھی گئی ہے اس قوت سے رنگ، اور روشنی جیسی چیزوں کے جاننے کی کوشش جس کے لئے بینائی کی قوت ہمیں بخشی گئی ہے جیسے بدعا ہے شنوائی کی قوت کا یہ غلط استعمال اور کچھ نہیں ہے، اسی طرح دعاء وعبادت، پوجا پاٹ، جب تب کے فطری اقتضاؤں سے بجائے خالق کے مخلوقات کو راضی کرنے کی کوشش یہ بھی عقل کی خامی اور نابالغی ہی زمانہ کا فیصلہ تھا لیکن باایں ہمہ خالق سے بے گانگی، اور مخلوقات ہی میں ہمہ تن استغراق، اس باب میں ان قدیم بت پرست قوموں کا حال ان ہی نئی قوموں کا تھا جن کی زندگی کی سرگرمیوں میں مخلوقات کے سوا خالق کے لئے کسی قسم کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے، فرق اگر کچھ ہے تو صرف یہی ہے کہ اپنے عقلی ضعف اور نابالغی کی وجہ سے عقلی رشتہ کے سوا دعائی رشتہ بھی پرانی بت پرست قومیں ان ہی مخلوقات سے قائم کئے ہوئے ہیں جن کے افادی پہلوؤں سے وہ نفع اٹھانا چاہتے تھے یا ضرر سے جن کے بچنا چاہتے تھے اور عقل کے اس عہد ارتقاء میں دعائی رشتہ کو ختم کرکے نئی قوموں نے صرف عقلی رشتہ کو ان ہی مخلوقات کے ساتھ باقی رکھا ہے جن سے وہ مستفید ہونا چاہتے ہیں یا ضرر رسانی سے جن کے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں اسی لئے صحیح معنوں میں پرانی بت پرست اور مخلوق پرست قوموں کی یادگار اور باضابطہ وارث اور جانشین اگر ہوسکتی ہیں تو اس زمانہ کی وہی قومیں ہوسکتی ہیں جو خالق سے قطعاً کنارہ کش ہوکر یکسوئی کے ساتھ مخلوقات ہی میں گڑی ہوئی ہیں، ان ہی کے ادھیڑ بن میں اور ان ہی کے الٹنے پلٹنے میں مصروف مشغول ہیں، لیکن خالق کے سوا کسی قسم کی کوئی مخلوق ہو نباتات وجمادات وحیوانات ہی نہیں بلکہ ملک ہو، جن ہو، یا کوئی بڑا آدمی ہی کیوں نہ ہو، ولی ہو، نبی ہو، رسول ہو، کچھ ہو کسی مخلوق کے ساتھ عبادتی ودعائی رشتہ قائم کرنا جن کے نزدیک بددینی کی بدترین شکل ہو بھلا ان خالق پرست استوں کو پرانی بت پرست یا مخلوق پرست قوموں کی یادگار یا جانشین قرار دینا تمسخر کے سوا اور بھی کچھ ہے۔

لیکن اس ظلم کا کوئی ٹھکانہ ہے، عرض ہی کر چکا ہوں کسی فن کی کوئی کتاب ہو، بڑی ہو چھوٹی ہو، کسی نہ کسی حیلے سے بت پرستی کی مذکورہ بالا توجیہ اپچ کو ہر پھیر کر دہراتے والے کچھ اس طرح دہراتے رہے کہ تورات والوں کے دماغ سے تورات کا وہ سبق نکل گیا جو پہلے انسان آدم علیہ السلام کے متعلق پڑھایا گیا تھا انجیل والوں کو بھی یہ یاد تر ہے کہ بت پرستی کی اس توجیہ پر ایمان لانے کے بعد انجیل پر ان کا ایمان باقی بھی رہتا ہے یا نہیں، اور جب قرآن کے ماننے والوں کے سامنے بھی قرآن کی آیتوں کا مفاد اس غوغائی ہنگامہ میں اوجھل ہو گیا جن میں بتایا گیا ہے کہ انسانوں کا پدر اول کن خصوصیتوں کا حامل تھا اسی لئے محراب و منبر سے بھی اس دجالی توجیہ کی آواز باز گشت ٹکرانے لگی ایسی صورت میں مہابھارت کی رزمیہ نظم کو اپنی دینی کتاب والوں سے بھلا کیا شکایت کی جائے کہ ست جگ یعنی تاریخ انسانی کے سب سے پہلے دور اور قرآن کی سب سے بڑی خصوصیت ان غریبوں کو کیوں یاد نہ رہی ؟

اگرچہ شکر ہے کہ تقریباً چند صدیوں تک یورپ کے علمی نقار خانے بت پرستی کی اسی توجیہ قطعاً غلط، سراسر بے بنیاد توجیہ سے جو گونجتے رہے، ان ہی نقار خانوں سے کبھی کبھی طوطی کی زبانوں سے اس قسم کے الفاظ بھی نکلنے لگے ہیں، کچھ دن ہوئے یورپ سے مارسٹن صاحب کتاب دی بائبل کمز الائیو نامی آئی تھی جس میں بت پرستی کی مذکورہ عام اور مشہور توجیہ کے مقابلہ میں یہ دعویٰ پیش کیا گیا ہے کہ

"وہ نسل انسانی کی قدیم ترین مذہب کی تاریخ توحید سے آخری درجہ تک کے شرک اور بدروحوں کے اعتقاد کی طرف ایک تیز رو پرواز ہے"

اور تاریخی شواہد و بنیات کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ توحید ہی کا عقیدہ انسان کا ابتدائی عقیدہ ہے کچھ نقار خانوں میں طوطی ہی کی آواز سنی، لیکن جب وہ اٹھنے لگی ہے، تو کون کہہ سکتا ہے کہ اس دجالی فریب کا پردہ آج نہیں تو کل ہی چاک نہ ہوگا، خدا کرے کہ جیسے بہت سے مسائل میں یورپ والے حقائق و واقعات کی روشنی میں نتیجے تک پہنچ چکے ہیں اس مسئلہ میں بھی ان کی توفیق بخشی جائے اور یہ تو خیر بت پرستی کی گونہ نئی توجیہ ہے چند صدیوں سے زیادہ اس کی عمر شاید آگے نہیں بڑھ سکتی لیکن اسی بت

پرستی یا مشرکانہ کاروبار کی ایک قدیم کہنہ توجیہ ہی ہے، جسے بجائے توجیہ و تاویل کے آیا لوجی معذرت قرار دینا غالباً زیادہ درست ہوگا۔ عام طور کے ترک و توحید کا تذکرہ جہاں چھڑتا ہے پیش کرنے والے اس کو پیش کر دینے کے عادی ہیں یعنی نادیدہ، ان دیکھے خالق ہی سے رشتہ قائم کرنے میں پیش نظر دیدہ مخلوقات سے سہارا لینے کی یہ کوشش ہے مطلب گویا یہ ہوتا ہے کہ بت پرستی کی روح بھی درحقیقت خالق پرستی ہی ہے، لیکن خالق چونکہ ہمارے سامنے نہیں ہے، اس لئے کسی ایسی مخلوق کو سامنے رکھ لیا جاتا ہے جس پر نظر بھی جم سکتی ہے اور دل و دماغ بھی ہر طرف سے سمٹ کر ایک نقطہ پر ٹھہرانے میں مدد ملتی ہے اس میں شک نہیں کہ کہنے والوں نے پہلے بھی یہی کیا ہے اور آج بھی دھرانے والے بت پرستی کی اس پرانی توجیہ کو عموماً دھراتے رہتے ہیں۔ المسعودی جو چوتھی صدی کا سیاح و مورخ ہے، ہندوستان کی بت پرستی کا ذکر کرتے ہوئے اس نے بھی اطلاع دی ہے کہ

اللبیب منہم یقصد بصلاتہ الخالق	یعنی ان ہندوستانی بت پرستوں میں جو صاحب
ویقیم التماثیل من الاصنام والصور	مغز و عقل ہیں وہ تو اپنی پوجا پاٹ پرار تھنا میں خالق
مقام قبلۃ ص ۱۹۱ مروج الذہب	ہی کو اپنا مقصود بناتے ہیں اور مورتیوں یا تصویروں
بر کامل ابن اثیر	کو بطور قبلہ کے اپنے سامنے رکھتے ہیں (یعنی چہرہ
	بتوں کی طرف رہتا ہے اور توجہ خالق کی طرف)

غالباً ہندوستان میں اس کے سامنے یہی توجیہ معذرت کی شکل میں پیش ہوئی ہوگی، کیوں کہ اس ملک میں وہ خود بھی آیا ہے اور مختلف مقامات کی سیر کی ہے۔ باقی،

قاضی شُریح

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق)

(ایم۔اے۔پی۔ایچ ڈی پروفیسر دہلی کالج)

شُریح پہلی صدی ہجری کے ایک نہایت قابل قدر غیر سیاسی شخصیت ہیں ان کی زندگی کے مطالعہ سے جس کے خدوخال افسوس ہے کہ خوب واضح نہیں ہیں ان کی سچی عظمت وعزت کا دل معترف ہوتا ہے وہ تقریباً ساٹھ سال اور بقول بعض ساٹھ سال سے زیادہ جج رہے یہ ایک لمبا عرصہ ہے اور پہلی صدی ہجری کے فتنہ پرور نیز تیزی سے بنتے بگڑتے سیاسی حالات میں جن کے دامن سے یہ وابستہ تھے حیرت ناک بھی ہے۔ ان کی عظمت وعزت کا دل اس لئے معترف ہوتا ہے کہ وہ حقیقی طور پر خدا ترس، راستباز اور انصاف پسند انسان تھے، خیالی خدا ترسی یا زبانی راستبازی نہیں بلکہ وہ خدا ترسی و راستبازی جس کی پرکھ عمل سے ہوتی ہے، جو لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا اور آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کی صحیح مصداق ہے وہ خدا ترسی و راستبازی ہی نہیں جو روزہ نماز، حج و زکاۃ تک محدود ہے بلکہ وہ جو زندگی کی ہمہ گیر، مصروفیتوں، معاملات، خواہشوں اور خواہشوں کی تکمیل اور تکمیل کے طریقوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ صفت ہم کو ان کے اکثر ہم رتبہ اور ہم بعض معاصروں میں صاف نہیں نظر آتی اور ان کے چاروں طرف جو سیاسی وقبا کی کردار ہیں جن کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور ہے ان کی زندگی میں تو اس کے نقوش بہت دھندلے ہیں۔

شُریح سنہ ۱۸ھ میں قاضی ہوئے اور سنہ ۷۹ھ میں غالباً کبر سنی کی بنا پر استعفاء دیا، یہ تاریخیں مورخ طبری متوفی سنہ ۳۱۰ھ نے دی ہیں۔ ان کی عمر بقول بعض ایک سو اسی سال [۱۸۰] بقول بعض ایک سو بیس [۱۲۰]

---

[۱] طبری مصر ایڈیشن ج ۷ ص ۲۸۲

اور بقول بعض ایک سو سال تھی، قاضی بننے سے پہلے کی زندگی کے جو حالات دریافت ہو سکے ہیں یہ ہیں:

اُن کے باپ ایران سے آکر یمن میں آباد ہوئے تھے[1]۔ اس مہاجرت کا شانِ نزول یہ ہے کہ ملک حبش کے بادشاہ نے یمن کے بادشاہ سیف بن ذی یزن کے ملک پر قبضہ کر لیا تھا اور ایک لاکھ سے زیادہ فوج تیار کی تھی، سیف اتنی بڑی فوج کے مقابلہ سے عاجز تھا، وہ ایران کے بادشاہ نوشیروانِ عادل کی خدمت میں حاضر ہوا اور حبشہ کے بادشاہ کے مقابلہ کے لئے مدد مانگی اور حکومت پانے کے بعد ایران کا باجگذار ہونے کا وعدہ کیا۔ نوشیروان ہمدردی سے پیش آیا لیکن وہ اپنی قیمتی فوج کو ایک غیر قیمتی علاقہ کی خاطر سمندری سفر کے ہولناک خطروں میں ڈالنے کے لئے تیار نہ ہو سکا اس کے وزیروں نے مشورہ دیا کہ ملک کے قیدیوں کی ایک فوج بنا کر اس سے مدد کی جائے، چنانچہ ایک قابل سپہ سالار کی سرکردگی میں آٹھ سو قیدیوں کی ایک مسلح فوج آٹھ کشتیوں میں یمن بھیجی گئی، دو کشتیاں سمندری سفر میں تباہ ہوئیں اور چھ بخیریت ساحلِ یمن پہنچیں، حبش کی فوجوں کو شکست ہوئی اور سیف بن ذی یزن ایرانی حکومت کے تحت اپنے باپ دادا کے ملک پر قابض ہوا[2]۔ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ شریح کے باپ سپاہی کی حیثیت سے آئے تھے یا فوج کے انتظامی یا خدمتی عملہ سے ان کا تعلق تھا اگر سپاہی تھے تو جیسا کہ اوپر بیان ہوا قیدی ہوں گے جن کو حکومت کی طرف سے کسی جرم کی سزا دی گئی ہوگی، سیف کا یمن پر قبضہ نوشیروان کی حکومت کے ۴۵ سال بعد ہوا[3]، محمد رسول اللہؐ کی عمر اس وقت ۵ سال کی تھی[4]۔

مصنف اصابہ نے ایک قول نقل کیا ہے کہ شریح کی عمر قاضی ہونے کے وقت چالیس برس کی تھی[5] اس اعتبار سے ہجرت کے وقت ان کی عمر بائیس[22] برس کی ہوگی۔ یہ کب اور کس طرح مسلمان ہوئے؟ اس سوال کا یقینی جواب نہیں دیا جا سکتا ایک رائے یہ ہے کہ وہ معاذ بن جبل (متوفی ۱۸ھ) کی صحبت سے مستفید ہوئے تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یمن کے ضلع جَند کا قاضی مقرر کیا تھا، اس مسئلہ میں کہ انھوں نے رسول اللہ کو دیکھا یا نہیں دو رائیں ہیں ایک یہ کہ نہ دیکھا اور نہ کوئی حدیث

---

[1] اغانی مصر ایڈیشن ۱۶/۴۶ [2] طبری ۲/۹۵۶ [3] مروج الذہب مصر ۲/۴۴ [4] مروج ۲/۲۸۰ [5] اصابہ مصر ۲/۱۴۶

سنی، دوسری رائے اور شاید زیادہ قابل اعتماد یہ ہے کہ وہ رسول اللہؐ کے آخری زمانہ میں ان سے ملے تھے اور رسول اللہؐ کے ایما پر اپنے کنبہ والوں کو لینے یمن گئے تھے اور جب لے کر آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو چکی تھی۔[1]

پہلی بار گھر چھوڑ کر مدینہ آنے کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ ان کی ماں نے باپ کی وفات کے بعد دوسری شادی کر لی تھی جو ان کو ناپسند تھی۔[2]

رسول اللہ کی وفات ۱۱ھ کی ابتدا میں ہوئی جس وقت شریح کی عمر تقریباً تیس[3] سال ہو گی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قاضی بننے سے پہلے وہ تجارت کرتے تھے۔ اس رائے کی تائید ابن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ) کے اس قول سے ہوتی ہے: شریح تاجر تھے اور ان کے ڈاڑھی نہ تھی۔[4]

مصنف استیعاب نے لکھا ہے: شریح فیصلہ کی سمجھ بوجھ میں یکتا تھے، ان کی معلومات وسیع اور صحیح تھی اس کے علاوہ عمدہ شاعر تھے جن کے پہلے مضامین پر مشتمل اشعار محفوظ ہیں، ان کے چہرہ پر ڈاڑھی کا ایک بال بھی نہ تھا۔[5] ابن خلکان لکھتے ہیں کہ پہلی صدی میں چار نامور بے ڈاڑھی والے ہوئے ہیں جن میں ایک شریح تھے باقی تین یہ ہیں، ابن الزبیر متوفی ۷۳ھ، قیس بن سعد بن عبادہ متوفی ۶۰ھ، احنف بن قیس متوفی ۷۱ھ

شریح کے ایک معاصر کا کہنا ہے کہ "میں نے شریح کی ڈاڑھی سفید دیکھی" یہ قول مصنف استیعاب کی مذکورہ رائے کی تردید کرتا ہے کہ شریح کے چہرہ پر ڈاڑھی کا ایک بال بھی نہ تھا

ان کے لئے کتابوں میں لفظ مزاح استعمال ہوا ہے، اور اس کی تائید میں ان کے متعدد قول نقل کئے گئے ہیں جن سے ان کی شگفتہ مذاقی کا پتہ چلتا ہے، لیکن مذکورہ صفات اور ان کی سیرت میں رچی ہوئی خدا ترسی کے بعد جس صفت نے ان کو حیرت انگیز حد تک کامیاب جج بنایا وہ ان کی تحلیلی و استنباطی عقل تھی، وہ بظاہر سیدھے سادے لگتے لیکن بباطن بے میل مسائل کو خوب سمجھ لیتے تھے ان میں قرآن سے نتائج نکالنے اور ان کی مدد سے مسائل سلجھانے کا اچھا سلیقہ تھا، عربوں میں تحلیلی

---

[1] اصابہ ۲/۱۴۴ [2] اغانی ۱۶/۳۵ [3] تہذیب التہذیب ۴/۳۲۶ [4] استیعاب برحاشیہ اصابہ ۲/۱۵۷

واستنباطی عقل کیاب تھی، وہ تقلید پسند لوگ تھے جو استنباطی عقل کی جگہ سلف کی مثالوں پر زیادہ بھروسہ کرتے تھے، جن کے فیصلے اکثر دوراندکار بیشتر گرد وپیش کے حالات نیز قبائلی و شخصی مصلحت اندیشی سے متاثر ہوتے تھے، شریح کی ان صفات کو بروئے کار لانے کے لئے قدرت نے ایک گویا زبان اور سلجھا ہوا انداز بیان عطا کیا تھا،

قاضی

جیسا کہ اوپر بیان ہوا شریح ۱۸ھ میں قاضی ہوئے۔ یہ حضرت عمرؓ کا زمانہ تھا اور ان کی خلافت کا پانچواں سال ۱۴ھ میں بصرہ اور ۱۵ھ میں کوفہ کی فوجی چھاؤنیاں سرحد عراق پر وجود میں آچکی تھیں، عراق اور ملک ایران کا ایک اہم حصہ عرب مجاہدین کے ہاتھوں فتح ہو چکا تھا، مفتوحہ علاقوں کی نگرانی اور غیر مفتوحہ علاقوں کو فتح کرنے کے لئے ان دو شہروں میں حجاز کے بہت سے قبیلے مع اہل وعیال آباد ہوگئے تھے جن کی تعداد حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک لاکھ سے زیادہ تھی اور دس سال بعد دو لاکھ سے متجاوز ہوگئی تھی، یہ اسلامی حکومت کے سب سے بڑے فوجی، قبائلی اور مالی مرکز تھے اور عنقریب باہمی قبائلی جھگڑوں، فتنہ انگیزیوں اور عربی حزبیت وانتقام کے بھی سب سے بڑے مرکز بننے والے تھے، کوفہ کی مجاہدین آبادی نے حضرت عمرؓ کے زمانہ سے بھی شورش وفتنہ کی چنگاریاں اڑانا شروع کر دی تھیں جیسا کہ سعد بن ابی وقاص (متوفی ۵۵ھ) اور ان کے بعد عمار بن یاسر (متوفی ۳۷ھ) کی پے در پے معزولی سے ظاہر ہوتا ہے، سعد ۲۱ھ میں معزول ہوئے، عمار ۲۲ھ میں، سعد کے خلاف یہ شکایت تھی کہ ان کو نماز پڑھانا نہیں آتی، عمار کے خلاف یہ شکوہ تھا کہ ان کو حکومت کا ڈھنگ نہیں آتا، حقیقت میں ان شکایتوں کے اسباب فتنہ پرور محرکات تھے۔

۱۸ھ سے پہلے بصرہ کے قاضی ابو مریم حنفی اور کوفہ کے قاضی ابو قرہ یا ابو فروہ تھے، ان دونوں میں سے کسی کو رسول اللہؐ کی صحبت نہیں ملی تھی بلاذری کی فتوح البلدان مصر ایڈیشن کے صفحہ ۳۴۸ پر ہے کہ پہلا شخص جس نے بصرہ آباد ہونے کے بعد وہاں کی مسجد میں بحیثیت قاضی فیصلے کئے اسود بن سریع تمیمی تھے یہ رائے صحیح نہیں ہے، استیعاب اور اصابہ ہر دو کے راوی متفق ہیں کہ اسود قاضی نہیں بلکہ واعظ تھے[۱] ایسا

---

[۱] استیعاب بر حاشیہ اصابہ ج۱ و اصابہ ج۱

معلوم ہوتا ہے کہ ۱۴ھ سے ۱۷ھ تک جب ابو مریم کا تقرر ہوا بصرہ میں قاضی کے فرائض گورنر انجام دیتا تھا اس خیال کی تائید حضرت عمر کے ان خطوط سے ہوتی ہے جو انہوں نے ابو موسیٰ اشعری (متوفی ۵۰ھ) کو جو ۱۷ھ کے اوائل میں بصرہ کے گورنر ہوئے تھے قضا اور انصاف کے اصول کے بارے میں لکھے تھے۔

ابو موسیٰ چوں کہ جنگی مہموں پر اکثر بصرہ سے باہر رہتے اس لئے غالباً خود انہوں نے ابو مریم کا تقرر کیا تھا۔

کوفہ کے قاضی ۱۵ھ تا ۱۷ھ ابو قرہ تھے،[2] ابو قرہ کو ابو فروہ بھی کہا گیا ہے[3]، یہ مولیٰ یعنی آزاد کردہ غیر عرب تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ ان دونوں قاضیوں سے پوری طرح مطمئن نہ تھے اور ایسے آدمیوں کی تلاش میں تھے جو قضا کے بلند منصب پر ہر طرح پورے اترتے ہوں۔

۱۸ھ میں ان کو ایسے دو شخص ملے جو قاضی بننے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے، ایک کعب بن سود ازدی (متوفی ۳۶ھ) اور دوسرے شریح، کعب ایک نصرانی خاندان کے نومسلم تھے جن کو رسول اللہ کی صحبت نہیں ملی تھی، لیکن جو شریح کی طرح راستباز تھے اور استنباطی و تحلیلی دماغ رکھتے تھے، حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں مدینہ کے قاضی تھے اور خلیفہ ہونے کے بعد بھی اکثر قضیئے سنتے تھے، ایک بار ایک عورت آئی اور کہا میرا خاوند رات کو نماز پڑھتا ہے اور دن میں روزہ رکھتا ہے" یہ درحقیقت اپنے شوہر کی ازدواجی بے تعلقی کی شکایت تھی جس کو عمرؓ نہ سمجھ سکے، انہوں نے شوہر کی عبادت گذاری کی تعریف کی اور عورت چلی گئی، کعب بن سود اتفاق سے موجود تھے، وہ عورت کا اشارہ پا گئے اور حضرت عمرؓ سے اس کی تصریح کی، عمرؓ نے عورت کو بلوایا اور بولے "حق بات کہنے میں تمہارے لئے کچھ جرم نہ تھا، یہ (کعب) کہتے ہیں تم اپنے شوہر کی ازدواجی بے تعلقی کی شاکی ہو" عورت نے اس کا اقرار کیا حضرت عمرؓ نے شوہر کو بلوایا اور کعب سے اس معاملہ میں فیصلہ کرنے کو کہا، کعب کو امیر المومنین کے روبرو یہ جرأت کرتے ہوئے تردد ہوا لیکن حضرت عمرؓ کے منت آمیز اصرار پر وہ تیار ہو گئے اور بولے "مرد کو چار شادیوں کی اجازت ہے، اگر اس کا شوہر چار دن میں ایک دن اس کی صحبت میں گذارے تو میرے نزدیک عین انصاف کے مقتضی ہے،" عمرؓ کعب کے اس قرآنی استنباط اور سلجھے ہوئے فیصلے سے بہت متاثر ہوئے، عورت کے

---

[2] طبری ۲۲۲۰، ۲۴۸۵، ۲۴۸۸ [3] اصابہ ۴/۱۴۰ [4] استیعاب حاشیہ اصابہ ۳۰۲-۳۰۴/۲

حق میں یہ فیصلہ دیا اور کعب کو بصرہ کا قاضی مقرر کیا[1]

شریح کے تقرر کا بھی کچھ ایسا ہی پس منظر ہے حضرت عمرؓ نے کسی سے ایک گھوڑی کی خریداری کی بات چیت کی جب قیمت طے ہو گئی تو انہوں نے آزمائش کے طور پر گھوڑے کی سواری کی یا جیسا کہ اغانی میں ہے کسی سے کرائی۔ آزمائش کے دوران میں گھوڑا مر گیا عمرؓ گھوڑے کے مالک کو گھوڑا لوٹانے لگے تو اس نے لینے سے انکار کیا۔ حضرت عمرؓ نے کہا کسی کو بلالاؤ جو ہمارے تمہارے درمیان فیصلہ کردے، وہ شریح کو لایا جنھوں نے یہ فیصلہ کیا "امیرالمومنین جو چیز آپ نے خریدی ہے اس پر قبضہ کیجئے یا جیسی لی تھی لوٹا دیجئے"۔ عمرؓ اس فیصلے سے پھڑک کر بولے "کیا منصفانہ فیصلہ اس کے سوا اور کچھ ہو سکتا ہے! " جاؤ تمہیں کوفہ کا قاضی بناتا ہوں[2]۔ ابن سعد نے اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ حضرت عمر کا شریح سے یہ پہلا تعارف تھا۔

ابن عساکر نے شعبی کے حوالہ سے تاریخ دمشق ۶/۳۰۵ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ نے شریح کی تنخواہ سو درہم (تقریباً ساٹھ روپے) ماہانہ مقرر کی جب شریح کوفے جانے لگے تو حضرت عمرؓ نے یہ ہدایت کی "خدا کی کتاب میں جو فیصلہ تم کو ملے اس کی بابت کسی سے کچھ مت کہو سنو اور جب کوئی فیصلہ صاف صاف وہاں نہ ملے تو سنت کی طرف رجوع کرو، اگر وہاں بھی نہ ملے تو اجتہاد سے کام لو اس کے علاوہ مجلس قضا میں نہ کسی سے لڑو، نہ جھگڑو، نہ خریدو نہ بیچو[3]"

قاضی شریح کے طویل منصب قضا (۱۸ھ تا ۷۹ھ) کے عہد کی صرف جھلکیاں ہمارے سامنے آئی ہیں، ان کی سیرت اور قضا کے حالات قیمتی ہونے کے باوجود جہاں تک مجھے معلوم ہے استقصار کے ساتھ کبھی مرتب نہیں ہوئے، متعدد کتابیں جو میری نظر سے گذری ہیں ان میں ان کے حالات بے سیاق و سباق اشاروں اور حکایتوں کی شکل میں بکھرے ہوئے ہیں اور متعدد کتابوں کا مواد ایک دوسرے سے مشترک اور مستعار نظر آتا ہے تاہم یہ جھلکیاں جب جمع ہو کر سامنے آتی ہیں تو ان سے شریح کی انفرادی سیرت، ان کی سیرت بحیثیت قاضی، ان کے انصاف کے طریقوں اور ان کے سیاسی طرز عمل کی ایک ایسی تصویر کھنچ جاتی ہے جس کے خدوخال واضح ہوتے ہیں اور جس کا خمیر راستبازی اور عملی خدا ترسی

---

[1] استیعاب حاشیہ اصابہ ۳/۳۴۲-۳۴۳ [2] طبری ۴/۲۲۲۱٫۸۸٫۸۸ [3] اصابہ ۴/۱۴۰

سے بنتا ہے۔

۱۸ھ کے بعد شریح سے ہماری ملاقات حضرت علیؓ کی زمانۂ خلافت میں ہوتی ہے ۲۳ھ میں حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے اور ۳۶ھ میں حضرت علیؓ، اس تیرہ برس کے عرصہ میں ایسے دور رس واقعات رونما ہوئے جو شاید تاریخ اسلام میں کبھی نہیں ہوئے ہوں گے، حضرت عثمانؓ اور ان کے عمال کے خلاف جو شورش و بد اطمینانی پیدا ہوئی اس کا سب سے بڑا مرکز کوفہ تھا جہاں شریح قاضی تھے ۲۲ھ میں حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن مسعود (متوفی ۳۲ھ) کو بیت المال کی نگرانی اور کوفیوں کو قرآن و دین کی تعلیم دینے بھیجا تھا۔ ابن مسعود رسول اللہؐ کے مقرب اور لائق ترین ساتھیوں میں تھے اور قرآن و دین کی بہت ہی بصیرت رکھتے تھے، ان کی زیر تعلیم قبائلی سرداروں کا ایک گروہ وجود میں آیا جس کو قراء کے لقب سے تاریخ میں یاد کیا گیا ہے، یہ لوگ کثرت سے قرآن پڑھتے اور لوگوں کی دینی معاملات میں رہنمائی کرتے۔

۲۳ھ میں حضرت عثمانؓ نے خلیفہ ہو کر حضرت عمرؓ کی حسب وصیت صحابی سعد بن ابی وقاص کو جو عراق کے فاتح اور مؤسس کوفہ تھے گورنر مقرر کیا پھر ایک سال ہی کے بعد ان کو معزول کر کے اپنے رشتہ کے بھائی ایک نوجوان کو جن کا نام ولید بن عقبہ تھا۔ کوفہ کا گورنر مقرر کیا عرب ہمیشہ جوانوں کے مقابلہ میں سن رسیدہ اور تجربہ کار لوگوں کی حکومت کو ترجیح دیتے تھے ولید نہ صحابی تھے نہ ان میں مذکورہ دو صفتیں تھیں کوفہ کے قراء اور وہ پرانے مجاہدین جنہوں نے ابتدائی جنگوں میں نمایاں حصہ لیا تھا اور فوجی وظیفہ کی صنف اول (یعنی شرف عطا ۲۰۰۰ تا ۲۵۰۰ درہم) سے مشرف تھے اور جواب تک چوٹی کے صحابہ کو گورنر دیکھنے کے عادی رہے تھے اس تقرر سے بہت بددل ہوئے ان کی اعتدال سے بڑھی ہوئی دینی و سنی و خدماتی خودداری کو سخت ٹھیس لگی یہ بددلی اور احساس توہین برابر بڑھتا رہا حتی کہ چند سال میں اس نے صریح مخالفت کی شکل اختیار کی۔

گورنر ہونے کے کچھ دن بعد ولید نے ابن مسعود سے جو معلم دین کے ساتھ نگران خزانہ بھی تھے ایک رقم قرض لی اور میعاد ختم ہونے پر واپس نہ کر سکے، ابن مسعود نے تقاضا کیا اور غالباً سختی سے

ولید نے حضرت عثمانؓ سے شکایت کی اور انھوں نے ابن مسعود کو لکھا: تم ہمارے خزانہ کے صرف خازن ہو تم ولید کے ساتھ اس روپے کی وصولیابی میں جو انھوں نے تم سے لیا ہے کوئی سختی مت کرو ابن مسعود کی دیانتداری اس مداخلت کی تاب نہ لاسکی، انھوں نے غصہ میں آکر خزانہ کی چابیاں یہ کہتے ہوئے پھینک دیں: "میں سمجھتا تھا کہ میں مسلمانوں کا خازن ہوں، لیکن اگر جیسا کہ تم کہتے ہو میں تمہارا خازن ہوں تو مجھے ایسا خازن بننے کی ضرورت نہیں ہے، جو حاکم صحیح طرز عمل بدلتا ہے خدا اس کی خوشحالی بدل دیتا ہے اور اس سے ناراض ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں تمہارا خلیفہ بدل گیا ہے اور اس نے صحیح طرز عمل ترک کر دیا ہے یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ سعد بن ابی وقاص جیسے صحابی کو معزول کیا جائے اور ولید جیسے شخص کو گورنر بنایا جائے[1] . . . .

. . . . ولید نے حضرت عثمانؓ کو لکھا کہ ابن مسعود لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتے اور آپ پر سخت تنقید کرتے ہیں، حضرت عثمانؓ نے لکھ بھیجا کہ ابن مسعود کو مدینہ روانہ کیا جائے اور ان کو اپنا دینی حلقہ چھوڑ کر جانا پڑا۔ ان دونوں وقوعوں سے قرآنی حلقوں اور پرانے مجاہدین میں سخت اشتعال پیدا ہوا ۲۹ھ میں ولید کے خلاف ایک سازش ہوئی جس میں ماخوذ ہو کر وہ گورنری سے معزول ہوئے اب حضرت عثمانؓ نے ایک دوسرے اُموی رشتہ دار کو جو صحابی تھے نہ سن رسیدہ نہ پرانے مجاہد کوفہ کا گورنر مقرر کیا، ان کا نام سعید بن عاص تھا ولید کی طرح یہ بھی سلامت رو اور لائق حاکم تھے انھوں نے قرآء اور پرانے مجاہدین کی عزت و دلداری کی لیکن مقبول نہ ہو سکے بلکہ جلد ان کی دشمنی کا شکار ہوئے۔ مخالفت کے انگاروں کو حضرت عثمانؓ کے خلاف مدینہ، بصرہ اور مصر کی تحریکوں نیز مدینہ کے ان صحابیوں کے خفیہ اشتعالی خطوط نے بھی ہوا دی جو خود خلیفہ بننے کے مشتاق تھے اور جن کو حکومت میں کوئی منصب حاصل نہ تھا اس کے علاوہ کوفہ میں دوسرے درجہ کے مجاہدین کا ایک طبقہ جو ۱۹ھ کے بعد کی فتوحات کے زمانہ میں ابھرا تھا قوت پکڑ رہا تھا اور پرانے مجاہدین پر چھاتا جا رہا تھا، سعید نے گورنر ہو کر حضرت عثمانؓ کے مشورہ سے کچھ اپنے جاندادو

[1] انساب الاشراف بلاذری (فلسطین) ج ۵ ص ۳۰

مال سے تعلق رکھنے والے قدم اٹھائے جن سے پرانے مجاہدین کی قوت وعظمت بڑھ گئی اس اقدام کا دوسرے طبقہ پر بہت اثر پڑا اور وہ بھی حکومت اور حضرت عثمانؓ کے بدخواہوں میں ہوگیا پھر سعید کی سفارش سے[1] جب ۳۳ھ میں حضرت عثمان نے کوفہ کے دس قُراء اور پرانے مجاہدین سرغنوں کو جو حکومت الٹنے کے درپے تھے جلاوطن کیا تو سلگتی ہوئی بغاوت بھڑک اٹھی، پرانے اور نئے طبقوں کے بہت سے مجاہدین مل کر باغیانہ پروپگنڈے اور فتنہ انگیز کاموں میں لگ گئے اشتر نخعی کوفہ کے باشندہ اور صفِ اول کے قراء ومجاہدین میں تھے جن کی قیادت میں کوفہ سے ۲۰۰ آدمیوں کا ایک جتھا حضرت عثمانؓ کو برطرف یا قتل کرنے نکلا تھا ان ہی اشتر اور ان کے رفقاء نے حضرت عثمانؓ کے آخری گورنر ابو موسیٰ اشعری کو جو ایک صلح جو انسان تھے بدکلامیوں اور دھمکیوں سے قصر امارت چھوڑنے پر مجبور کیا تھا اور ان کا سارا سامان لوٹ لیا تھا ۳۶ھ ابو موسیٰ کا قصور یہ تھا کہ وہ اہل کوفہ کو مسلمانوں کی باہمی لڑائی یعنی حضرت علیؓ اور طلحہ زبیر عائشہ کی آویزش سے الگ رہنے کی تلقین کرتے تھے اور خود بھی الگ رہنا چاہتے تھے۔

غرض یہ کہ کوفہ میں فتنہ وبغاوت کا دروازہ کھل گیا اور کوفہ ہی پر کیا منحصر بصرہ، مصر اور مدینہ سے بھی اس کی لپٹیں اٹھنے لگیں، صحابی وغیر صحابی سب اس کی زد میں آگئے، فرق اتنا تھا کہ کوفہ ان سب کا منبع زد تھا، مدینہ اور مصر کی بغاوت تو حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد فرو ہوگئی لیکن بصرہ اور بالخصوص کوفہ میں یہ برابر بڑھتی اور پھیلتی رہی جیسا کہ پہلی صدی ہجری کی تاریخ سے ظاہر ہے۔ شورش وبغاوت کوفہ کی روایات میں ہوگئی۔ جنگ جمل ۳۶ھ سے فارغ ہو کر حضرت علیؓ نے کوفہ کو اپنا پایہ تخت بنایا لیکن ان کی موجودگی نے اہل کوفہ کے شرانگیز رجحانات دبانے کی بجائے ان کو اور زیادہ بھڑکایا ان کی نافرمانی نے ایک دن بھی انھیں سکھ سے نہ بیٹھنے دیا، ان کی شوریدہ سری کا داغ لے کر ۴۰ھ میں وہ رخصت ہوئے کوفہ ہی کے ایک باشندہ نے ان کو شہید کیا یہ کوفہ ہی تھا جہاں کے قراء اور عابدوں نے خارجیت کا نعرہ بلند کر کے ایک ایسا باغی فرقہ پیدا کیا جس کی بغاوت کی امن سوز چنگاریاں ۳۸ھ

---

[1] ملاحظہ ہو طبری ۳۳ھ کے تحت

سے لے کر پہلی صدی کے آخر تک برابر کوفے سے اٹھتی رہیں۔ ۵۳ھ میں حجر بن عدی اور ان کے رفقا کا فتنہ اٹھا جو ان کے قتل سے کچھ دن کے لئے دب گیا۔ معاویہ کی وفات (۶۰ھ) کے بعد حضرت حسین کو خلیفہ بنانے کی باغیانہ تحریک شد و مد کے ساتھ اٹھی اور جنگ کربلا (۶۱ھ) پر اس کا خاتمہ ہوا۔ ۶۴ھ میں توابین شیعے اٹھے اور ۶۴ھ ہی میں مختار بن ابی عبید نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے یہاں کی افتراق پرور اور باغیانہ فضا کو استعمال کر کے حکومت حاصل کی۔ ۶۶ھ میں اس کے خلاف کوفہ ہی کے لوگوں نے ایک خوفناک بغاوت کی جس کا خاتمہ جنگ سبیع پر ہوا، پھر حجاج کی گورنری کے زمانہ میں متعدد بغاوتیں ہوئیں جن میں ابن الاشعث کی بغاوت (۸۱ھ تا ۸۵ھ) سب سے نمایاں تھی۔ اس میں کوفہ کے قراء کا خاص پارٹ تھا اور اس پایہ کے محدث فقہاء اور دینی لوگ شریک تھے جیسے شعبی، سعید بن جبیر، عبدالرحمن بن ابی لیلیٰ، اور ابو البختری طائی۔

یہ اور دوسری بغاوتیں شدت سے اٹھتیں لیکن کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوتیں، اپنے پیچھے دکھ، غم اور بربادی کے سیاہ بادل چھوڑ جاتیں۔ سینکڑوں ہزاروں جانیں ضائع ہوتیں جن میں بے گناہوں کی تعداد زیادہ ہوتی۔ سینکڑوں ہزاروں عورتیں بیوہ اور بچے یتیم ہو جاتے، خانگی شیرازہ درہم برہم ہو جاتا اور وہ معایب پیدا ہوتے جو گھر کے نگراں اور کفیل کے نہ ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ مرنے والے اپنے بچوں اور عزیزوں میں عربی انتقام کا جذبہ چھوڑ جاتے جو نشو و نما پا کر ایک نئی بغاوت یا بدامنی کی صورت میں کچھ دن بعد ظاہر ہوتا، اگر کسی کو یہ موقع نہ ملتا تو کوئی دوسری مجرمانہ شکل اختیار کرتا جس کی مثالیں تاریخ و ادب میں کم نہیں ہیں۔

شریح کے منصب قضا کا درخشاں اور لائق صد آفریں پہلو یہ ہے کہ انھوں نے شورشوں، فتنوں اور بغاوتوں سے گھرے ہونے کے باوجود ان میں حصہ نہیں لیا، نہ کسی سیاسی پارٹی سے خود کو وابستہ کیا نہ جہاں تک مجھے معلوم ہے کسی جنگ میں شرکت کی باوجودیکہ اسی دور جہاد میں جنگ میں شرکت کرنا خدا کی انتہائی خوشنودی کا موجب خیال کیا جاتا تھا۔ کعب بن سور جو ۳۶ھ میں ان کے ساتھ بصرہ کے قاضی ہوئے تھے اپنی صلح جوئی کے باوجود حضرت عائشہ کے دباؤ میں آ کر جنگ جمل میں شریک ہوئے

اور مارے گئے۔ اہل مدینہ نے جن میں اکثریت صحابہ کی تھی یزید کے خلاف ۶۳ھ میں بغاوت کی اور اس روپے سے جو یزید نے ان کو عطیوں اکرام و اعزاز کے طور پر دیا تھا مسلح ہو کر لڑے اور ہزاروں کی تعداد میں حرّہ کی مشہور جنگ میں مارے گئے جب کہ ہر بڑا اور چھوٹا جنگ و فتنہ کی طرف سخت مائل تھا شریح کا اس سے پرہیز کرنا تعجب خیز نظر آتا ہے۔ یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ کیوں اس متعدی مرض سے محفوظ رہے اس کا جواب جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ان کی غیر معمولی خدا ترسی اور قرآن فہمی میں ہے، وہ صلح جو آدمی تھے اور صلح جوئی کو خدا ترسی کا لازم سمجھتے تھے۔ وہ قرآن کی آیتوں کے خاص و عام میں تمیز کرتے تھے ان کی نظر میں قرآن کی انفرادی آیتوں کی جگہ مجموعی تصور تھا وَاتَّبِعُوا اَحْسَنَ مَا اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ کا فلسفہ وہ خوب سمجھتے تھے ان کا صاف ذہن ان اسباب کا بخوبی ادراک کرتا تھا جو فتنوں اور بغاوتوں کے محرک ہوتے تھے یہ محرکات بظاہر استئشار بالمال، تعطیل حدود، عدم شوریٰ، افضلیت اہل بیت، حکومتی ظلم و جبر کی شکل اختیار کرتے لیکن ان کے ظاہر کے پیچھے ھَوٰی کارفرما ہوتی، ھَوٰی کہیں اپنے ذاتی اقتدار، ذاتی منفعت، خاندانی اقتدار، خاندانی منفعت، قبائلی اقتدار یا قبائلی منفعت کا لباس پہنتی، کہیں ذاتی مذہبی و دینی عظمت و تقدس کے اعتراف اور اس اعتراف کی معرفت سیاسی و دنیوی اقتدار کے حصول کی خواہش میں جلوہ دکھاتی کبھی یہ ھَوٰی انتقام کا روپ بھرتی - خون کا انتقام، نقصان یا بے حرمتی کا انتقام کبھی یہ محض حسد بن کر دوسرے خاندان یا افراد یا قبیلوں کے اقتدار و خوشحالی چھیننے کے درپے ہوتی۔ شریح خوب جانتے تھے کہ ھَوٰی اور اس کے مظاہر خدا ترسی کی ضد ہیں وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کا نقش ان کے دل پر ثبت تھا ان کو جَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا کے مقابلہ میں فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ، وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ اور وَالَّذِيْنَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ کے فرمودات اسلام کی اسپرٹ سے زیادہ قریب نظر آتے تھے وہ تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا کی باریکیوں سے خوب آگاہ تھے۔

اس مقدمہ کے بعد جو ان کی سیاست و حکومت سے بندھی ہوئی زندگی کے باوجود حکومت

و سیاست اور اس کے بننے بگڑنے اور اس کی زد میں آنے والے اور اس کو زد میں لانے والے، خون سے رنگنے اور رنگانے والے حوادث سے مکمل علیحدگی کی توجیہ کے لئے ضروری تھا اب ہم وہاں لوٹتے ہیں جہاں شُریح کو چھوڑا تھا یعنی حضرت علیؓ کا عہدِ خلافت

ابن ابی الحدید شارح نہج البلاغۃ نے لکھا ہے: حضرت علیؓ نے شریح کو کوفہ کی جج پر بحال رکھا حالانکہ شریح بہت سے مسئلوں میں ان سے اختلاف رکھتے تھے جو فقہ کی کتابوں میں مذکور ہیں[۱]" اصابہ میں راوی ابن السکن کا یہ قول نقل کیا گیا ہے: "شریح کے حالات حضرت عمرؓ، عثمانؓ اور علیؓ کے زمانہ میں بہت ہیں[۲]"۔ یہ فقہی مسئلے اور کثیر حالات جن کی طرف ابن ابی الحدید اور راوی ابن السکن نے اشارہ کیا ہے افسوس ہے کہ فقہ کی متداول کتابوں اور بیشِ نظر تاریخی و ادبی کتابوں میں میری نظر سے نہیں گذرے ورنہ ان کی مدد سے شریح کو بحیثیت قاضی اور فرد کے زیادہ بہتر طریقہ پر سمجھنے میں مدد ملتی۔

---

[۱] شرح نہج البلاغۃ (ایران) ج ۴ ص ۹۸ [۲] اصابہ ج ۲ ص ۴۴

العلم والعلماء

یہ جلیل القدر امامِ حدیث علامہ ابن عبدالبر کی شہرہ آفاق کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا نہایت صاف اور شگفتہ ترجمہ ہے مترجم کتاب مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی اس دور کے بے مثال ادیب اور مترجم سمجھے جاتے ہیں موصوف نے یہ ترجمہ حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کے ارشاد کی تعمیل میں کیا تھا جواب ندوۃ المصنفین سے شائع کیا گیا ہے۔ علم اور فضیلتِ علم کے بیان۔ اہل علم کی عظمت اور ان کی ذمہ داریوں کی تفصیل پر خالص محدثانہ نقطۂ نظر سے آج تک کوئی کتاب اس مرتبہ کی شائع نہیں ہوئی اس متبرک کتاب کی ایک ایک سطر سونے کے پانی سے لکھنے کے لائق ہے، ایک زبردست محدث کی کتاب اور ملیح آبادی صاحب کا ترجمہ، موعظتوں اور نصیحتوں کے اس عظیم الشان دفتر کو ایک دفعہ ضرور پڑھئے۔ صفحات ۳۰۰ بڑی تقطیع

قیمت چار روپے آٹھ آنے۔ مجلد پانچ روپے آٹھ آنے

حکیم سنائی

مترجم

جناب انعام اللہ خاں صاحب ناصر

(ایڈیٹر روزنامہ الجمعیۃ دہلی)

ایک ہفتہ کے بعد اپنے بھائیوں کی عزاداری میں مشغول ہوگیا اور ان کی نعشیں تابوتوں میں رکھ کر غزنی کو روانہ کر دیں۔ اور عہد محمود کی تمام تعمیرات کو جو دنیا میں اپنا جواب نہ رکھتی تھیں تباہ کر دیا اور جب فیروزکوہ میں پہنچا تو بھائیوں کے انتقام کے جذبے کی تسکین ہو چکی تھی۔

یہ قطعہ لکھ کر مطربوں کو دیا کہ ساز کے ساتھ گائیں اور خود عیش و نشاط میں مشغول ہوگیا۔

آنم کہ ہست فخر ز عدلم زمانہ را — آنم کہ ہست جور ز بذلم خزانہ را

میں وہ ہوں کہ میرے انصاف سے زمانہ کو فخر ہے میری بخشش خزانہ کے حق میں ستم ہے

انگشت دست خویش بدنداں کند عدو — چوں برزہ کماں نہم انگشت وانہ را

دشمن اپنی انگلیاں دانتوں سے کاٹتے ہیں جب میں کمان کھینچتا ہوں

بہرام شاہ بکینۂ من چوں کماں کشید — کندم بہ کینہ از کمر او کنانہ را

بہرام شاہ نے جب مجھ سے لڑنے کو کمان کھینچی تو میں نے اس کی کمر سے ترکش اڑا لیا

کیں توختن بتیغ در آموختم کنوں — شاہان روزگار و ملوک زمانہ را

اب میں نے شاہان روزگار کو تلوار سے انتقام لینے کا سبق دے دیا ہے

دولت چو بر کشید نشاید فرو گذاشت — قول مغنی و مے صاف مغانہ را

جب دولت حاصل ہوگئی تو مغنی کے نغمے اور شراب فروشوں کی صاف شراب کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔

بہرام شاہ کی وفات کے متعلق اختلاف ہے حمد اللہ مستوفی تاریخ گذیدہ میں لکھتا ہے کہ بہرام شاہ

جہاں سوز کے پہنچنے سے پہلے ۵۴۸ھ میں وفات پا چکا تھا۔ ابن اثیر لکھتا ہے کہ بہرام شاہ نے مقابلہ غوری کی تاب نہ لاکر راہِ فرار اختیار کی اور ۵۴۸ھ میں وفات پائی اس کے نزدیک غزنی کا قتلِ عام ۵۵۰ھ میں واقع ہوا۔ فرشتے نے بھی لکھا ہے کہ بہرام شاہ نے ۵۴۷ھ میں وفات پائی۔

سنائی کے معاصر شعرا | مختاری غزنوی۔ سنائی کے معاصر شعرا میں سے ایک مختاری ہے اس کا نام سراج الدین محمد عثمان ابن محمد تھا۔ آذر آتش کدہ میں اور ہدایت مجمع الفصحا میں رقم طراز ہے کہ مختاری پہلے عثمان تخلص کرتا تھا اس کا مولد اور وطن غزنی تھا۔ ایک قول کے مطابق ۵۴۴ھ اور دوسرے قول کے مطابق ۵۵۴ھ میں وفات پائی۔ مؤلف تذکرہ حسینی لکھتے ہیں کہ مختاری حکیم سنائی کا استاد تھا لیکن یہ درست نہیں اس وجہ سے کہ سنائی نے اپنے اشعار میں مختاری کی مدح کرتے ہوئے اس کو جوان بتایا ہے اور اپنے کو شعر میں اس کا نظیر سمجھا ہے البتہ مختاری اور سنائی کے درمیان رابطہ مؤدت موجود تھا اور ایک دوسرے کی تعریف کرتا تھا۔

ہدایت کا بیان ہے کہ مختاری کے اشعار کی تعداد ۶ ہزار کے قریب ہے۔ قصائد کے علاوہ مختاری نے شہریار نامہ کے نام سے ایک مثنوی بھی لکھی تھی صاحب آثر الکرام نے اس سے گیارہ اشعار اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں۔ اس مثنوی میں شہریار بن برزوہ پسر سہراب کے حالات بیان کئے گئے ہیں مختاری نے تین سال کی محنت میں اس مثنوی کو سلطان مسعود بن ابراہیم غزنوی کے نام پر تالیف کیا۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

سنائی نے ۳۰ اشعار کے ایک قصیدہ میں مختاری کی تعریف کی ہے

آنچہ فکرت ہمی از عقل تو یابد گہ نظم — بہ ہمہ عمر نیابد صدف از ابر مطیر

شعر کہتے وقت تیرا فکر جو کچھ تیری عقل سے حاصل کرتا ہے وہ صدف برسنے والے بادل سے عمر بھر حاصل نہیں کر سکتی

دہر در شعر نظیرم نداشنست ولیک — چوں ترا دید در ایں شغل مرا دید نظیر

فن شعر میں میری نظیر نہ تھی لیکن زمانہ نے جب تجھے شعر کہتے دیکھا تو میری نظیر دیکھ لی

سید حسن غزنوی | سنائی کے معاصر شعرا میں سے ایک سید اشرف الدین حسن بن محمد ناصر حسینی ہے

سید حسن غزنی کے ایک مشہور خاندان کا چشم و چراغ اور اس کشور کے مشہور شعرا میں سے تھا اس نے شاہان غزنوی کی مدح میں بھی قصائد لکھے اور سلجوقیوں کی تعریف بھی کی اس کا سال وفات معلوم نہیں ہے بہرحال اس نے غزنی پر غوریوں کا تسلط دیکھا تھا

مؤلف آتش کدہ و مجمع الفصحاء رقمطراز ہیں کہ سید کے ساتھ عوام کو بے حد ارادت تھی بہرام شاہ اس سے خوف زدہ ہو گیا اور ایک غلام کو دو تلواریں دے کر اس کے پاس بھیجا سید حسن مرد سخن فہم تھا سلطان کا مطلب سمجھ گیا اور غزنی سے جلد بعزم حج چلا گیا، حج سے واپس آنے کے بعد جوین کے قریب وفات پائی اس کی نعش غزنی میں دفن کی گئی۔ سال وفات ۵۶۵ھ تھا سید حسن کا مزار غزنی کے باہر عام سڑک کے قریب واقع ہے اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ شہید کے عہد میں اس کے گنبد کی مرمت کرائی گئی سید اپنے زمانہ کے مقتدر شعرا میں تھا اور حکیم سنائی سے اس کی خط و کتابت تھی سید حسن نے اپنے ایک قصیدہ میں اظہار مباہات کیا ہے۔ یہ قصیدہ فارسی کے مشہور قصائد میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کا مطلع یہ ہے۔

داند جہاں کہ قرۃ عین پیمبرم ۔۔۔ شاسید میوۂ دل زہرا و حیدرم

دنیا جانتی ہے کہ میں پیغمبر کا نور چشم ہوں اور زہرا اور حیدر کے دل کا خوبصورت میوہ ہوں

سنائی کارنامہ بلخ میں سید حسن کی تعریف کرتے ہیں

شاخ دیگر جمال دین حسنی ۔۔۔ آں چو نام خود از نکو سخنی

سید خوب روی و پاکیزہ ۔۔۔ سخنش ہم چو غیب دوشیزہ

قوت نظم و نثرش از نسب است ۔۔۔ زانکہ از شاخ افصح العرب است

محمد بن ناصر علوی غزنوی | سنائی کے معاصر شعراء میں سے ایک محمد بن ناصر علوی ہے۔ عوفی اس کو السید الاجل جمال الدین اکمل الشعراء محمد ابن ناصر علوی لکھتا ہے اور اس کو سید حسن غزنوی کا بڑا بھائی بتاتا ہے مولف مجمع الفصحاء رقم طراز ہے کہ محمد بن ناصر دربار بہرام شاہ میں بڑی عزت رکھتا تھا۔ حکیم سنائی نے کارنامہ بلخ میں اس کو "دُرے از بحر مواج توحید و در شاخ ز باغ تائید" لکھا ہے۔ فرماتے ہیں

شرف الدین محمد ناصر — عقل از و کند و وہم از و قاصر
فکرتش مایۂ یمانی ذکر — خاطرش قبلۂ معانی ذکر
دُرے از موج بحر توحید است — شاخ از نخل باغ تائید است
خط او اصل ظلمت نور است — شعر او عقد گردن حور است

حکیم سنائی نے ایک قصیدہ لکھا ہے جس کا قافیہ سکندر اور گوہر اور ردیف آتش و آب ہے اس میں بھی محمد بن ناصر علوی کی تعریف کرتے ہیں

سر محامد سید محمد آنکہ شدہ است — بلند ہمت و نطقش بگوہر آتش و آب
میان طبع تو در طبع ما است در نظم — کنایت است دراں شعر داور آتش و آب

اس قصیدہ میں حکیم صاحب اپنے ممدوح کی روانیِ طبع اور جولانیِ فکر کی تعریف کے ساتھ اس کے بذل و بخشش اور لطف و عدل کی مدح بھی کرتے ہیں۔

عمادی شہریاری | سنائی کے معاصر شعرا میں سے ایک عمادی شہریاری ہے اس کے متعلق تذکرہ نگاروں میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ عماد الدین غزنوی اور عمادی شہریاری دونوں ایک ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ عماد الدین غزنوی ایک اور شاعر تھا بعض کے نزدیک عمادی کا مولد غزنی ہے اور یہ بخارا کا فرزند تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ موضع شہریاری کا باشندہ تھا بہر حال عمادی نے سیف الدین عماد الدولہ فرامرز شہریار مازندراں اور سلطان طغرل ابن محمد سلجوقی معروف بہ طغرل دوم کی مدح کی ہے اور عراق میں اس کے ساتھ رہتا تھا شعرا میں سے انوری اور حسن غزنوی کی تعریف کی ہے عمادی حکیم سنائی سے نسبتِ شاگردی رکھتا تھا اور ان کے ارادتمندوں میں شمار کیا جاتا تھا۔

تقی الدین رقمطراز ہے کہ عمادی مدتوں بلخ میں مقیم رہا اور حکیم سنائی سے تصوف حاصل کیا عمادی کا سالِ وفات صحیح طور سے معلوم نہیں ہو سکا تقی الدین اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے کہ ۵۳۰ھ میں وفات پائی۔ عمادی معانی کی نزاکت اور الفاظ کی سلاست کے اعتبار سے اپنے عہد کے مشہور شعرا میں شمار ہوتا تھا اور اکثر جلیل القدر شعرا نے اس کے کلام کی حلاوت کا اعتراف کیا ہے۔ عمادی

یہ حال و کمال سنائی نے حاصل ہوا اس کے اشعار کی تعداد ۶ ہزار کے قریب ہے۔

ابو حنیفہ اسکانی غزنوی | ابو حنیفہ اسکانی غزنی کا باشندہ تھا ۴۵۱ھ میں شاعری شروع کی اس وقت سلطان ابراہیم بن مسعود بن محمود غزنوی تخت سلطنت پر متمکن تھا۔ ابوالفضل بیہقی نے اپنی تاریخ میں اس کی تعریف کی ہے اور متعدد مقامات میں اس کی دانش و حکمت کا ذکر کیا ہے بیہقی لکھتا ہے کہ ابوحنیفہ اس زمانہ کے مقتدر شعرا میں ہے۔ اور لوگوں کو علم و ادب کا درس دیتا ہے بیہقی نے ابو حنیفہ کے چار قصائد اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں جیسا کہ اسکانی کے قصائد سے معلوم ہوتا ہے ۴۵۱ھ کے قریب وہ جوان تھا چنانچہ کہتا ہے

ازانکہ ہستم از غزنی و جوانم نیز   ہمی نہ بینم مر علم خویش را بازار

ابو حنیفہ کی تاریخ وفات یقین کے ساتھ معلوم نہیں ہو سکی بہر حال یہ بات یقینی ہے کہ اس نے سلطان مسعود بن ابراہیم کا عہد دیکھا اس لئے کہ سنائی نے کارنامہ بلخ میں اس کی تعریف کی ہے اور کارنامہ مسعود بن ابراہیم کے عہد میں لکھا گیا ہے اور سلطان مسعود نے بقول ابن اثیر شوال ۵۰۸ھ میں اور بقول منہاج سراج ۵۰۹ھ میں وفات پائی

سنائی کارنامہ بلخ میں ابو حنیفہ کا ذکر کرتے ہوئے اس کو چاکر سید الشعرا کہتے ہیں ممکن ہے سید الشعرا سے سید حسن یا اس کا بھائی سید محمد مراد ہو لیکن سنائی نے کارنامہ بلخ میں اسکانی کا ذکر تعریف کے ساتھ نہیں کیا، لکھتے ہیں

ازپس بو حنیفہ اسکانی   کہ بر اشراف دارد اسرانی

چاکر صدر سید الشعرا   کہ بر آں چاکرسیت خانہ ما

نیک مرد ست لیک بدخوی است   از بروں زر : از اندروں روسیت

سوزنی سمرقندی | سنائی کے معاصر شعرا میں ایک سوزنی سمرقندی ہے اس کا نام محمد تھا۔ رباب کا نام ایک قول کے مطابق علی اور دوسرے قول کے مطابق مسعود تھا سوزنی سمرقندی اپنے عہد کے مشہور شعرا میں شمار ہوتا ہے سوزنی اوائل میں ہزل اور ہجو لکھا کرتا تھا لیکن آخر میں اس سے تائب ہو گیا

صاحب مجمع الفصحا رقم طراز ہے کہ آخر میں حضرت حکیم سنائی سے بیعت کر کے تائب ہو گیا۔ مولف سخن دسخنوراں قول ہدایت کی تردید کرتے ہوئے رقم طراز ہے کہ اگر یہ دعویٰ صحیح ہوتا تو سوزنی کے کلام میں کم ازکم اشارتاً اس کا کچھ ذکر پایا جاتا حالانکہ ہجویات میں حکیم سنائی کا نام کہیں کہیں نظر آتا ہے۔

سوزنی نے بروایت تقی الدین ۵۶۹ھ میں اور بقول دولت شاہ ۵۶۲ھ میں وفات پائی۔

عبدالواسع جبلی غرشتانی | سنائی کے معاصر شعرا میں ایک عبدالواسع جبلی ہے بعض اس کو بدایع الزماں بھی کہتے ہیں۔ غرشتان اس ولایت کا نام ہے جو مغرب میں ہرات، مشرق میں غور، جنوب میں غزنی اور شمال میں مرو سے محدود ہے۔ حال کے ہزارہ جات میں اس وقت کے غرشتان کے مرکزی حصے شامل ہیں۔

یاقوت معجم البلدان میں رقم طراز ہے کہ غرشتان ایک وسیع علاقہ ہے اس میں بہت بستیاں واقع ہیں۔ غرشتان کا بادشاہ بشیر میں رہتا ہے۔ یاقوت بحوالہ اصطخری رقم طراز ہے کہ غرشتان میں دو بڑے شہر ہیں ایک کا نام بشیر ہے دوسرے کو سور میں کہتے ہیں یہ دونوں شہر متصل واقع ہیں اور پایۂ تخت ایک اور مقام میں ہے جس کا نام بلیکان ہے۔

شاربائے غرشتان سے بادشاہوں کا وہ سلسلہ مراد ہے جس نے ولایت غرشتان میں حکمرانی کی اہل تاریخ ان کو شار کہتے ہیں۔

تاریخ یمینی میں مذکور ہے کہ شاربائے غرشتان کی اقامت گاہ شہر افشین میں تھی محمود غزنوی نے شاربائے غرشتان کے سلسلہ کو توڑ دیا۔ شاربانے غرشتان میں ابو نصر معروف ہے جو ۴۰۶ھ تک بقید حیات تھا آخر عمر میں مسند شاری پر اپنے فرزند کو بٹھا کر خود فرماں روائی سے کنارہ کیا اور علم معرفت کے حصول میں مصروف ہو گیا۔ ابو نصر کے فرزند نے ہندوستان کے ایک غزوہ میں سلطان محمود کو مدد دینے سے انکار کر دیا۔ سلطان نے اس کو شاری سے برطرف کر دیا اور اس خاندان کی امارت کا سلسلہ منقطع ہو گیا ابو نصر کو ہرات میں نظر بند کر دیا گیا جہاں اس نے ۴۰۶ھ میں وفات پائی۔ چونکہ عبدالواسع جبلی نے غرشتان کے بلند کوہستان میں پرورش پائی تھی اس لئے جبلی تخلص کیا۔ عبدالواسع صنائع لفظی

کا امام سمجھا جاتا ہے جبلی نے خاندان غزنوی میں بہرام شاہ اور سلجوقی میں سنجر کی مدح کی مورخین نے اس کا سال وفات ۵۵۴ھ لکھا ہے

ادیب صابر | سنائی کے معاصر شعرا میں ایک شہاب الدین ادیب صابر بن ادیب اسمٰعیل ترمذی ہے ادیب صابر کا وطن ترمذ ہے بلخ اور خوارزم میں بھی سکونت اختیار کی ہے سلطان سنجر کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں بعض کہتے ہیں کہ سنجر نے اس کو اپنا بھائی بنا لیا تھا۔ ۵۴۶ھ میں وفات پائی۔ بیان کرتے ہیں کہ سنجر نے ادیب کو اتسز کے پاس مخبری کے لئے بھیجا تھا اس اثنا میں اتسز نے دو اشخاص کو پوشیدہ طور سے مرد بھیجا تھا کہ سنجر کو قتل کر دیں۔ ادیب نے یہ تمام حال سنجر کو لکھ دیا سنجر نے اتسز کے فرستادہ اشخاص کو گرفتار کر کے قتل کر دیا اتسز کو یہ واقعہ معلوم ہوا تو اس نے ان دو اشخاص کے انتقام میں ادیب کو پکڑ کر جیحوں میں غرق کر دیا۔

شاہ ابو رجائی غزنوی | حکیم سنائی کے معاصر شعرا میں ایک شاہ ابو رجائی غزنوی ہے محمد عوفی صاحب لباب الالباب اس کو جلیل القدر شعرا میں شمار کرتا ہے۔ شاہ ابو رجائی بہرام شاہ کا مداح تھا ۵۹۷ھ میں بقید حیات تھا غوریوں کا زمانہ بھی دیکھا۔

معزی | سنائی کے عہد میں دو اشخاص نے معزی کے تخلص سے شعر کہے تھے ایک معزی غزنوی اس کا نام سدید الدین تھا اور سراج الدولہ خسرو ملک کی مداحی کرتا تھا۔ محمد عوفی اس کی حلاوت طبع اور بلندی شعر کا معترف ہے اور اس کے دیوان کو رشک ارتنگ مانی قرار دیتا ہے۔ اس کے سوا اس معزی کے حالات کی تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔

دوسرا امیر معزی جس کا نام اور لقب بقول محمد عوفی عبد اللہ محمد بن عبد الملک برہانی تھا ہماری مراد یہاں اسی امیر معزی سے ہے۔ بعض نے اس کا مولد نیشاپور بتایا ہے اور بعض نے سمرقند۔ امیر معزی اپنے عہد کے مقتدر شعرا اور ائمہ ادب میں شمار کیا جاتا تھا امیر معزی نے بہرام شاہ کی مدح کی ہے اور خوارزمیوں اور سلجوقیوں کی تعریف میں بھی قصائد لکھے ہیں شاعری میں دربار محمودی کے ملک الشعراء عنصری بلخی کی پیروی کی ہے معزی کی وفات بقول اصح ۵۴۲ھ میں ہوئی اکثر روایات سے معلوم

ہوتا ہے کہ امیر معزی سنجر کی شکاری کمان کے تیر سے مجروح ہو گیا تھا دو سال تک زخم کا علاج کرتا رہا۔ علاج سے زخم بھر ملا تھا لیکن چند روز بعد پھر بگڑ گیا اور یہی اس کی موت کا سبب تھا سنائی اور معزی کے درمیان دوستانہ روابط تھے سنائی نے معزی کی وفات کے بعد مرثیہ لکھا۔

مسعود سعد سلمان | سنائی کے معاصر شعرا میں ایک مسعود بن سعد بن سلمان ہے اس کا مولد لاہور ہے مسعود ان شعرائے نامور و مقتدر میں سے ہے جن کی تربیت غزنی کے معارف پرور سلاطین کے سایہ میں ہوئی۔ مسعود شعر و شاعری میں درجۂ استادی کو پہنچا اس نے سلاطین غزنوی میں سے پانچ بادشاہوں کی مدح کی جن کے نام یہ ہیں سلطان ابراہیم بن مسعود۔ سلطان مسعود بن ابراہیم شیرزاد بن مسعود۔ ابوالملوک ارسلان بن مسعود۔ بہرام شاہ ان بادشاہوں کے علاوہ مسعود نے سیف الدولہ ابوالقاسم محمود بن ابراہیم کی بھی مدح کی ہے اور اس کا اکثر مدحیہ کلام اسی شاہزادہ کی تعریف میں ہے لیکن افسوس ہے کہ اس شاعر کی عمر کا بڑا حصہ قید و بند میں گذرا قید خانہ کی فصیل نے مسعود کے دفتر شاعری کو طومار ماتم بنا دیا اس کی عمر کے پندرہ سال قید خانہ کے تنگ و تاریک گوشہ میں بسر ہوئے۔ دس سال قلعہ سو، دھک میں تین سال حصار نائے میں اور آٹھ یا ۹ سال حصار مرنج میں مقید رہا۔

تفصیل اس واقعہ کی یہ ہے کہ سیف الدولہ اپنے باپ کی طرف سے حکومت ہند پر مامور کیا گیا تھا مسعود سعد سلمان بھی اس کے ملازمان خاص میں شامل ہو گیا ۸۰ھ میں سلطان ابراہیم نے بدگمان ہو کر اپنے فرزند کو اس کے ندیموں سمیت گرفتار کر کے نظر بند کر دیا ان ہی ندیموں میں مسعود سعد سلمان بھی شامل تھا آخر کار سلطان ابراہیم کے ایک ندیم ابوالقاسم نے سفارش کر کے مسعود کو قید خانہ سے رہا کرایا اس اثنا میں سلطان ابراہیم نے وفات پائی۔ سلطان مسعود نے تخت سلطنت پر جلوس فرمایا۔ ہندوستان کی حکومت اپنے فرزند امین اللہ شیرزاد کو تفویض کی ابونصر عبداللہ فارسی کو اس کی پیش کاری اور ہندوستان کی سپہ سالاری پر مقرر کیا ابونصر اور مسعود سعد سلمان کے درمیان دیرینہ محبت تھی۔ اس نے مسعود کو حکومت جالندھر پر مقرر کر دیا لیکن چند

ہی روز بعد ابو نصر معتوب ہو گیا اور مسعود کو پھر آٹھ یا نو سال تک حصار مرنج کے زنداں میں رہنا پڑا۔

لیکن یہ امر موجب تعجب ہے کہ قید خانہ کی روح فرسا تکلیفوں نے مسعود کی شاعری کی روح کو فنا اور اس کے جذبۂ حریت کو مغلوب نہیں کیا بلکہ اس کے اشعار میں جان ڈال دی اور اس کے نالوں کو زیادہ دل گداز اور سوزناک بنا دیا۔ حکیم سنائی کو مسعود سعد سلمان سے دلی محبت تھی۔ اس کے دیوان کو جمع کیا اور اس طرح شاعر نامور کی بڑی مدد کی۔ گویا مسعود کے یتیم بچوں کو دربدر پریشان ہونے سے بچا لیا، کہتے ہیں کہ جب سنائی نے مسعود کے دیوان کو جمع کیا تو سہواً دوسرے شعرا کا بھی کچھ کلام اس میں درج ہو گیا۔

ثقۃ الملک طاہر بن علی نے سنائی کو اس سہو سے آگاہ کیا تو حکیم نے معذرت کے طور پر ایک طویل قطعہ لکھ کر مسعود سعد کو بھیجا جس میں لکھا کہ مجھے کیا معلوم تھا کہ شاعروں نے تیرے نام سے شہرت کے لئے اپنے اشعار منسوب کر دیتے ہیں۔

حکیم سنائی کی وفات | حکیم سنائی کے سال وفات میں تذکرہ نویسوں کے درمیان اختلاف ہے۔ جامی نے نفحات میں سنائی کا سال وفات ۵۲۵ھ تحریر کیا ہے، دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرہ اور شمس الدین نے قاموس الاعلام میں ۵۷۶ھ لکھا ہے۔ صاحب مجمع الفصحا ۵۹۰ھ بتاتے ہیں۔ مولف سفینۃ الاولیا دارا شکوہ و مولف خزینۃ الاصفیا ۵۲۵ھ قرار دیتے ہیں مولف ریاض العارفین کے نزدیک سنائی کا سال وفات ۵۴۶ھ ہے حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں ۵۲۹ھ لکھا ہے امین احمد رازی کی تحقیق ہے کہ سنائی نے بقول اصح ۵۲۵ھ میں جہانِ فانی سے رحلت کی۔ حمد اللہ مستوفیٰ رقم طراز ہے کہ حکیم سنائی زمان سلطنت بہرام شاہ (۵۱۱ھ۔ ۵۴۵ھ) تک بقید حیات تھے۔ مؤلف تاریخ فرشتہ لکھتا ہے کہ سنائی بہرام شاہ کے معاصر تھے اور کتاب حدیقہ انھوں نے ۵۲۹ھ میں تمام کی تقی الدین کاشی نے سنائی کا سال وفات ۵۴۵ھ ٹھہرایا ہے۔

ہمارے زمانہ کے مورخین نے تحقیق کے بعد اس امر پر اتفاق کیا ہے کہ حکیم سنائی نے ۵۴۵ھ میں وفات پائی۔ حکیم سنائی کی لوح مزار پر سال وفات ۵۲۵ھ کندہ ہے، حقیقت یہ ہے کہ سنائی

نے ۵۲۰ھ سے پہلے رحلت نہیں کی تھی۔ انھوں نے اپنی کتاب طریق التحقیق ۵۲۸ھ میں مکمل کی ہے چنانچہ اس کتاب کے آخر میں لکھتے ہیں

پانصد و بست و ہشت آخر سال   بود کیں نظم آخر یافت کمال

۵۳۰ھ تک سنائی کا بقید حیات ہونا اس سے بھی ثابت ہے کہ انھوں نے امیر معزی کا مرثیہ لکھا اور تمام تاریخ نویس اس امر پر متفق ہیں کہ امیر معزی نے ۵۴۵ھ میں وفات پائی۔ اس سے ثابت ہو گیا کہ حکیم سنائی ۵۴۲ھ تک زندہ تھے، دولت شاہ سمرقندی حکیم کی وفات ۵۴۶ھ میں بتاتا ہے لیکن اسے غلط فہمی ہوئی ہے اس لئے کہ سنائی ۵۴۶ھ تک بقید حیات تھے تو غزنی کے قتل عام سے محفوظ نہ رہتے اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ علاء الدین جہاں سوزان کا احترام کرتا تھا تو کم از کم ان کے کلام میں عزیز وطن کی اس بربادی اور اپنے محبوب مولد کی تباہی کے متعلق ضرور کوئی ذکر موجود ہوتا اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ سنائی ۵۴۶ھ میں بقید حیات نہ تھے تو مؤلف مجمع الفصحا کا یہ قول صحت سے بہت بعید ہے کہ سنائی نے ۵۵۰ھ میں وفات پائی۔

اب رہا لوح مزار کا مسئلہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جب دارا شکوہ غزنی آیا تو اسی لوح مزار کو دیکھ کر سنائی کا سال وفات معلوم کیا اور صاحب خزینۃ الاولیاء نے اس کو صحیح سمجھ کر اپنے تذکرہ میں درج کر دیا لیکن افسوس یہ سنگ مزار سنائی کے سال وفات کا عقدہ حل نہیں کرتا۔ اس وجہ سے یہ پتھر حکیم صاحب کی وفات کے ایک مدت بعد نصب کیا گیا ہے۔

میں کئی بار اس مزار کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں اور سنگ مزار کو بنور دیکھا ہے یہ پتھر دو ٹکڑوں سے مرکب ہے۔ چھوٹا ٹکڑا عمودی صورت میں قبر پر نصب ہے، اس کے نقش و نگار اور رسم الخط ان الواح سے ملتے جلتے ہیں جو سنائی کے زمانہ میں لکھی گئیں لیکن اس ٹکڑے پر سنائی کا سال وفات کندہ نہیں صرف یہ لکھا ہوا ہے

"ھذا قبر الفقیر الی رحمۃ اللہ مجدود ا سنائی غفر اللہ لہ"

دوسرے پتھر پر جو قبر پر بچھا ہوا ہے سنائی کا سال وفات کندہ ہے اس کی وضع قطع سے

معلوم ہوتا ہے کہ سنائی کی وفات کے مدتوں بعد نصب کیا گیا ہے۔ اس کا اعتبار نہیں کیا جا سکتا
اول اس وجہ سے اس کا رسم الخط اس عہد کی الواحِ مزارات سے بالکل مختلف ہے، دوسرے
اس وجہ سے کہ اس کا رسم الخط ہمارے زمانہ کے رسم الخط سے ملتا جلتا ہے تیسرے یہ کہ اس پتھر
پر گلستان سعدی کا مشہور شعر بلغ العلیٰ بکمالہ کندہ ہے سعدی اور سنائی کے عہد کے درمیان ۱۴۶
سال کا فرق ہے یعنی سعدی نے سنائی سے ۱۴۶ سال بعد وفات پائی۔ ہمارے زمانہ کے مورخین
متفق ہیں کہ سنائی نے ۵۲۵ھ میں وفات پائی ممکن ہے یہ قیاس صحیح ہو لیکن ایک بات شبہ
پیدا کرتی ہے اور وہ یہ کہ اگر سنائی ۵۴۵ھ تک بقیدِ حیات ہوتے تو کرمان میں بہرام شاہ کی شکست،
غزنی میں سیف الدولہ غوری کی تخت نشینی (۵۴۳ھ) بہرام شاہ کا حملہ اور سیف الدولہ کا قتل ان
واقعات کا ضرور کچھ ذکر کرتے۔ بہرام شاہ سنائی کا ممدوح تھا اور اس حد تک حکیم صاحب کا
احترام کرتا تھا کہ حکیم صاحب نے اپنے شاہکار حدیقۃ الحقیقت کو اس کے نام سے تالیف کیا۔

سنائی کا مزار حکیم سنائی کا مزار غزنی کے گوشۂ شمال مغربی میں اس سڑک کے قریب واقع ہے جو غزنی
سے کابل جاتی ہے، لوگ نزدیک و دور سے اس کی زیارت کے لئے آتے رہتے ہیں زائرین
کی کثرت کی وجہ سے کافی چہل پہل رہتی ہے ملت افغان کے نزدیک غزنی وہ سرزمین ہے
جس کے خاک کے ذروں میں اسلاف کی شوکت و عظمت خوابیدہ ہے۔ اس کی نگاہ میں
سلطان کا روضہ شجاعت اور طاقت کی یادگار اور سنائی کا مزار انوارِ روحانی و عرفانی کا مہبط ہے

نئے مزار کی تعمیر مزار سنائی پر جو عمارت پیشتر بنی ہوئی تھی معلوم نہیں کس نے اور کب بنائی تھی بہر حال
بلحاظ طرز تعمیر چنداں قدیم نہ تھی۔ اعلیٰ حضرت امیر حبیب اللہ خاں شہید کے عہد میں اس کی ترمیم
کی گئی لیکن مرمت سے بس قدیم عمارت کی پائداری میں کچھ اضافہ ہوا حقیقت یہ ہے وہ عمارت
حکیم سنائی کی جلالتِ قدر کے شایاں نہ تھی اس عصر فرخند میں جب مملکت افغانستان
کے اندر نہضت ادبی کا دور شروع ہوا تو اعلیٰ حضرت شہریار جوان المتوکل علی اللہ محمد ظاہر شاہ ادام
اللہ شوکتہ نے مزار سنائی پر نئی عمارت بنانے کا حکم صادر کیا تاکہ یہ تاریخی مقام اس عہد درخشاں

میں ازسرِنو عظمت حاصل کرے۔

کلامِ سنائی حکیم سنائی کا منظوم کلام دو حصوں میں منقسم ہے حصہ اول مثنویات پر مشتمل ہے حصہ دوم قصائد، غزلیات اور رباعیات پر مثنویات میں مندرجہ کتابیں شامل ہیں۔

(۱) حدیقۃ الحقیقت (۲) سیر العباد (۳) طریق التحقیق (۴) عقل نامہ (۵) عشق نامہ (۶) کارنامہ بلخ (۷) بہرام و بہروز

حدیقۃ الحقیقت جس کو فخری اور الٰہی نامہ بھی کہتے ہیں حکیم سنائی کا ادبی شاہکار ہے اس میں حکم و معارف کے خزانے بھر دیئے ہیں ان الفاظ میں حدیقہ کا تعارف کراتے ہیں۔

ہر یکے بیت از دو جہانِ علم ہر یکے سطر آسمانِ علم

اس کی ہر ایک بیت علم کا جہان ہے اور ہر ایک سطر علم کا آسمان

سنائی نے اس کی تصنیف پر اپنی تمام قدرت کلام صرف کر دی۔ اور فصاحت لفظ و بلاغت معنی میں حدیقہ کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ فضلا کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اس سے بہتر کتاب موجود نہیں

فضلا متفق شدند بر ایں کہ کتابے گزیدہ نیست جز ایں

فضلا اس بات پر متفق ہو گئے کہ اس سے بہتر کتاب موجود نہیں

علما حدیقہ سنائی کو علم الٰہی اور حکم و معارف میں ترجمہ قرآن کہتے ہیں سنائی حدیقہ کا تعارف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس کتاب کے اندر اسرارِ زندگانی اور سعادت معاش و معادِ انسانی جمع کر دئے گئے ہیں اور یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ تصوف اور عرفان میں اس سے پر مغز اور بہتر کتاب نہ پیشتر رشتہ نظم میں آئی نہ اس کے بعد آئے گی۔

شیخ علی بخش بیمار

از

(جناب عابد رضا خاں صاحب بیدار)

(ادارہ ادبیات اردو رام پور کے یوم بیمار میں بیمار کی صد سالہ برسی کے موقع پر پڑھا گیا)

بیمار کا اصل وطن آنولہ ضلع بریلی تھا۔ ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے نساخ نے غلطی سے بیمار کا نام الٰہی بخش لکھا ہے۔ صحیح نام علی بخش ہے والد کا نام شیخ غلام علی۔ معلوم ہوتا ہے شروع ہی سے ایک جگہ قیام نہیں رہا صاحب بزم سخن نے اسی وجہ سے انھیں "از مشاہیر سخنوران سنبھل" کہہ کر یاد کیا ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے بیمار کو مصحفی کا شاگرد بتایا ہے سب سے پہلے یہ بات امیر مینائی نے ۱۲۹۰ھ میں کہی۔ مصحفی نے اپنا آخری تذکرہ ریاض الفصحا ۱۲۳۶ھ میں ختم کیا۔ اس میں کہیں بیمار کا ذکر نہیں آیا۔ مصحفی کا انتقال ۱۲۴۰ھ میں ہوا اس وقت بیمار کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور تذکرہ لکھتے وقت ۳۲ برس۔ تعجب ہے کہ اتنی عمر کا ایک شاگرد اور مصحفی جیسا استاد اسے اپنے تذکرہ میں جگہ نہ دے بیمار نے خود بھی کہیں اس کا اقرار نہیں کیا۔ مولانا حسرت موہانی نے بھی سلسلۂ مصحفی میں بیمار کا نام نہیں لیا۔ نساخ نے "سخن شعرا" امیر مینائی کے تذکرے انتخاب یادگار (۱۲۹۰ھ) سے پہلے لکھا۔ اس میں صرف احمد خاں غفلت رام پوری کی شاگردی کا حوالہ ہے۔ امیر مینائی پر ہمارا شبہ کرنا بے جا ہوگا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مصحفی امیر مینائی کے استاد اسیرؔ، کے استاد تھے۔ اور اس سے زیادہ کھلی ہوئی حقیقت یہ ہے کہ امیر مینائی اور اسیر نے ہی جب نواب کلب علی خاں صاحب کے حکم سے مصحفی کے دواوین کی اشاعت کا انتظام کیا تو مصحفی کے کلام میں ہر ممکن اصلاح دی گئی جس سے اس کے شعر کا مرتبہ بڑھ جائے محض لفظی ترمیم نہیں پورے پورے مصرعوں میں حیرت انگیز تبدیلی کردی گئی۔ ادبی دنیا مولانا عبدالسلام خاں کی ممنون ہے کہ انھوں نے اس جعل سازی کا پتہ لگالیا۔

رام پور آنے سے پہلے ہمیں بیمار کا کچھ حال معلوم نہیں۔ رام پور میں یہ نواب محمد سعید خاں کے زمانے میں آئے اور احمد خاں غفلت کی شاگردی اختیار کی۔ یہ تذکرہ نویسوں کا بیان ہے۔ غفلت نے رام پور سے باہر مشاعروں میں شرکت کی۔ مصحفی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ وہ مجھ سے لکھنؤ میں ملاقات کے لئے آئے اور یہاں کے مشاعروں میں بھی شریک ہوتے۔ ممکن ہے بیمار اور غفلت میں استادی شاگردی کا رشتہ رام پور آنے سے پہلے ہی استوار ہو گیا ہو۔ غفلت کا انتقال رام پور ہی میں ۱۲۵۹ھ میں ہوا اور نواب محمد سعید خاں ۱۲۵۶ھ میں تخت نشین ہوئے۔ رام پور میں ان کا ورود ۱۲۵۶ھ اور ۱۲۵۹ھ کے درمیان ہوا۔ ۱۲۷۱ھ میں ربیع الاول کی ۲۴ تاریخ بیمار کا انتقال ہو گیا اس طرح ان کی زندگی کے آخری ۱۴، ۱۵ سال رام پور میں گذرے۔

احمد خاں غفلت، قدرت اللہ شوق کے شاگرد تھے۔ شاعر تو وہ بہت کم تھے لیکن شاعر سے کہیں زیادہ استاد تھے رام پور میں ان کا وہی درجہ تھا جو لکھنؤ میں اس زمانے میں ناسخ کا تھا۔ یہ دونوں استاد ہم عصر اور ہم عمر تھے۔ غفلت قصیدہ اور مثنوی تو خوب کہتے تھے اس کی مصحفی نے بھی تعریف کی ہے لیکن غزل گوئی ان کے بس کی نہ تھی۔ غفلت کا رنگ ناسخ کا کچھ ترقی یافتہ رنگ کہا جا سکتا ہے بعض بعض جگہ آتش کا رنگ بھی آجاتا ہے۔ ان کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔

جوں شمع اٹھ گلی سے تری میں جدھر چلا — شعلہ بغرق، داغ بدل چشم تر چلا
لو ہو کے چند قطرے پھر آنکھوں میں آگئے — سمجھا تھا میں کہ زخم مرے دل کا بھر چلا
جو خون تھا سو اشک بہائے گیا عبث — جراح تو نہ رگ پہ مری نیشتر چلا
مجنوں میں جلد چلنے کی طاقت نہیں رہی — اے سارباں تو ناقہ کو آہستہ تر چلا
غفلت نے شکل ہجر نہ رکھی ہزار شکر — اٹھ کر تو اپنے گھر کو چلا یاں یہ مر چلا

حاصل کنارہ کر چکے سیر جہاں سے ہم — جوں میل رو سیہ پھرے اس خاکداں سے ہم
گویا وہاں زمانے کا غفلت ہے سر گیں — سنتے نہیں ہیں داد کسی کی زباں سے ہم

بیمار نے ہے لکھا:۔ نہ اصلاح جناب غفلت اے بیمار گر ہوتی — تو معنی بھی نہ رکھتا شعر کوئی تجھ سے ناداں کا

جانتا ہے معجزہ بیمارؔ غفلت کا سخن کون ہے دنیا میں ایسا معتقد اوستاد کا

لیکن بیمارؔ کے یہاں غفلتؔ کا رنگ سخن نہیں ملتا۔ جہاں کہیں وہ اس رنگ میں کہتا ہے ناسخؔ اور شاہ نصیرؔ کا رنگ جھلکنے لگتا ہے مجموعی طور پر بیمارؔ غفلتؔ سے اچھا غزل گو ہے۔

نواب محمد سعید خاں کے زمانے کا رام پور شعرا اور علماء کی مجمع گاہ تھا۔ باہر کے شعرا میں میر حسین تسکین دہلوی اور شیخ علی بخش بیمار وغیرہ ملازم سرکار تھے رام پور کے شاعروں میں غفلتؔ سے ہٹ کر اصغر علی خاں اصغرؔ شاگرد مومنؔ متوفی ۱۳۰۷ھ، نجف علی شفقتؔ شاگرد شاہ نصیرؔ متوفی ۱۲۷۱ھ عنایتؔ شاگرد مومنؔ ۱۲۶۵ھ، احمد خاں فاخرؔ متوفی ۱۲۹۰ھ اور مولوی الہ داد طالبؔ ۱۲۷۵ھ پیش پیش تھے بیمارؔ یقیناً ان سب سے متاثر ہوئے ہوں گے یہاں خاص خاص شاعروں کا نمونہ کلام پیش کرنا مناسب ہوگا۔

اصغر علی خاں اصغرؔ

(۱) عشق سے اک لحظ بس نجات نہیں موت سے کم مری حیات نہیں

یوں تو نامہرباں نہیں ہو تم پر وہ پہلا سا التفات نہیں

بے وفا تیرے عہد کی مانند اب مرے صبر میں ثبات نہیں

میں ہی ملتا ہوں بے حیائی سے پوچھتا وہ تو میری بات نہیں

جان کھونے کے سوا کیا ہنر آتا ہے مجھے یہی آتا ہے مجھے کچھ اگر آتا ہے مجھے

دل میں اک قطرۂ خوں ہے نہ جگر میں ہے پاس بے رونقیٔ چشم تر آتا ہے مجھے

میں تو دیتا ہوں دم اس قد قیامت زا پر پند گو آمدِ محشر سے ڈراتا ہے مجھے

عنایت علی خاں عنایتؔ

(۲) میری وفا مجھی کو سزا وار تو بتا تجھ سا اگر تجھے کوئی بیداد گر ملے

عدو کی جائے ہو کیوں کر کہو مرے دل میں خیال بھی تو تمہارے سوا نہیں آتا

تجھ پہ گذری سو گذری پر قاصد میرے خط کا جواب کیا لایا

نجف علی شفقتؔ

(۳) بے وقت ٹل گئے ترے اس آستاں سے ہم اے جاں یہ جانیے کہ گئے اپنی جاں سے ہم

اے ہم صفیر و ملبل بے تاب کی طرح نے خواہش بہار نہ شاکی خزاں سے ہم

---

(۱)(۲) اصغرؔ اور عنایتؔ کی مستقل سکونت دہلی میں تھی۔ عنایتؔ آخر میں رام پور آ گئے تھے۔ اصغرؔ کبھی کبھی آتے تھے۔ کلام بالواسطہ اثر ضرور ڈالتا ہوگا۔

وہ جلوہ اپنا دکھلانے کو ظالم کم نکلتا ہے — یہاں پر انتظاری میں ہمارا دم نکلتا ہے

میر حسین تسکین دہلوی

(۴) کوچۂ یار میں میں نے تسکیں — پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

ہر روز وہ ڈھونڈے ہے کوئی تازہ خریدار — صورت مری ہر روز بدل جائے تو اچھا

اے چشم سرمگیں تری گردش نے کیا کیا — راحت پذیر تھے ستم آسماں سے ہم

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے — کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلی دل — کسی کے جانے سے گو خود نہیں قرار مجھے

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی — بات تو کرنے دے اس سے دل بیتاب مجھے

خدا جانے عدو پر کیا بنے گی — پڑا ہے کام ان سے بدگماں سے

گماں ہے دل کو سب پہ نامہ بر کا — کہوں کس کس سے آتے ہو کہاں سے

انصاف کر خراب نہ پھرتا میں دربدر — ملتی جو تیرے گوشۂ خاطر میں جا مجھے

بے وجہ ہر اک بات پہ رنجش ہے ہمیں سے — دشمن پہ کبھی آپ کو غصہ نہیں آتا

اس بزم میں آتا نہیں توبہ کا ذرا پاس — ناصح تجھے ساقی نے دیا جام نہ ہوگا

بیمار دہلوی

(۵) دل لگایا تھا دل لگی کے لئے — لگ گیا روگ جیتے جی کے لئے

نفس عیسوی نہ کر ممنون — ہم کو دو دن کی زندگی کے لئے

مر کے ہم نے تو سب کو دیکھ لیا — کوئی مرتا نہیں کسی کے لئے

ہم نے دشمن کیا جہاں اپنا — بے وفا تیری دوستی کے لئے

بیمار کے رنگ کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں تین چیزیں نمایاں طور پر نظر آئیں گی۔ ایک تو لکھنویت جس کے تحت ان کے یہاں رعایت لفظی، کنگھی چوٹی کے اشعار، دور از کار تشبیہیں اور رکاکت اور ابتذال ملتا ہے۔ ایسے اشعار کی تعداد کلام کا پانچواں حصہ ہے داغ سے پہلے بیمار کے یہاں کہیں مصحفی کے لہجہ میں کہیں بالکل داغ کے لہجہ میں وہی خیالات و مضامین وہی چستی اور ڈھیٹ ملتی ہے۔ اس قسم کے اکثر اشعار داغ کے رنگ میں داغ سے بہتر کہے گئے ہیں، یہ بیمار

کا دوسرا رنگ ہے، تیسرا اور سب سے زیادہ قابلِ قدر رنگ وہ ہے جسے مومن اور غالب کا رنگ کہنا چاہیے، الفاظ کا رکھ رکھاؤ، خیالات کی بلندی، شعر میں بہت سے امکانات چھپا دینا، عالمگیر انسانی نفسیات کی ترجمانی، اسرار و رموزِ محبت کا تجزیہ باتی بیان یہ سب چیزیں ہیں جو بیمار کے سب سے اچھے اشعار میں ملتی ہیں۔

مومن ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے، غالب ۱۲۱۲ھ میں۔ مومن نے ۱۲۶۸ھ میں انتقال کیا غالب نے ۱۲۸۵ھ میں۔ بیمار کا سال پیدائش ۱۲۰۱ھ ہے اور سال وفات ۱۲۷۱ھ مومن کے شاگردِ رشید میر حسین تسکین نے رام پور ہی میں ۱۲۸۱ھ میں انتقال کیا ان کا سال پیدائش ۱۲۱۸ھ ہے۔ بیمار عمر کے اعتبار سے ان میں سب سے بڑے تھے۔ تسکین اور مومن بالکل ایک طرز میں کہنے والے تھے۔ بیمار کے سب سے اچھے اشعار غالب سے ہٹ کر مومن بلکہ کہنا چاہیے تسکین کے رنگ کے ہیں[1] رام پور میں یہ ستھرا مذاق طالب رام پوری میں ملتا ہے۔ بہت ممکن ہے بیمار نے تسکین کا رنگ پسند کیا ہو اور اسے جذب کر لیا ہو بہر حال یہ تو ناممکن ہے کہ دتی کے شاعروں نے رام پور میں رہنے والے ایک گمنام شاعر سے استفادہ کیا ہو۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ بیمار نے مومن یا تسکین کی تقلید کی ممکن ہے بیمار کی یہ اپنی اپج ہو ممکن ہے وہ بھی مومن اور غالب کی طرح نئی راہیں بنانے کا عادی ہو۔ تو یہ ہے بیمار کے رنگ کا تجزیہ، مختصر سے انتخاب سے اس کی قدر وقیمت واضح ہو جائے گی۔

بیمار کے شاگردوں تو ایک درجن سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ لیکن احمد علی رسا رام پوری اور نظام رام پوری ایسے دو شاگرد ہیں جنہوں نے استاد کی لاج ہی نہیں رکھی بلکہ استاد کے ہر طرز پر اضافہ کیا۔ احمد علی رسا کا کلام نہیں ملتا۔ نظام کا کلام شائع ہو چکا ہے اور مولانا نیاز[2] اور پرنسپل عبدالشکور[2] ان پر خوب خوب لکھ چکے ہیں۔

بیمار کی تصنیفات سے دو قلمی چیزیں ہمیں مل سکی ہیں اور وہ دونوں رضا لائبریری رام پور

---

[1] میر حسین تسکین اور ان کا کلام از عابد رضا بیدار معارف جنوری ۱۹۵۳ء [2] نگار ۱۹۲۲ء؛ انتقادیات

میں موجود ہیں ایک ان کا دیوان جس میں ۶۰۰ اشعار غزل اور ایک معمولی قصیدہ ولی عہد بہادر (غالباً نواب یوسف علی خاں ناظم) کی تعریف میں ہے دوسرے، طلسم بیضا نام کی ایک داستان ہے جسے بقول بیمار فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے اور جو بوستان خیال کا خلاصہ ہے اس میں بھی کوئی خاص بات نہیں یہ داستان نثر اردو میں ہے تذکرہ نویسوں نے غلطی سے اسے منظوم داستان کہا ہے یہ غلطی صاحب گلستانِ سخن اور صاحب خمخانۂ جاوید سے ہوئی ہے۔

کلام بیمار کا مختصر سا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔

نہ بناتا جو دن جدائی کا
کیا بگڑتا تری خدائی کا

کل تھے رندی کے مجتہد بیمار
آج دعویٰ ہے پارسائی کا

وحشتِ دل نے پھر نکالے پاؤں
پھر تحمل کا اختیار اُٹھا

پھر جنوں فصلِ گل میں لایا رنگ
پھر میں ہونے کو شرمسار اٹھا

کون پرساں ہے حال بسمل کا
خلق منہ دیکھتی ہے قاتل کا

کبک اس منہ سے اس کو کیا نسبت
داغ تو دیکھ ماہ کامل کا

لب جو کون سیر کو آیا
موج منہ چومتی ہے ساحل کا

سانس آہستہ لیجیو بیمار
ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

تقریر جس گھڑی لب مطلب تک آگئی
بہکا یہ قصہ خواں کہ فسانہ بدل گیا

پتھر پڑیں سپہر ترے انقلاب پر
گو رنگ بزم خانہ سجانہ بدل گیا

نغمہ قفس میں نالۂ بلبل نہ ہو سکا
نوحہ سے لاکھ بار ترانہ بدل گیا

مسجد میں پی شراب پڑھی دیر میں نماز
بیمار کو شعور کسی بات کا نہیں

مٹا نہ داغِ خزاں عندلیب کے دل سے
ہزار باغ میں موسم بہار کا پہنچا

کہاں تک اہل وفا ضبط آہ کا یارا
کہ انتہا کو ستم اب تو یار کا پہنچا

روئیں ترے ستم سے بھلا کس کے سامنے
اتنا بھی تو کوئی نہیں کہتا بُرا ہوا

محتسب پوچھ مے پرستوں سے
نام آمرزگار ہے کس کا

بزم میں وہ نہیں اُٹھاتے آنکھ
دیکھنا ناگوار ہے کس کا

جب باعثِ کلامِ ترش پوچھتا ہوں میں
کہتے ہیں وہ کہ رنگِ محبت کھلا نہیں

سنگِ درِ حرم مرے سجدوں سے مٹ گیا
تو بھی نشانِ قشقہ جبیں سے مٹا نہیں

بیمار اور اس کے سوا کچھ نہیں خبر
اچھا ہوا ہوں حادثہ ناگہاں کے ساتھ

جنت میں حیاتِ ابدی خاک ملے گی
دنیا میں تو مانگے نہ ملی موت خدا سے

فریبِ یار کا شکوہ زباں پہ آجاتا
بھلا ہوا جو مرے دل نے کی دغا مجھ سے

عذابِ آتشِ فرقت سے کانپتا تھا دل
ہزار شکر جہنم ملا سزا کے لئے

سن کر معاملے ترے اہلِ نیاز سے
لایا جو تھا وہ بھول گئی التجا مجھے

دیتا ہے طمع حورِ صنم تیرے سامنے
واعظ خطا شعار نے سمجھا ہے کیا مجھے

رو بدگماں کہاں ہیں کہاں محفلِ نشاط
بزمِ عزا میں بھی نہیں ملتی ہے جا مجھے

؎ کہتا ہوں اضطراب میں دشمن سے حالِ دل
اپنا مآلِ کار نہیں سوجھتا مجھے

فتنے جو کچھ اُٹھے ترے اغماض سے اُٹھے
اے دوست دشمنوں سے بھلا کیا گلا مجھے

؎ پورا مصرعہ تسکین کے یہاں نظر آتا ہے
مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تسکیں
کہ سوجھتا نہیں اپنا مآلِ کار مجھے

حالات حاضرہ

ایک سیاسی جائزہ

صدر آئزن ہاور کی پیشکش

از
(اسرار احمد صاحب آزاد)

گذشتہ ماہ میں ۱۶ امریکن سوسائٹی آف نیوز پیپر اڈیٹرز" کے سالانہ اجلاس کو مخاطب کرتے ہوئے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر آئزن ہاور نے بقاء امن عالم، اقوام عالم کے مابین تعاون اور اشتراک عمل، نیز بین الاقوامی خوشحالی اور ترقی کے لئے ایک اہم منصوبہ پیش کیا ہے۔ اس منصوبہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ـــــ سوویٹ یونین کوریا میں باعزت مصالحت اور متحدہ کوریا میں عام انتخابات کرانے ہند چینی اور ملایا میں کمیونسٹوں کی سرگرمیوں کو ختم کرانے۔ آسٹریلیا کی آزادی کو تسلیم کرنے اور وہاں سے غیر ملکی افواج کے ہٹائے جانے، جرمنی کو متحد کر کے پوشیدہ طریقہ رائے دہندگی کے ماتحت عام انتخابات کرانے تمام اقوام کے لئے جن میں مشرقی یورپ کی قومیں بھی شامل ہیں ان کی مرضی کے مطابق حکومتیں قائم کرنے کے حق کو تسلیم کرنے اور ادارہ اقوام متحدہ کی نگرانی میں تحدید اسلحہ و افواج پر رضامند ہو جائے تو ریاست ہائے متحدہ امریکہ اس کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے تیار ہے اور اس طرح مصارف میں تخفیف کی بدولت جو بچت ہو گی اسے ایک بین الاقوامی سرمایہ کی شکل میں اقوام عالم کی اقتصادی، تعلیمی، معاشرتی اور تجارتی فلاح و بہبود کے لئے خرچ کیا جائے گا

صدر آئزن ہاور نے مذکورہ بالا منصوبہ ایک تقریر میں پیش کیا ہے اس لئے فی الحال اسے سرکاری حیثیت نہیں بلکہ نیم سرکاری حیثیت حاصل ہے اور اسی لئے اس پر سوویٹ یونین کی حکومت نے نہیں بلکہ سوویٹ یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان اخبار "پراودا" اور حکومت کے ترجمان

اخبار" ازوستیا" نے اظہار خیال بھی کیا ہے اور ان دونوں اخباروں کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ـــــ سوویٹ یونین موجودہ بین الاقوامی تنازعات کو حل اور عالم گیر امن قائم کرنے کے سلسلہ میں اپنے مقدور بھر کوشش کرنے کے لئے تیار ہے اس کے رہنماؤں پر اس معاملہ میں شک وشبہ وارد کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ـــــ اس کے ساتھ ہی ان اخباروں نے صدر آئزن ہاور کی پیش کردہ ان مطالبات کو بے محل قرار دیا ہے جو انہوں نے موجودہ حالات میں سوویٹ یونین سے کئے ہیں اور اس بات پر نکتہ چینی کی ہے کہ صدر آئزن ہاور نے اپنی تقریر اور تجویز میں چین کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے حکمران طبقوں اور تمام دنیا میں ان کے ہمنواؤں پر "پراودا" اور "ازوستیا" کے خیالات کا ردعمل کیا ہوگا یہاں اس پر اظہار خیال کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، لیکن بقاء امن اور بین الاقوامی تعلقات کو مستحکم اور خوش گوار بنانے کا معاملہ امریکہ اور روس ہی کا معاملہ نہیں بلکہ دنیا کے ہر ملک کا معاملہ ہے اس لئے ہمیں ایک آزاد اور امن پسند ملک کے شہری کی حیثیت سے اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ کیا صدر آئزن ہاور کی تجویز اپنی جگہ مکمل ہے اور اگر اس کی موجودہ شکل میں اس کی حمایت کی گئی تو کیا اس کی بدولت عالم گیر امن قائم ہو سکتا ہے؟

اس سلسلہ میں ہمیں صرف مشرق بعید ہی کے مسائل پر غور کر لینا چاہئے۔ اس خطۂ ارض میں اس وقت انڈوچائنا، ملایا اور کوریا کے باشندے اپنے اپنے وطن کی آزادی کے لئے سرفروشانہ جدوجہد کر رہے ہیں لیکن صدر آئزن ہاور نے سوویٹ یونین سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ ان ممالک میں کمیونسٹوں کی سرگرمی کو بند کرا دے۔ اس مطالبہ کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ سوویٹ یونین اس بات کی ذمہ داری قبول کرے کہ ان ممالک کے باشندے قومی آزادی کی جدوجہد سے دست کش ہو جائیں گے اور برطانیہ، فرانس اور امریکہ کی اجارہ دارانہ بالادستی پر مطمئن رہیں گے۔ الیکن سوال یہ ہے کہ کیا سوویٹ یونین کے مغربی سرمایہ داروں سے مصالحت کرنے کے لئے کسی قوم کو فروخت کر دینے کا حق حاصل ہے؟ اور اگر وہ میونخ کی ملعون مثال کی تجدید پر آمادہ بھی ہو جائے تو کیا ملایا، ہند چینی اور کوریا کے باشندے نیز دنیا کے کروڑوں حریت پسند باشندے اس کی اس حرکت کو گوارہ کر سکیں گے؟ صدر آئزن ہاور کا یہ مطالبہ بے معنی مطالبہ ہے اس کے

برعکس انہیں مغربی نوآبادیات خواہ جمہوریت پسندوں سے مطالبہ کرنا چاہئے کہ وہ بقاء امن عالم اور عالمگیر خوشحالی اور ترقی کی تمام مناسب تحریکات اور تجاویز کے سلسلہ میں اپنی جمہوریت پسندی اور امن خواہی کے عملی ثبوت کے طور پر ایشیاء اور افریقہ کے تمام محکوم اور مظلوم ممالک کی آزادی اور خودمختاری کو تسلیم کرلیں اور اسی طرح محض مشرقی یورپ ہی کے چند ملکوں کو نہیں بلکہ ایشیا اور افریقہ کے تمام محکوم ملکوں کو بھی اس بات کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنے لئے جس قسم کی حکومت چاہیں قائم کریں۔

یہاں اس بحث کی گنجائش نہیں کہ ملایا، ہند چینی اور کوریا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ صرف کمیونسٹوں کی ہنگامہ خیزی ہے یا قومی آزادی کی جدوجہد۔ یہ ایک جداگانہ موضوع بحث ہے لیکن گذشتہ ماہ کے آخری عشرہ میں امریکہ سے واپس آتے ہوئے کمبوڈیا کے نوجوان بادشاہ نے ایک بیان میں کہا تھا کہ ــــ اگر میرے ملک کے باشندوں کو سیاسی آزادی نہ دی گئی تو وہ کمیونسٹوں کے ساتھ مل جائیں گے ــــ اور اس بیان کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان ممالک باشندوں کی جدوجہد شورش پسندی کے جذبہ کے ماتحت بلکہ قومی آزادی کی ضرورت کے احساس پر مبنی ہے۔ پھر دنیا کا ہر ہوش مند اس بات سے واقف ہے کہ چین کی شمولیت کے بغیر مشرق بعید کا کوئی مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکتا اور فارموسا کو ارض چین سمجھ لینا ایک مضحکہ خیز تصور سے زیادہ نہیں اور صدر آئزن ہاور کی تجویز میں چین کے تذکرہ کی عدم موجودگی نے پوری تجویز کو بے اثر بنا دیا ہے۔

مختصر یہ کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد سے جو بین الاقوامی مسائل الجھتے جا رہے ہیں مغربی جمہوریت پسندوں کی طرف سے پہلی بار سلجھانے پر آمادگی کا اظہار کیا گیا ہے اور صدر آئزن ہاور نے اس سلسلہ میں جو تجویز پیش کی ہے، اگرچہ اسے مکمل نہیں کہا جا سکتا، لیکن دنیا کے امن پسند عوام کو اس کی اصلاح پر ضرور زور دینا چاہیئے اور یہ توقع رکھنی چاہئے کہ اگر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے موجودہ حکمران حقیقی معنی میں بقاء امن اور بین الاقوامی ترقی کے خواہاں ہیں تو وہ اس تجویز کی خامیوں کو دور کرنے سے گریز نہ کریں گے۔

ویت نام کا مستقبل

ویت نام جسے ہند چینی بھی کہتے ہیں مشرق بعید کا ایک چھوٹا سا ملک ہے اس ملک پر فرانس نے اٹھارویں صدی عیسوی کے اواخر میں قبضہ کیا تھا اور کم و بیش سوا سو سال تک اس ملک کے باشندے فرانسیسی ملوکیت پسندی کا شکار بنے رہے لیکن دوسری عالمگیر جنگ کے زمانہ میں ۱۹۴۲ء میں ویت نام پر جاپان کا تسلط قائم ہوگیا مگر ویت نام کے قوم پروروں نے ۱۹۴۵ء میں جاپانیوں کو شکست دے کر جمہوریہ ویت نام قائم کرلی۔

یہاں یہ بتادینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اٹلانٹک چارٹر میں دنیا کی تمام قوموں کے لئے ان کی مرضی کے مطابق حکومت کے قیام کے حق کو تسلیم کرلیا گیا تھا۔ اس کے باوجود فرانس نے ویٹ نام پر ازسرِ نو اپنا تسلّط قائم کرنے کی کوششیں شروع کردیں اور مغربی طاقتوں کی امداد اور حمایت نیز اپنے مقامی حامیوں کی بدولت اس ملک پر اپنی حکومت بحال کرنے میں کامیاب ہوگیا لیکن قوم پرور رہنما ڈاکٹر ہوچی منہ اور ان کے رفقاء برابر قومی آزادی کے حصول کی جدوجہد میں مصروف رہے اور اس چھوٹے سے ملک میں گذشتہ سات سال سے قوم پروروں اور فرانس اور اس کے حامیوں کے درمیان خونریز جنگ کا سلسلہ جاری ہے۔

ویت نام کے قوم پرور آہستہ آہستہ فرانس کو پسپا کر رہے ہیں اور گذشتہ ماہ میں انہوں نے ریاست لاؤس پر جو حملہ کیا تھا اس کی کامیابی نے مغربی نوآبادیات خواہوں کو شدید کشمکش میں مبتلا کردیا ہے۔ چنانچہ روزنامہ انگریزی "ہندوستان ٹائمز" کے خصوصی وقائع نگار نے ۲۷ راپریل کو لندن سے طویل اطلاع بھیجی ہے اس میں مذکور ہے کہ —— امریکہ برطانیہ اور فرانس کی حکومتیں ہند چینی کے معاملہ کو مجلس تحفظ کے روبرو پیش کرنے کے مسئلہ پر غور کر رہی ہیں اور کوریا کی طرح ہند چینی میں بھی مسلّح فوج بھیجنے کا معاملہ بھی زیر غور ہے۔

جنگ کے سلسلہ میں ایک بات ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہئے اور وہ بات یہ ہے کہ عہد حاضر کے علم الحرب میں کسی ملک کے عام باشندوں کو ایک مخصوص حیثیت حاصل ہے اور اگر کسی ملک کے باشندے غلامی قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں تو حملہ آور انہیں اپنی قوت و طاقت کے بھروسہ پر مجبور تو کرسکتا ہے لیکن

انہیں غلامی پر رضامند نہیں کر سکتا اور آج کوریا اور ویت نام میں مغربی مستعمرین کو جو ناکامیاں اور قوم پروروں کو جو کامیابیاں حاصل ہو رہی ہیں وہ حصولِ حریت کے مقصد پر عوام کے اتحاد اور غلامی سے نفرت ہی کے جذبہ پر نہیں ہیں، اس لئے اگر ہند چینی کے معاملہ کو مجلس تحفظ میں پیش کیا گیا اور ادارہ اقوام متحدہ کے نام پر ہند چینی میں فرانسیسی ملوکیت پسندوں کی امداد کے لئے افواج بھیجدی گئی تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ مغربی طاقتیں مشرق کی کسی قوم کو بھی آزاد دیکھنا نہیں چاہتیں اور انہوں نے ادارہ اقوام متحدہ کو اپنے مذموم مقاصد کے حصول کا ایک ذریعہ بنا لیا ہے۔

اسی سلسلہ میں اس امر کو بھی مدنظر رکھنا چاہئیے کہ برما میں فارموسائی فوجوں کی موجودگی ثابت ہو چکی ہے اور اس بات کا ثبوت بھی مل چکا ہے کہ گذشتہ چند سال میں اس فوج کے سپاہیوں کی تعداد تین ہزار سے بارہ ہزار تک پہنچ گئی ہے اور انہیں نہایت باقاعدگی کے ساتھ جدید ترین اسلحہ کے علاوہ رسد اور کمک بھی بھیجی جاتی رہی ہے لیکن اس معاملہ میں ادارہ اقوام متحدہ نے نہ تو فارموسا کی حکومت کو "جارح یا حملہ آور" قرار دیا ہے اور نہ برما کو اس فوج سے پاک کرنے کے لئے وہاں اپنی فوج بھیجنے ہی کے مسئلہ پر غور کیا ہے۔ اور اس مثال سے ایک بار پھر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ اس ادارہ کو مشرقی قوموں کی آزادی کی تحریکات کو کچلنے ہی کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے غالبوں کو تہدید و تنبیہ کرنے کے لئے نہیں۔

پاکستان کے تغیرات

گذشتہ چند ماہ سے پاکستان میں کچھ ایسے واقعات پیش آتے رہے ہیں جو ہمارے اس ہمسایہ ملک کے متعدد پے چیدہ مسائل کی غمازی کر رہے ہیں۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہند اور پاکستان دو جدا، آزاد اور خود مختار ملک ہیں، اس کے باوجود ان دونوں ملکوں میں سے کسی ایک ملک میں اچھے یا برے حالات دوسرے ملک کے حالات پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں اور گذشتہ دو تین ماہ سے پاکستان میں جو کچھ ہوتا رہا ہے ہمیں اسے سمجھنے کی ہر ممکن کوشش کرنا چاہئیے۔

پاکستان میں رونما ہونے والے تغیرات کا آغاز "مخالف قادیانیت" تحریک سے ہوا تھا اور بظاہر خاتمہ مسٹر ناظم الدین کی کابینہ کی برطرفی پر ہوا لیکن آغاز و انجام کے مابین پیش آنے والے واقعات کا مطالعہ اس حقیقت کو بے نقاب کرتا ہے کہ اس مختصر سی مدت میں پاکستان حریفانِ اقتدار پسندی کا میدان بنا رہا ہے اور اقتدار پسندی کی اس کشمکش نے پاکستان کی اقتصادیات اور معاشیات کو بڑی حد تک خراب کر دیا ہے۔

ہند اور پاکستان کے تعلقات کی نزاکت اور مستقبل میں ان کے مستحکم اور خوشگوار ہو جانے کی توقع مجھے ان تعلقات کے اسباب و علل اور اس منظر کو بیان کرنے کی اجازت نہیں دیتی لیکن اتنا ضرور سمجھ لینا چاہئے کہ آج کسی ملک کے داخلی تغیرات خارجی اثرات سے پاک نہیں رہ سکتے اور آج پورے مشرق وسطیٰ میں دو سرمایہ دار گروہوں کے مابین جو کشمکش جاری ہے پاکستان کے مذکورہ بالا حالات اور تغیرات بھی اس کشمکش کے اثر سے خالی نہیں اور معاملات کا یہی وہ پہلو ہے جسے ہم ہندوستانیوں کو خصوصیت کے ساتھ مدنظر رکھنا چاہئے۔

بہر حال یہ امر مسرت اور اطمینان کا باعث ہے کہ پاکستان کے نئے وزیر اعظم پنڈت نہرو سے ملاقات کرنے کے خواہش مند ہیں اور انہیں اس بات کا یقین ہے کہ یہ ملاقات دونوں ملکوں کے مابین پیدا شدہ بیشتر اختلافات کو دور کرنے کی موجب ثابت ہو سکے گی۔

ہند اور پاکستان کے مابین جو امور فیصلہ طلب ہیں انہیں دو اقسام میں منقسم کیا جا سکتا ہے مثلاً کشمیر کا تنازعہ اور مشترکہ دفاع کا معاملہ وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن سے براہ راست عوام کا تعلق نہیں لیکن بین مملکتی تجارت اور سفر و قیام ایسے مسئلے عوامی مسئلے ہیں اور جب تک دونوں ملکوں کے عوام ایسے معاملات میں اپنی اپنی جگہ اور ایک دوسرے سے مطمئن نہ ہوں گے دونوں ملکوں کی حکومتوں کا ایک دوسرے کے متعلق قوی ترین جذبہ خیر سگالی بھی کچھ زیادہ خوشگوار نتائج پیدا نہیں کر سکتا۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ دونوں ملکوں کے مابین غیر سرکاری تجارت تقریباً معطل ہے اور اگرچہ پاسپورٹ سسٹم کے نفاذ نے ہند اور پاکستان کے مابین سفر کی بعض دشواریوں کو کم ضرور

کر دیا ہے لیکن امرت سر اور فیروز پور کی راہوں کی بندش نے دونوں ملکوں کے غریب باشندوں کے لئے آمد و رفت کو عملاً مسدود کر رکھا ہے اور اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جب تک اس قسم کے عوامی مسائل کو حل نہیں کیا جائے گا دونوں ملکوں کے تعلقات حقیقی معنوں میں خوش گوار نہیں بن سکتے۔

قرآن اور تعمیر سیرت

از ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب ایم، اے پی ایچ ڈی، صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ۔

قرآنی تعلیمات کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور ان تعلیمات کے ذریعہ سے اس کردار و سیرت کا کس طرح ظہور ہوتا ہے؟ یہ گراں قدر تالیف خاص اس موضوع پر تیار کی گئی ہے۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساسِ کمتری اور بے یقینی کی اندھیریوں میں پھنسے ہوئے ہیں یہ گراں مایہ تالیف ان کے روحانی رشتہ کو استوار کرنے میں "چراغ راہ" کا کام دے گی۔

سچ تو یہ ہے کہ گرامی قدر مولف نے اس کتاب میں تعلیمات قرآنی کا عطر کشید کر کے رکھ دیا ہے اور پھر اس میں فلسفۂ تصوف اور ادب کو بڑی قابلیت سے سمویا ہے۔

"قرآن اور تعمیر سیرت" اپنے انداز کی لاثانی کتاب ہے جس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ فہرست مضامین کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے۔

(۱) عبادت و استعانت (۲) توحید الوہیت (۳) صالحیت (۴) نیکی علم ہے (۵) تعلیم کا مقصد (۶) انسان کامل (۷) تصحیح فکر (۸) قرآن اور سیرت سازی (۹) قوتِ ایمانی اور ظہور غیب (۱۰) ماحول پر کس طرح قابو حاصل کیا جائے (۱۱) کامیاب زندگی کا قرآنی تصور (۱۲) قرآن اور علاج خوف (۱۳) قرآن اور علاج حزن (۱۴) قرآن اور علاج غضب (۱۵) زندگی میں غم کیوں ہے۔

کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ، دیکھنے کے لائق، بڑی تقطیع صفحات ۲۰۳ قیمت غیر مجلد پانچ روپے، مجلد چھ روپے۔

غزل

از

(جناب الم مظفرنگری)

محبت کی قسم فردوس بھی بیت الحزن بھی ہے
وہ محفل جس میں پروانہ بھی ہے شمعِ لگن بھی ہے

ہنسی پھولوں کی سمجھے گریۂ شبنم کو پہچانے
چمن والوں میں کوئی واقفِ رازِ چمن بھی ہے

یقیں ہے قافلہ محفوظ تا منزل نہ پہنچے گا
جسے سمجھے ہوئے ہیں راہبر وہ راہزن بھی ہے

خبر بھی ہے تجھے اے باغباں بجلی کی نظروں میں
مری شاخِ نشیمن ہی نہیں تیرا چمن بھی ہے

تباہی دیکھ کر اہلِ جہاں کی میں یہ سمجھا ہوں
مری قسمت شریکِ گردشِ چرخِ کہن بھی ہے

قریبِ جلوہ گاہِ عشق ہے یہ کون سی منزل
یہاں منصور بھی ہنگامۂ دار و رسن بھی ہے

نہیں حسنِ بتاں ہی شہرتِ بتخانہ کا ضامن
صدائے نغمۂ ناقوس بھی ہے برہمن بھی ہے

لحد میں خوفِ ظلمت کیا یہاں فیضِ محبت سے
فروغِ داغِ دل بھی ہے تجلی کفن بھی ہے

فقط سمجھا ہے جس کو شمعِ محفل ذوقِ پروانہ
وہ جانِ انجمن بھی سر فروشِ انجمن بھی ہے

شریکِ سازشِ بربادیٔ تنظیمِ رنگ و بو
فقط لالہ نہیں سرو و سمن بھی نسترن بھی ہے

ہے جلوہ ایک لیکن جلوہ گاہیں مختلف سی ہیں
رگِ گل نام ہے جس کا وہ سورج کی کرن بھی ہے

کمالِ کفر سے تخلیقِ ایماں ہوتی آئی ہے
مذاقِ آذری بت گر بھی ہے اور بت شکن بھی ہے

سرِ دورِ رقصِ مستانہ کے جلوے دیکھنے والے
نگاہوں میں مآلِ انقلابِ انجمن بھی ہے

فضائے قدس میں دیکھیں تو سبقت کون لے جائے
پرِ جبریل بھی ہے اور پروازِ سخن بھی ہے

الم کی طرزِ فکرِ شعر کو دیکھا ہے ہم نے بھی
مذاقِ تازہ بھی ہے اور اندازِ کہن بھی ہے

اردو

از

(جناب برج لال جگی رعنا)

یہ رباعیات انجمن ترقی اردو شاخ دہلی کے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی تھیں جو بہت پسند کی گئیں "برہان"

(۱)

دانہ تھی کبھی اب تو شجر ہے اردو
قطرہ تھی کبھی اب تو گہر ہے اردو
آسان نہیں اس کا مٹانا رعنا
صدیوں کی ریاضت کا ثمر ہے اردو

(۲)

انداز حسیں۔ طرز سہانی اس کی
الفاظ میں ہے گہر فشانی اس کی
مقبول وجہانگیر ہے اردو اتنی
غیروں کے بھی لب پر ہے کہانی اس کی

(۳)

کوثر کی روانی ہے روانی اس کی
حوروں کی جوانی ہے جوانی اس کی
یہ حسن معانی یہ جمالِ الفاظ
جنت کی کہانی ہے کہانی اس کی

(۴)

ہر رنگ کے جذبات کا آئینہ ہے
ہر صورتِ حالات کا آئینہ ہے
اللہ رے وسعتِ جہانِ اردو
صدیوں کی روایات کا آئینہ ہے

(۵)

تہذیبِ وفاق کی کہانی ہے یہ
مخلوط تمدن کی نشانی ہے یہ
ہر رنگ میں تصویرِ رواداری ہے
آئینۂ حسنِ جاودانی ہے یہ

(۶)

اخلاص کا اڑتا ہوا پرچم ہے یہ
آئینۂ حسن ربط باہم ہے یہ
اک خوابِ محبت کی ہے زندہ تعبیر
گنگا ز مزم کا پاک سنگم ہے یہ

(۷)

اپنی ہی زمیں کا یہ شجر ہے رعنا
اپنے ہی فلک کا یہ قمر ہے رعنا
کیوں غیر سمجھتے ہیں اس کو کچھ لوگ
یہ اپنی ہی آنکھوں کی نظر ہے رعنا

(۸)

سوئے ہوئے انساں کو جگایا اس نے
احساس حیات نو دلایا اس نے
بجھتے بجھتے چراغ آزادی کو
پھر سوز ترنم سے جلایا اس نے

(۹)

حالات کا جائزہ لیا ہے اس نے
ماحول پہ تبصرہ کیا ہے اس نے
جب بھی کوئی تحریک چلی ہے رعنا
ساتھ اس کا بہر نوع دیا ہے اس نے

(۱۰)

مسجودِ مسیح و خضر ہے دم اس کا
ہے جوشِ حیات جزو اعظم اس کا
ہے کشتیٔ طوفان زدہ کے حق میں
آغوشِ اماں ۔ ساحلِ محکم اس کا

(۱۱)

بیکنٹھ کی کلیوں کی چٹک ہے اس میں
سوزِ دلِ عاشق کی بھڑک ہے اس میں
شبنم کی دلاویز نزاکت ہی نہیں
خورشید کی کرنوں کی چمک ہے اس میں

(۱۲)

کچھ صبحِ ازل کی بھی جھلک ہے اس میں
کچھ شامِ ابد کی بھی چمک ہے اس میں
دب سکتی ہے لیکن یہ نہیں مٹ سکتی
فطرت کی مستقل لچک ہے اس میں

(۱۳)

گلزارِ نسیم جادو دانی ہے یہ
سرشار کی اعجاز بیانی ہے یہ
جو رنگِ تعصب سے بری ہو یکسر
وہ نقشِ جمالِ زندگانی ہے یہ

(۱۴)

کیفی کا پیام ہے ضمانت اس کی
محروم کا نام ہے ضمانت اس کی
زندہ ہے اور یہ رہے گی زندہ
رعنا کا کلام ہے ضمانت اس کی

شئون علمیہ

آواز اور جراثیم

اونچے سر کی آوازیں جراثیم کو ہلاک کر سکتی ہیں۔ یہ امریکن کیمیکل سوسائیٹی کا گویا عقیدہ ہے چنانچہ وہ اس پر تجربے کر رہی ہے کہ آواز یا شور سے جراثیم کے ہلاک کرنے کا کام لیا جائے تاکہ پانی اور دودھ کو جراثیم سے پاک کیا جا سکے۔

انسانی کان جن آوازوں کو سن سکتا ہے ان سے ۶۰ گنا بلند تر آوازوں کو گارتھ سے Gauss کی ایک قسم سن سکتی ہے۔ یہ مصنوعی "کان" ان آوازوں کی "سماعت" کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو جراثیم کے لئے مہلک ہیں۔

آواز ایک حرکت ہے۔ ایک ارتعاش ہے۔ ایک سکنڈ میں اگر ۲۰ ہزار سے زائد ارتعاش ہوں تو انسانی کان ان کو سن نہیں سکتا۔ ایسی آوازیں "بالا صوتی" (ULTRASONIE) کہلاتی ہیں۔ ان آوازوں کی زد میں جو جراثیم آجاتے ہیں وہ پھر پنپ نہیں سکتے۔ اس لئے غذاؤں کی حفاظت کا کام ان سے لیا جا سکتا ہے۔

اگر ایک سکنڈ میں دس لاکھ یا اس سے زیادہ ارتعاش ہونے لگیں تو پھر آواز میں روشنی کی سی خاصیتیں نظر آنے لگتی ہیں۔

اگر ایسے ارتعاشوں یعنی ایسی اونچی آوازوں کے راستے میں انگلی رکھی جائے تو ارتعاشی حرکت یعنی جھنجھناہٹ محسوس ہوتی ہے اور ساتھ ہی ہڈیوں میں سے آواز کے گزرنے میں بھی محسوس ہوتی ہے۔

موسیقی کی تانیں ایسے اونچے سروں میں بجائی جا سکتی ہیں جن سے جراثیم ہلاک ہو جائیں۔ تو پھر مشرق میں موسیقی کے متعلق جو دعوے کئے گئے ہیں ان میں کچھ صداقت نظر آنے لگتی ہے۔
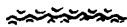
اقبال کی کہانی پر تبصرے سے متاثر ہو کر

از

(جناب ڈاکٹر ظہیر الدین احمد صاحب. جامعی)

محترمی زاد مجدکم ومتعنا اللہ بافاداتکم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

مؤقر ماہنامہ "برہان" کی حالیہ اشاعت میں میری ایک نہایت ہی حقیر کوشش "اقبال کی کہانی" کے متعلق آپ کے گرامی تاثرات میری نظر سے گذرے۔ لہجہ کی سنجیدگی متانت اور شائستگی نے مجھ کو بہت متاثر کیا ہے، تنقید برائے تحقیق کی یہ ایک جاندار مثال ہے، اسی سے علم حھنتا، علم کی راہیں کھلتیں اور حقیقت تک پہنچنے میں ہم کو بڑی مدد ملتی ہے۔ تنقید کی ایک دوسری قسم بھی ہے جس کی غرض تحقیق نہیں تعریض ہوا کرتی ہے اس تنقید برائے تعریض سے نفس امارہ کی تسکین، خرافات نفس کی تشفی تو ہو سکتی ہے لیکن علم کی گتھیاں نہیں سلجھ سکتیں۔ اس سے تو رشتۂ علم پر پہلے ہی سے پڑی ہوئی بہت سی گرہوں میں ایک گرہ کا اور اضافہ ہو جاتا ہے اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ آپ کی تنقید کے اسی برگزیدہ انداز تحقیق نے میرے اس "عجالۂ ناقصہ" کے متعلق جو چند اہم تنقیحات پیدا کی ہیں انھوں نے مجھ کو اپنے افکار و خیالات کا از سر نو جائزہ لینے پر مجبور کر دیا ہے اور محض تبادلۂ فکر کے لئے میں آپ کی خدمت میں کچھ باتیں پیش کر رہا ہوں کہ اگر ان سے آپ کا اطمینان ہو سکا تو پھر مجھ کو اپنے پیش کردہ افکار میں کسی ترمیم کی ضرورت نہ ہوگی ورنہ آپ کا فیاض علم مجھ کو اپنے خیالات کی اصلاح پر اس طرح مطمئن کر دے گا کہ دوسری اشاعت کے موقع پر مناسب ترمیم کے ساتھ اپنے خیالات کو پیش کروں۔

مولویت اور صوفیت اگر نام ہے مذہب کی روح سے اُس سرشاری کا جو آدمی کو اعلائے کلمۃ الحق کے لئے ہمیشہ سر بکف۔ امحائے باطل کے لئے متحرک اور بے چین اور "می نگنجد در جہان دیگراں" کا جاندار مصداق بنا دیتی اور عالم قرآن کو وجود میں لانے کے لئے اس فرسودہ عالم کو میٹ

کر رکھ دینے کی کم از کم آرزو اور تڑپ سے قلب و دماغ کے ہر گوشے کو گھیر لیتی ہے تو پھر میں آپ کے اس خیال سے پوری طرح متفق ہوں کہ اقبال ایک کٹر مولوی اور ایک کٹر صوفی تھا بلکہ میں تو یہاں تک کہہ سکتا ہوں کہ قدرت نے گذشتہ سات سو سال میں ایسے چند ہی مولوی اور صوفی پیدا کئے ہیں۔ اس مولویت اور صوفیت کے بلند مقام پر فائز تو سب سے پہلے ذات قدسی صفات حضرت رحمۃ للعالمین (صلعم) تھی۔ اسی مولویت اور صوفیت نے ابو بکرؓ کو صدیقؓ، عمرؓ کو فاروقؓ، عثمانؓ کو غنیؓ، اور حیدرؓ کو کرار بنایا تھا۔ اور اسی منصب پر فائز ہونے کی تمناء میں اقطاب و اولیاءؒ اتقیاء و صالحین نے عمریں گذاریں۔ اسی سے بدر و حنین میں گرمی پیدا ہوئی تھی۔ اور اسی نے حسینؓ کو وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل بلند کرنے پر آمادہ کیا تھا۔ حاشا وکلا اس مولویت اور صوفیت کے خلاف بے احترامی کا کوئی جذبہ نہ میں نے پیدا کیا ہے اور نہ کبھی اس کا وہم و گمان بھی رومیؒ اور اقبالؒ کے ایک ادنیٰ حلقہ بگوش کی حیثیت سے مجھ کو ہو سکتا ہے۔ اس کے بالکل برعکس میں تو اس کا کوئی معمولی سے معمولی شائبہ بھی اپنے اندر پیدا ہو جانے کی دلسوز دعائیں کرتا رہتا ہوں اور آپ سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ میرے لئے دعا فرمائیں۔

اس کے علاوہ مولویت اور صوفیت کی جو بھی شکلیں ہیں اور ایک حد تک ان کی جانب آپ نے بھی اشارہ کیا ہے وہ قرآن کی نظر میں جو اقبال کا نقطۂ نظر ہے، مردود، مذموم اور بہر حال میٹ دینے کے قابل ہے۔ ملت نئی قباؤں میں یہ خود کو ظاہر کرتی رہتی ہیں۔ اپنے ہی ساختہ پرداختہ اصنام سے ان کے قلب معمور ہوتے ہیں۔ فرمانرواؤں کی قوت ان کی معبود ہوتی ہے اور انھی کی مصلحت اور مفاد کے لئے یہ سوچتے ہیں اور انھی کے منشاء و مراد کے مطابق اپنی دل نشین تقریروں سے تجدید اور احیائے دین کے فرائض انجام دیتے دکھائی دیتے ہیں۔ غیر کی تعمیر کے لئے ملت کی تخریب میں ان کو لطف ملتا ہے۔ گفتہ ہائے بے عمل کی ان چلتی پھرتی تصویروں کو اگر موقع ملے تو کعبۃ اللہ کے ملبہ سے کسی دیر کی تعمیر تک میں ان کو تامل ہو پہل مندی۔ عبادت، تن پروری اور مفت خوری کے یہ مجسمے مرگِ ناتمام کی جنگل میں اپنی روح کو دیئے ہوئے۔ خاکِ مزار کو کسبِ معاش کا ذریعہ بنائے ہوئے ہیں۔

خانقاہوں کے یہ مجاور اور گورکن، بزرگانِ دین کے مقبروں کی اس تجارت اور اپنی خود ساختہ اوضاع و اشکال کو تعبدانہ اور الٰہی اہمیت دے کر سادہ لوح عوام کو گمراہ کر رہے ہیں۔ اپنی پیدا کی ہوئی بدعتوں کو شعائرِ دینیہ کا درجہ دیتے ہیں اور اس طرح مذہب اور دین سے عام بیزاری اور تنفر پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی مولویت اور صوفیت کے خلاف اقبالؔ نے جو جہاد کیا ہے اس کا خود آپ کو اعتراف ہے۔ عالمِ قرآن کا متحقق ہونا اقبالؔ کی نظر میں موقوف ہے ان بتوں کے ڈھا دینے پر۔ اقبالؔ کے خیال میں ان کم نگاہ، کور ذوق، ہرزہ گرد ہستیوں کے قال و اقوال نے ہی ملت کے پرخچے اڑا دئے ہیں ان کو وہ قرآن فروش کہتا ہے جن کی تحریف و تاویل نے روح الامین تک کو مضطرب اور پریشان کر رکھا ہے اس کی نگاہ میں یہ دین فروش سوداگر ہیں جو رحمۃ للعالمین کے دین کی حکمت سے قطعاً بے نصیب ہیں۔ ان کے نزدیک ام الکتاب کی ایک افسانہ سے بڑھ کر کچھ قیمت نہیں۔ اسرارِ کتاب تک ان کی جامد فکر کی رسائی اتنی ہی ناممکن ہے جتنا کسی مادر زاد اندھے کا آفتاب کو دیکھنا۔ اس دین کو جس کا یہ مظاہرہ کرتے ہیں اقبالؔ ع "دینِ ملائی سبیل اللہ فساد" کہتا اور اس دین سے اپنی برأت ظاہر کرتا ہے جو انسان میں بیداری اور مسائلِ حیات کو پوری توانائی کے ساتھ حل کرنے کی بجائے آدمی پر غنودگی طاری کر دے اور زندگی کے تقاضوں اور مشکلات سے کترا کر بچ نکلنے کی ترغیب دے۔ اس کی نگاہ میں دین کے یہ مظاہرے سحر و افسوں تو ہو سکتے ہیں لیکن دین ہرگز نہیں۔ ان کے افیون کی گولیاں ہونے میں تو کلام نہیں لیکن مذہب ہرگز نہیں۔

آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے ایک قوم وجود میں آئی جس کی اصل ایک باختہ رنگ شرارے سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن ایک امّی کے فیضِ نظر اور اس کی برگزیدہ حکمت کے اثر نے اس کو خورشیدِ جہانگیر اور آشنائے نہاں خانۂ تقدیر بنا دیا۔ اپنے ہر قدم سے وہ سینکڑوں ہنگاموں کی صورت گری اور اپنے فلک شکن نعروں سے وسعتِ افلاک میں غلغلے پیدا کر رہی تھی۔ اس کا مُکا بڑے سے بڑے باطل کی گردن توڑ کر رکھ دیتا اور اس کے تیوروں کو دنیا کی قوتیں احترام کی نظر سے دیکھا کرتیں۔ ویرانوں کو گلزار بناتی، بے آبرو انسانیت کے مرتبہ اور وقار کو بڑھاتی اور مظلوم انسانیت کی ہر گونہ بہبودی اور صلاح

کے سامان مہیا کرتی ہوئی وہ آگے ہی بڑھتا جاتی تھی۔ اس آسمان کبود کے لئے یہ ستارے آنکھوں کا کام دیتے تھے اور وہ ان آنکھوں سے اس کی خوش خرامیوں کو دیکھ کر مست ہوجایا کرتے تھے آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ باتیں خواب وخیال اور ایک پارینہ افسانہ ہوکر رہ گئی ہیں ذوقِ جعفر سے محروم اور کاوشِ رازی سے لرزاں، ترساں اور گریزاں یہ مولوی وصوفی عروجِ رفعت سے اس کو گرار ہے اسلام کی عظمت وشوکت کے پرچم کو سرنگوں کر رہے ہے، دینِ حق کی کافری سے زیادہ رسوائی کر رہے اور اپنی کافرگری کے جوہر دکھا رہے ہیں۔ قطع وبرید کے ذریعہ اپنی شکل وصورت میں ایک ذرا سا تغیر اور اپنے طور وطریق، وضع وقطع میں اک ذرا سی تبدیلی ان کے لئے اسرارِ دین اور رموزِ مذہب کی ٹھیکہ داری اور فکر کی سرمایہ داری کی ضمانت دینے لگتی ہے اور ان کو انسانیت کے لئے شاہراہِ دین کو تنگ سے تنگ تر کرنے کے بڑے ہی نجس اور ناپاک موقعے ملتے جاتے ہیں۔ یہ مذہب جس کا یہ مظاہرہ کرتے ہیں، غیر مسلموں کے لئے کوئی ترغیب تو کیا بن سکتا اس سے تو خود ان لوگوں کا دم گھٹ رہا ہے جو اس کو قبول کئے ہوئے ہیں۔ یہ داستان گو اور افسانہ بند ہستیاں نامِ منبر ان کے خود ساختہ قصے بیان کرنے میں تو اپنی چرب زبانی کے جوہر دکھاتی ہیں لیکن "قیامت موجود" سے غافل اس مسکین ملت کو نت نئی قیامتوں کا شکار بنا رہی ہیں۔ اپنے سحر وافسوں سے تسلیم ورضا، توکل وقناعت کی جو قطعاً غیر شرعی، غلط اور غیر فطری تعلیم انھوں نے اس غم زدہ اور بدنصیب قوم کو دی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ آج وہ اپنے ہاتھ پیر توڑے ہوئے دنیا کے تاریک کونوں میں اپنی قسمت کو پیٹ رو رہی، اپنے کاسۂ گدائی ہی پر ناز کر رہی اور اپنی تقصیر اور کوتاہی کے متناسب دنیا میں ذلیل وخوار ہو رہی ہے صوفی وملا کی شراب نے یہ انجام کیا ہے اس قوم کا جس کے لئے کہکشاں جائے نماز کا کام دیا کرتا تھا۔

میرے بھائی! ملت کا یہ حشر کیا دل خون کرنے کے لئے کافی نہیں ہے؟ اس میں شک نہیں کہ ملت کی تباہی کے اسباب کی ایک طویل فہرست تیار کی جاسکتی ہے لیکن رومی اور اس کے برگزیدہ حلقہ بگوش اقبال نے سرفہرست اسی نام نہاد مولویت اور صوفیت کو رکھا ہے، انھی اکابرِ عرفاء کے ایک حقیر شارح ہونے کی سعادت مجھ کو حاصل ہو رہی ہے۔ میں نے بھی ادبارِ ملت کے اسباب میں انھی کو مقدم کیا ہے علاوہ اس ملت کی گذشتہ سات سو سالہ تاریخ کے مطالعہ کے گذشتہ نصف صدی میں

اکثر بلادِ اسلامیہ کے متعلق خود میرے اپنے ذاتی تجربے، مشاہدے اور شخصی معلومات اور ربط واتصال نے اس خیال کو زیادہ سے زیادہ تقویت دی اور اقبال اور رومی کے ہم نوا بنا دیا ہے۔ مملکت عثمانیہ کو انقلاب سے قبل بھی میں نے دیکھا ہے اور متضاد افکار و خیال کے ترکوں سے میں نے شخصی ربط پیدا کیا تھا۔ قاہرہ میں جب پہلی مرتبہ میں نے مصطفےٰ کمال کے انقلاب کی خبر پڑھی تو میں آپ کو کس طرح یقین دلاؤں کہ یہ چیز اوروں کے لئے تو یقیناً حیرت کا موجب بن سکتی تھی لیکن میرے لئے ہرگز نہیں۔ میں تو بعض دفعہ بیٹھا ہوا یہ سوچا کرتا تھا کہ یہ انقلاب اب تک کیوں نہ آیا۔

مصطفےٰ کمال کے انقلاب کے دوسرے رُخ یعنی مذہب و مملکت کی علیحدگی کی تحریک سے آج روئے زمین پر شاید ہی مجھ سے بڑھ کر کوئی دردمند ہو۔ یقیناً یہ ملت کش، روح قرآن کے مغائر اور خود زندگی کی بلند حقیقتوں کی معاند ایک تحریک تھی جس کو افغانی اور سعید حلیم کی فکر روشن میں کی رہنمائی اور اقبال کے مشورہ سے

بیا میزند چوں نورِ دو قندیل منیدیش افتراقِ ملک و دیں را

کے مطابق ایک طبعی، قدرتی اور فطری شکل دی جاتی تو نہ معلوم آج ملت اسلامیہ خودداری، خودآگاہی، عظمت واقتدار کے کن بلند مقامات پر پہنچ چکی ہوتی یہی ملت سیاست کے ان پیچیدہ اور گنجلک عقدوں کو جن کے حل سے آج انسانیت قاصر دکھائی دے رہی ہے، اپنے ناخن تدبیر سے حل کر دیتی۔ احیائے ملت اسلامیہ کے فرائض انجام دیتی اور اقوام عالم کی سیادت اور زعامت کے منصب تک خود کو پہنچا سکتی تھی۔ یہ نہ ہوا اور اس لئے نہ ہوا کہ قسطنطنیہ کے مولوی اور صوفی نے یہ نہ ہونے دیا۔ مصطفےٰ کمال نے غلطی کی اور اس لئے غلطی کی کہ مولوی اور صوفی نے اس کو اس غلطی پر مجبور کر دیا لیکن اس کے ساتھ مجھ کو تو اس اعلان اور تصریح میں بھی تامل نہیں کہ خدا کے نام پر شیطنت کی جڑیں مضبوط کرنے اور ابلیس کی گرم بازاری سے یہ کہیں بہتر ہے کہ ایک دفعہ خدا ہی کا انکار کر دیا جائے تو اس سے آدمی کم از کم لا کے درجہ میں آجاتا اور خود اس کی فطرت تھوڑی سی ٹھوکریں کھانے کے بعد اس کو الا کی طرف دھکیل دیتی،

در مقامِ لا نیاساید حیات سوئے الا می خرامد کائنات

جامعہ ازہر کے مولویوں اور جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی پیداوار، سعد زاغلول کی تحریک آزادی کے علمبرداروں سے ایک طویل عرصہ تک مجھ کو بہت ہی قریبی ربط اور تعلق رہا ہے، گو میں مصری نہ تھا لیکن فواد اول، شاہ مصر کے

آلۂ کاران مولویوں کے آئے دن اور ہر قدم پر تحریک آزادی کی راہ میں رکاوٹیں اور دشواریاں پیدا کرتے رہنے سے میرا دم گھٹا کرتا تھا اور آج میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنی زندگی میں سعد زاغلول کی اپنی مساعی کے ثمرات سے محرومی زیادہ تر نتیجہ تھی ان ہی مولویوں کی دسیسہ سازیوں کا۔ معزول شاہ فاروق کے ساتھ ان کی سازباز اور پرستاران پیرس میں رقص عریاں کے اس متوالے کو سادات بنی ہاشم کا ایک نجیب الطرفین سیدزادہ ثابت کرنے میں ان کی آپس میں مسابقت اب کوئی راز کی بات نہیں رہی۔ میں قاہرہ ہی میں تھا۔ ابھی معزول شاہ فاروق کی ولادت کا جشن منایا جا رہا تھا۔ شاہ فواد کی سرکاری قیام گاہ "قصر عابدین" بقعۂ نور بنی ہوئی تھی۔ مبارک سلامت کے شادیانے بج رہے تھے۔ تہنیت و تبریک میں جامعۂ ازہر کے یہی مولوی اور صوفی پیش پیش تھے لارڈ ایلنبی برطانیہ کے رزیڈنٹ مقیم قاہرہ کے دوش بدوش، شاہی عشائیہ کی ان گنت نعمتوں سے بلا خوفِ بدہضمی اپنے معدوں کو بھر رہے تھے اسی وقت اور اسی لمحہ مصر کی شاہراہیں اور گلی کوچے ایک دوسرا بہت ہی بھیانک منظر پیش کر رہے تھے، فاتح فلسطین، ایلنبی کی فوجیں نوجوان طلباء اور بوڑھے فدایان وطن کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنا رہی تھیں، کبوتروں کی طرح ان کو گرا رہی تھیں۔ ٹھیک اسی وقت سعد زاغلول کو گرفتار کرکے مالٹا میں نظربند کرنے کے لئے جہاز پر سوار کرایا جا رہا تھا۔ جنرل نجیب کے انقلاب نے کسی اور کو حیران و پریشان کیا ہو تو کیا ہو، میں تو اس لئے حیران ہوں کہ یہ انقلاب اتنی دیر سے کیوں آیا؟

آج ایران میں ڈاکٹر مصدق کے خلاف جو شورش برپا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور شاہ پرستی کے جس ناپاک جذبہ کو اشتعال دیا گیا ہے، اس کا سراغ آپ کو آیت اللہ کاشانی کی چار دیواری میں ملے گا۔

اس دوسری قسم کی مولویت اور صوفیت پر میں نے اپنی حقیر کوشش میں ضرور تنقید کی ہے۔ اس کا بھی مجھ کو اعتراف ہے کہ میری تنقید کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا ہے لیکن اس لہجہ سے بہرحال نرم اور ملائم ہے جو خود قرآن اور رومی اور اقبال نے استعمال کیا ہے۔ قرآن ان "قاسیۃ القلوب من ذکر اللہ" کو "ویل" کا مستحق قرار دیتا ہے اور "ضلال مبین" میں گرفتار کہتا ہے۔ یہ مجھ سے کیسے خواہش کی جا سکتی ہے کہ اس ضلال مبین سے احتراز پیدا کرنے کی بجائے کسی کے قلب میں اس کا کوئی شائبۂ ترغیب پیدا کر سکوں

اپنے فکر کی ان چند الجھنوں کو آپ سے تشاور فی الامر اور تبادلۂ فکر کے لئے پیش کر رہا ہوں اور متوقع ہوں کہ یہ "برہان" کے قیمتی صفحات پر، جن سے ہمیشہ "الحقیقۃ تنبت البحث" کا عملی ثبوت ملتا رہا ہے، گراں نہ گذریں گے۔ آپ کی گرامی تنقید کے متعلق کسی مناقشہ میں الجھ کر صحافت کی آزادی میں دخل انداز ہونا ہرگز مقصود نہیں ہے، مقصد صرف اس التباس فکری کو رفع کرنا ہے جو زیر بحث تالیف میں کسی ناتمام بحث کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہو۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ برہان کے قارئین کی کسی تعداد کو میری ان توضیحات کی روشنی میں آپ کے گرامی تبصرہ کو پڑھتے، کوئی رائے قائم کرنے اور اگر ممکن ہو تو مجھ کو مشورہ دینے کا موقع مل سکے گا

ندوۃ المصنفین کی تاریخی کتابیں

غلامانِ اسلام

اسّی سے زیادہ غلامانِ اسلام کے کمالات و فضائل اور کارناموں کا ایمان افروز بیان
قیمت عہ مجلد سے

تاریخ اسلام پر ایک نظر

نحو اسلام کے تمام ... کے ضروری حالات ... کی تفصیل ... یسی کے جدید ... نقاضوں کو سامنے رکھکر ... سلوب بیان نہایت ہی دل نشین۔ قیمت سے مجلد عہ

عرب اور اسلام

ڈاکٹر حتی کی مشہور و معروف کتاب کا آسان اور نفیس ترجمہ۔
قیمت بہ مجلد للعہ

قرونِ وسطیٰ کے مسلمانوں کی علمی خدمات

قرونِ وسطیٰ کے حکمائے اسلام سائنس دانوں اور فلاسفروں کے بے مثال علمی کارناموں کا بیان
قیمت جلد اول عہ جلد دوم عہ
غیر مجلد عہ ر ر

تاریخ اسلام آٹھ جلدوں میں

تھوڑے وقت میں تاریخ اسلام پڑھنے والوں کے لئے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ تاریخ ملت کے یہ تمام حصے مستند و معتبر بھی ہیں اور جامع و مکمل بھی طرزِ بیان نہایت شگفتہ و رواں ترتیب دل نشین

نبی عربی صلعم	خلافت راشدہ	خلافت بنی امیہ
قیمت عہ مجلد عہ	قیمت بہ مجلد عہ	قیمت بہ مجلد عہ
خلافت ہسپانیہ	خلافت عباسیہ جلد اول	خلافت عباسیہ جلد دوم
قیمت عہ مجلد عہ	قیمت عہ مجلد للعہ	قیمت للعہ مجلد صہ
تاریخ مصر و مغرب اقصیٰ	خلافت عثمانیہ	
قیمت بہ مجلد عہ	قیمت بہ مجلد عہ	

غیر مجلد مکمل سیٹ کی قیمت عہ
مجلد مکمل سیٹ کی قیمت عہ

مسلمانوں کا نظم مملکت

مسلمانوں کے نظم حکمرانی کی بصیرت افروز تاریخ جس میں مسلمانوں کے آئینِ جہانبانی کے تمام شعبوں کے متعلق نہایت صاف اور روشن معلومات دی گئی ہیں، یہ وقت کی ایک لائق مطالعہ کتاب ہے، اصل کتاب کے مصنف مصر کے مشہور فاضل اور جدید و قدیم علوم کے جامع نظر عالم ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن ایم اے پی ایچ ڈی ہیں اور ترجمہ ندوۃ المصنفین کی نگرانی میں کرایا گیا ہے۔
قیمت للعہ مجلد صہ

مسلمانوں کا عروج و زوال

جدید ایڈیشن (اپنے موضوع پر ایک اچھوتی کتاب)
جس میں خلافت راشدہ کے دور سے لے کر ہندوستان کے عہد حکمرانی تک مسلمانوں کے عروج و زوال کے اسباب کا مبصرانہ اور محققانہ تجزیہ کیا گیا ہے۔ قیمت للعہ مجلد صہ

تاریخ مشائخ چشت

سلسلۂ چشت کے صوفیہ کرام کا محققانہ تذکرہ اور ان کے مقتبس حیات نظام اصلاح و تربیت پر مدلل بحث قیمت لعہ مجلد عہ

فہرست کتب مفت طلب فرمایئے

مینجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

REGISTERED NO. D. 183

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ محسن خاص جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنان ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ محسنین جو حضرات پچیس روپئے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرۂ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلا کسی معاوضہ کے پیش کیا جاتا رہیگا۔

۳۔ معاونین:- جو حضرات اٹھارہ روپئے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات ادارہ اور رسالہ "برہان" (جس کا سالانہ چندہ چھ روپئے ہے) بلا قیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ احبّاء نو روپئے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احباء میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلا قیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دی جائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ برہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلا قیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپئے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپئے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا

ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

برہان

مرتب

سعید احمد اکبرآبادی

بُرہان

جلد نمبر ۳۰   شمارہ نمبر ۶

جون ۱۹۵۳ء مطابق رمضان المبارک و شوال المکرم ۱۳۷۲ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

کم و بیش دو سال سے اتر پردیش میں اردو کو علاقائی زبان تسلیم کرانے کے لئے دستخطوں کی جو مہم جاری تھی خوشی کی بات ہے کہ وہ آخر منزلِ مقصود پر پہنچ کر کامیابی کے ساتھ ختم ہوگئی یعنی بیس لاکھ دستخط حاصل کر لئے گئے اور اس سلسلہ میں جو ایک عارضی کمیٹی بنی تھی ۳۱ رمئی کو اسے بھی ختم کر دیا گیا اس میں شک نہیں کہ موجودہ حالات میں اردو کے لئے بیس لاکھ دستخط فراہم کرلینا کوئی معمولی بات نہیں ہے جن مخلص کارکنوں اور زبان کے شیدائیوں نے اس تحریک کو کامیاب بنانے میں عملاً حصہ لیا ہے وہ سب قدر دانانِ اردو کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔ کہ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔

اگست ۱۹۴۹ء میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ہندوستان میں زبان کے مسئلہ کی نسبت اپنی پالیسی کا جو اعلان کیا تھا اس میں صاف صاف یہ کہہ دیا گیا تھا کہ اگرچہ ہندی کی جواب نیشنل زبان بن گئی ہے حوصلہ افزائی ہونی چاہئے لیکن جو اور صوبائی یا علاقائی زبانیں ہیں ان کے علاقوں میں ان کی بھی اسی طرح حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔ پرائمری تعلیم طلباء کو ان کی مادری زبان میں ہی دی جانی چاہئے اور اگر کسی جگہ کئی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں تو وہاں کی حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ ہر زبان کے ذریعہ تعلیم کا بندوبست کرے۔ بشرطیکہ اس زبان کے لڑکوں کی تعداد معقول ہو اسی اعلان میں مزید برآں یہ بھی کہا گیا تھا کہ ملک کے دستور میں ہندوستان کی بڑی زبانوں کی ایک فہرست ضمیمہ ہشتم میں دے دی گئی ہے ان زبانوں میں سے ایک اردو بھی ہے اور کمیٹی کو اس بات کا پورا یقین ہے کہ اردو کو اس کا مقام جس کی وہ مستحق ہے ضرور دیا جائے گا اس بیان میں آگے چل کر کہا گیا ہے کہ اس کو لازماً یاد رکھنا چاہئے کہ اردو ہندوستان کی زبان ہے جو یہیں پیدا

ہوئی اور پلی بڑھی اور جس کو ہندوستان میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد بولتی اور لکھتی ہے۔

کانگرس ورکنگ کمیٹی نے زبان سے متعلق اپنی پالیسی کا یہ اعلان اپنے جلسہ ۵ ر اگست ۱۹۴۹ء میں کیا تھا۔ لیکن گذشتہ چار سال میں اس کو یہ معلوم ہوا کہ اردو کے ساتھ بعض صوبائی حکومتیں اور بعض ادارے انصاف کا معاملہ نہیں کر رہے ہیں اس بناء پر اس نے اپنا فرض سمجھا کہ گذشتہ ماہ مئی کی ۱۷ر تاریخ کو ورکنگ کمیٹی کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں پھر اپنے ۱۹۴۹ء والے بیان اور زبان کی نسبت اپنی پالیسی کا اعادہ کرے۔ چنانچہ اس نے کیا اور صوبائی حکومتوں کو خاص طور پر متوجہ کیا کہ وہ زبان کی نسبت کانگرس کی سوچی سمجھی اور خوب اچھی طرح سے غور کی ہوئی پالیسی کا احترام کریں اور اس پر عمل کریں اس کی تائید وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو جناب موصوف نے ۱۷ر مئی کی پاس شدہ چند تجاویز کی وضاحت کی غرض سے دیا تھا۔ مولانا نے اس میں صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ ۱۷ر مئی کی ورکنگ کمیٹی کے جلسہ میں ۵ر اگست ۱۹۴۹ء والے زبان سے متعلق رزولیوشن کے اعادہ کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بعض ریاستی حکومتیں اور بعض ادارے اس پر عمل نہیں کر رہے تھے۔ اس بنا پر کانگرس ورکنگ کمیٹی نے ضروری خیال کیا کہ وہ ان حکومتوں کو اپنا ۱۹۴۹ء والا رزولیوشن پھر یاد دلائے اور ان پر زور دیا جائے کہ وہ اس پر عمل بھی کریں۔

بہرحال ایک طرف اردو کے لئے بیس لاکھ دستخطوں کی مہم کا کامیابی کے ساتھ سر انجام پانا اور دوسری طرف انھیں دنوں اور اسی مہینہ میں کانگرس ورکنگ کمیٹی کا زبان کی نسبت اپنی پالیسی کا پھر پر زور الفاظ میں اعادہ کرنا اور اس کے فوراً بعد ہی وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کا اس کی وضاحت میں بیان دینا اور اس میں بعض صوبائی حکومتوں کی کوتاہیوں کا پردہ فاش کرنا۔ یہ سب چیزیں اردو کے حق میں فال نیک اور اچھی علامتیں ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ

اس مشیت کی خبر کیا نکلتی ہے !! شعر

دیکھئے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض　　اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

یہ محضر نامہ جناب صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اور اس کے نتیجے دو ہی ہو سکتے ہیں جناب صدر صاحب اس کو شرف قبول و پذیرائی عطا فرمائیں اور ایک آرڈیننس کے ذریعہ اتر پردیش میں علاقائی زبان ہونے کا اعلان کر دیں یا دریا یہ محضر نامہ درخور قبول ہی قرار نہ پائے۔ ان دونوں صورتوں میں اردو کا کام محض دستخطوں کی فراہمی کے بعد ختم نہیں ہوتا بلکہ اور بڑھ جاتا ہے قدرتی طور پر اب دنیا یہ معلوم کرنا چاہے گی کہ جس زبان کے لئے صرف ایک صوبہ ہی کے اندر بیس لاکھ انسانوں نے دستخط کر دیئے ہوں انھوں نے اس زبان کی حفاظت و بقا کے لئے بھی کچھ کیا یا صرف دستخط کر دینا ہی ان کے کلیۂ جوش عمل کی سب سے بڑی پونجی تھا۔

ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں اور اب پھر لکھتے ہیں کہ اصل ضرورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اردو کی تعلیم کے لئے مکاتب کھولے جائیں جن میں بنیادی تعلیم کے ماہر اساتذہ کام کریں تاکہ وہ پڑھنے والوں میں زبان کے ساتھ دلچسپی اور اس کا شوق بھی پیدا کر سکیں۔ علاوہ بریں اردو کی گشتی لائبریری اور گشتی دار المطالعہ کا قریہ بہ قریہ۔ محلہ بہ محلہ انتظام ہونا چاہئے اردو اخبارات و رسائل اور اردو مصنفین و مولفین کی ہمت افزائی کا بندوبست ہونا چاہئے۔ اردو کلاسکی ادب کی جو کتابیں معدوم ہوتی جا رہی ہیں ان کی از سر نو دیدہ زیب طباعت و اشاعت ہونی چاہئے یونیورسٹیوں میں جو لڑکے یا لڑکیاں اردو میں ایم۔ اے کریں۔ ان کے لئے وظائف اور جو امتیازی امتحان پاس کرلیں ان کے واسطے طلائی تمغہ وغیرہ کا بندوبست ہونا چاہئے اردو کو خود اس کے مخالفوں کی طرف سے اتنا خطرہ نہیں ہے جتنا کہ خود اردو کے نام لیواؤں کی طرف سے ہے اور ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کا سروسامان اور انتظام و اہتمام انجمن ترقی اردو کو کرنا چاہئے!

قاضی شُرَیح

از

جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق
(ایم۔اے۔پی۔ایچ۔ڈی پروفیسر دلی کالج)

(۲)

حضرت علیؓ کے عہد میں شُرَیح سے متعلق دو واقعات ملتے ہیں جن سے شریح کی سیرت کی مضبوطی اور حضرت علیؓ کے تشدد پر نہایت صاف روشنی پڑتی ہے پہلا واقعہ جنگِ صفین (۳۷ھ) سے پہلے اور جنگ جمل (۳۶ھ) کے بعد کے زمانہ سے تعلق رکھتا ہے۔ حضرت علیؓ کی زرہ بکتر کہیں گرگئی تھی ایک دن انھوں نے اس کو کسی یہودی کے پاس دیکھا اور پہچان کر بولے: "یہ میری ہے فلاں فلاں دن کھو گئی تھی"۔ یہودی نے دینے سے انکار کیا اور کہا: "یہ میری ملکیت ہے، آیئے اس قضیئے کو مسلمانوں کے قاضی کے سامنے پیش کریں"۔ دونوں شریح کی مجلس میں پہنچے۔ شریح امیر المومنین کو دیکھ کر بطور احترام کھڑے ہوئے جب سب بیٹھ گئے تو حضرت علیؓ نے کہا: "یہ زرہ بکتر جو اس یہودی کے پاس ہے میری ہے میں نے پہچان لی ہے"۔ شریح نے مدعی کا دعوی سن کر مدعی علیہ کا بیان مانگا۔ یہودی نے کہا زرہ بکتر میری ہے میں اس کا مالک ہوں"۔ شریح نے حضرت علیؓ کو مخاطب کرکے کہا: "امیر المومنین آپ سچ فرماتے ہیں یہ زرہ بکتر آپ کی ہوگی لیکن ضروری ہے کہ آپ دو گواہ پیش کریں حضرت علیؓ نے اپنے غلام قنبر اور لڑکے حسنؓ کو پیش کیا جنھوں نے حضرت علیؓ کے حق میں شہادت دی شریح نے قنبر کی شہادت مان لی لیکن حسنؓ کی ماننے سے انکار کیا ؏

؏ ابن عساکر تاریخ دمشق (مصر) ۶/۳۰۵ پر لکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے لڑکے کی شہادت باپ کے حق میں نامقبول قرار دی تھی اور شریح کا فعل خود حضرت علیؓ کی رائے کے مطابق تھا۔

حضرت علیؓ بہت برہم ہوئے اور بولے "رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ حسنؓ اور حسینؓ جنت کے جوانوں کے امام ہیں اور تم ان میں سے ایک کی شہادت ماننے سے انکار کرتے ہو یہاں سے نکل جاؤ اور بانقیاء جاکر چالیس دن وہاں کے لوگوں کے درمیان انصاف کرو" تاہم شریح کا فیصلہ بحال رکھا گیا یہودی اس عمدہ فعل سے متاثر ہو کر بولا: امیرالمومنین آپ میرے ساتھ اپنے قاضی کی خدمت میں حاضر ہوتے اور جب انھوں نے آپ کے خلاف فیصلہ کیا تو آپ نے فیصلہ مان لیا! آپ نے سچ کہا یہ زرہ بکتر آپ کی ہے فلاں فلاں دن جب آپؐ خاکستری اونٹ پر سوار تھے یہ گر گئی تھی اور میں نے اٹھالی تھی، میں اسلام قبول کرتا ہوں؛ حضرت علیؓ نے زرہ بکتر کے علاوہ اس کو گھوڑا دیا اور ۹۰۰ درہم سالانہ وظیفہ مقرر کرکے فوج میں بھرتی کرلیا۔[1]

شریح چالیس دن تک بانقیاء میں جلا وطن رہ کر لوٹ آئے۔ رہا یہ کہ انھوں نے وہاں حضرت علیؓ کے حکم کے بموجب یہودیوں کے درمیان قاضی کے فرائض انجام دئے یا نہیں تو قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں کیا۔ اس کی تائید ابن سعد کی اس روایت سے ہوتی ہے کہ "جب شریح جزیہ کے علاقہ میں جاتے تو فیصلے نہیں کرتے تھے"، بانقیاء کوفہ کے قریب ایک گاؤں تھا جہاں کی اکثر آبادی یہودی تھی جس سے جزیہ لیا جاتا تھا۔[2]

دوسرا واقعہ نہج البلاغہ کے شارح ابن ابی الحدید نے نقل کیا ہے: شریح نے اسی دینار میں ایک مکان خریدا۔ اس کی خبر حضرت علیؓ کو ہوئی تو وہ ناراض ہوئے اور شریح کو بلا کر کہا: "مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے اسی دینار (آجکل ایک دینار تیرہ روپئے سے کچھ زیادہ ہوتا ہے اس وقت غالباً پانچ روپئے کے بقدر تھا) میں مکان خریدا ہے، اور اس کی خریداری کا سرخط لکھا ہے جس پر گواہوں کی شہادت ہے": شریح نے کہا جی ہاں ایسا ہوا ہے" حضرت علی تیکھی نظروں سے دیکھ کر بولے: شریح کیا تمہارے پاس وہ شخص

---

[1] اغانی ۱۶/۴۴ [2] طبقات ۶/۹۳

آنے والا نہیں جو نہ تمہارے سروں کو دیکھے گا نہ تمہارے گواہوں کو پوچھے گا اور تم کو گھر سے نکال کر لے جائے گا اور قبر کے سپرد کردے گا جہاں سے تم کبھی واپس نہ آسکو گے شریح غور کرو کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ مکان تم نے ایسے روپئے سے خریدا ہو جو تمہارا نہیں یا تم نے روپیہ ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہو ایسی صورت میں تو یقیناً دنیا اور آخرت دونوں میں تم نقصان اٹھاؤ گے۔ اگر تم مکان خریدتے وقت میرے پاس آتے تو میں تمہارے لئے ایک سرخط لکھتا جس کی عبارت یہ ہوتی، اس وقت تم اس گھر کو ایک درہم میں بھی خریدنے کا خیال دل میں نہ لاتے: "یہ وہ گھر ہے جو ایک عبد ذلیل نے ایسے شخص سے خریدا ہے جو موت کے خیال سے کانپتا ہے یہ گھر دار غرور کا ایک گھر ہے، فانیوں اور ہلاک ہونے والوں کے علاقہ میں آباد ہے اس گھر کی چار حدیں ہیں، پہلی حد دواعی آفات سے ملتی ہے، دوسری دواعی مصائب سے، تیسری مہلک ھوٰی اور چوتھی گمراہ کن شیطان سے اور اسی طرف اس کا دروازہ کھلتا ہے ایک فریب خوردۂ آرزو نے موت کے تصور سے کانپنے والے ایک شخص سے یہ گھر خریدا ہے، قناعت کی عزت سے نکل کر، خواہش و دنائت کی ذلت میں داخل ہو کر . . . [1]

قارئین کو شاید معلوم ہوگا کہ رضی (متوفی ۴۰۶ھ) کی نہج البلاغۃ کا شمار عربی کی موضوع کتابوں میں ہوتا ہے اگر سب نہیں تو اس کے بہت سے خطوط یقیناً موضوع محرّف اور بدلے ہوئے ہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ واقعہ بھی موضوع ہو لیکن اس کا احتمال ہے بہر حال اس قصے سے حضرت علیؓ کا غیر معتدل تشدد ظاہر ہوتا ہے اگر کوئی شخص حدِ اعتدال میں رہ کر رہائش کے لئے مکان بنوائے یا خریدے تو اس کو فریب خوردۂ دنیا یا آخرت سے بے پروا نہیں کہا جاسکتا نہ اس کا زہد مطعون ہو سکتا ہے کیونکہ زہد ترکِ دنیا نہیں بلکہ دنیا کو برتتے ہوئے اس سے ذہنی بے رغبتی اور اس سے لگاؤ کو خدا کی رضاجوئی کے تابع رکھنے

---

[1] شرح نہج البلاغۃ ۳/۱۶۰

کا نام ہے۔ زہد کی اس تعریف ہی سے وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا اور لِنَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا، کا مطلب واضح ہوتا ہے۔ اگر گھر کی ملکیت زہد کے منافی ہوتو نہ رسول اللہ مکان کے مالک ہوتے نہ صحابہ حالانکہ متعدد صحابہ تو غیر معتدل حد تک املاک اور نقد روپئے کے مالک تھے، ان میں حضرت عثمانؓ، طلحہؓ، زبیرؓ، سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت علیؓ کے خاندان کے نام بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا یہ قول کہ شریح غور کرو کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ مکان تم نے اپنے روپئے سے خریدا ہو جو تمہارا نہیں یا تم نے روپیہ ناجائز طریقہ سے حاصل کیا ہو" شریح کی دیانت کو کسی قدر مشتبہ کرتا ہے۔ ابن سعد نے ابو لیلیٰ کی سند سے لکھا ہے کہ شریح کی تنخواہ حضرت علیؓ کے زمانہ میں ۵۰۰ درہم تھی[1] جو اس عہد کے شرح تبادلہ سے تقریباً ۵۰ دینار کے مساوی ہوتی ہے، اتنی تنخواہ پانے والے کے لئے اسّی دینار کا مکان خریدنا کوئی مشکل بات نہ تھی اس کے علاوہ شریح کی سیرت میں رچی ہوئی خدا ترسی کا جو ریکارڈ ہمارے سامنے ہے اس سے جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے ایسے شبہوں کا شائبہ تک نہیں پیدا ہوتا۔

حضرت علیؓ کے بعد جب معاویہ کے عہدِ خلافت (۴۱ھ تا ۶۰ھ) میں زیاد بصرہ اور کوفہ کا گورنر تھا (۵۰ھ تا ۵۳ھ) شریح کی چند جھلکیاں پھر نظر آتی ہیں، یہ وہ زیاد ہے جس کو ایک عرصہ تک غلام ماں باپ کا لڑکا سمجھا جاتا تھا، اس کی ماں تو بالاتفاق غلام تھی لیکن باپ کے بارے میں دو رائیں تھیں ایک یہ کہ وہ عُبَید نامی غلام تھا دوسرے یہ کہ وہ معاویہ کا والد ابوسفیان تھا، زیاد چودہ سال کی عمر سے بصرہ میں کلرک، سکریٹری اور منتظم مالیات کے فرائض انجام دے کر ۳۹ھ میں حضرت علیؓ کی طرف سے باغی صوبہ فارس کا گورنر مقرر ہوا تھا ۴۴ھ میں معاویہ نے متعدد ثقہ شہادتوں کے پیشِ نظر ایک پبلک جلسہ میں اس کو اپنا بھائی تسلیم کیا اور اس کی غیر معمولی لیاقت انتظام و تدبر سیاست سے متاثر ہو کر ۴۵ھ میں بصرہ کا گورنر مقرر کیا

---

[1] ملاحظہ ہو مروج الذہب [2] طبقات ۶/۹۵

سنہ ۵۰ھ میں کوفہ کے گورنر مغیرہ بن شعبہ کی وفات پر اس کو کوفہ کی حکومت بھی سونپ دی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں کئی بار زیاد کا امتحان لیا تھا اور اس کی قرآنی و فقہی لیاقت سے اتنے متاثر ہوتے تھے کہ بصرہ کے اعیان کو اس کے مشوروں اور فیصلوں پر عمل کرنے کی ہدایت کی تھی۔

سنہ ۵۰ھ میں جب اس کو بصرہ کے ساتھ کوفہ کی گورنری دی گئی تو وہ چھ ماہ بصرہ میں قیام کرتا اور چھ ماہ کوفہ میں۔ گورنر ہو کر جب وہ کوفہ آیا تو شریح کی ججی کا ہر طرف شہرہ تھا ایسا قابل اور راستباز جج پا کر وہ بہت خوش ہوا۔ بصرہ میں جہاں وہ ۴۵ھ سے گورنر تھا اس کو کامیاب جج نہیں ملے تھے اور اس وقت تک کئی جج بدلے جا چکے تھے۔ بصرہ کی آبادی کوفہ سے زیادہ تھی اور وہاں کے انصافی مسائل کے لئے ہمیشہ لایق جج کی ضرورت رہتی تھی لیکن کوفہ کو بھی شریح کے بغیر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا تاہم وہ اہل بصرہ کو ان کی سیرت اور راستباز عقل کے جوہر دکھانا ضروری سمجھتا تھا چنانچہ وہ ان کو ساتھ لے کر بصرہ آیا اور ان کی جگہ ابن مسعود کے حلقہ کے ایک فاضل کو جن کا نام مسروق بن اجدع تھا ان کا جانشین مقرر کیا۔

مصنف عقد الفرید ۳/۲۲۷ (مصر ایڈیشن) لکھتا ہے کہ بصرہ آ کر زیاد شریح کے ساتھ مجلس قضا میں بیٹھتا اور کہتا: اگر میں ایسا فیصلہ کروں جو آپ کی رائے میں قرین انصاف نہ ہو تو مجھے مطلع کیجئے گا۔ لیکن شریح کو اس سے اختلاف کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی ایک دن جماعت انصار کا ایک شخص آیا اور کہا: میں بصرہ اس وقت آیا تھا جب مکانات بنانے کے لئے حکومت کی طرف سے دی ہوئی زمینیں موجود تھیں چنانچہ ایک قطعہ زمین پر میں نے مکان بنانا چاہا میرے چچازاد بھائی پہلے سے مکان بنا کر آباد ہو چکے تھے: انھوں نے کہا تم کہاں الگ رہو گے، ہمارے پاس ہی مکان بنا لو، انھوں نے مجھے زمین دے دی اور میں نے مکان بنا لیا اور شادی کر لی۔ پھر شیطان نے ہمارے درمیان پھوٹ ڈالی اور انھوں نے مجھ سے کہا کہ نکل جاؤ: یہ سن کر زیاد نے مدعی علیہم کو مخاطب کر تے ہوئے فیصلہ دیا۔ تم

کو نکالنے کا حق نہیں ہے جب خالی زمینیں موجود تھیں تم نے اس کو الگ مکان بنانے سے باز رکھا، تمہارے پاس ضرورت سے زیادہ زمین تھی وہ تم نے دے دی، اب جب کہ زمینیں ختم ہو چکیں تم اس کو نکالتے ہو اور نقصان پہنچانا چاہتے ہو، وہ گھر نہیں چھوڑے گا: شریح نے اس فیصلہ سے اختلاف کرتے ہوئے کہا یا مستعیر القِدْرِ اُرْدُدْ (ہانڈی مستعار لینے والے ہانڈی لوٹا دے) یعنی زمین کا معاملہ اس ہانڈی کا سا ہے جو مستعار لی گئی ہو اور جس کا لوٹانا واجب ہو، زیاد نے شریح کے اس قیاس کو غالباً قیاس مع الفارق سمجھ کر منظور نہیں کیا اور اپنا فیصلہ بحال رکھا۔ ان فیصلوں پر ابن سیرین (متوفی ۱۱۰ھ) جو شریح کے ہم عصر اور بصرہ کے ممتاز مفتی تھے تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں: "فیصلہ وہی ہے جو شریح نے کیا لیکن زیاد کا قول مستحسن ہے۔

شریح زیادہ عرصہ اپنے مستقر سے الگ نہ رہ سکے، ایک سال بعد ہی ان کو لوٹنا پڑا ابن زیاد بحوالہ مصنف طبقات ۶/۹۵ کہتے ہیں: "زیاد شریح کو لے کر بصرہ سے آیا اور انھوں نے ایک سال تک ہمارے درمیان ایسا انصاف کیا جیسا ان سے پہلے یا بعد کسی نے نہیں کیا۔" اصابہ میں ایک دوسری سند پر بالکل یہی روایت پیش کی گئی ہے اصابہ کی ایک دوسری روایت کے مطابق شریح سات سال تک بصرہ کے قاضی رہے، لیکن اس کی صحت پایۂ تحقیق کو نہیں پہنچ سکی ہے۔

زیاد کا ۵۳ھ میں انتقال ہوا جب وہ اپنے گرمی کے مستقر کوفہ میں تھا۔ اس کی انگلی میں ایک زہریلی پھنسی نکل آئی تھی جس کو کاٹنے کا طبیبوں نے مشورہ دیا تھا۔ زیاد نے استصواب رائے کے لئے اپنے معزز اور مخلص قاضی شریح کو بلایا، انھوں نے جس دل میں کھٹکنے والے انداز سے مشورہ دیا وہ سننے کے لائق ہے: "مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کا رزق انگلی میں ہو اور اس کا اثر دل تک پہنچے اور آپ کی موت کا وقت آگیا ہو اور آپ انگلی کٹے خدا کے حضور میں جائیں اور انگلی آپ نے خدا کی ملاقات سے بچنے کی خاطر کٹوائی ہو یا بصورت دیگر آپ کی موت کا

وقت نہ آیا ہو اور انگلی کٹوا چکے ہوں اور بقیہ عمر بغیر انگلی کے زندہ رہیں اور آپ کے بچوں کو اس کا طعنہ دیا جائے" اس صاف مشورہ سے زیاد کے دل کا تردد دور ہوا اور انگلی کٹوانے کا ارادہ اس نے ترک کر دیا۔ جب شریح محل سے باہر نکلے تو زیاد کے بعض بدخواہوں نے ان کا مشورہ معلوم کر کے ملامت کی اور کہا: "آپ نے انگلی کٹوانے کا مشورہ کیوں نہیں دیا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر زیاد آپریشن کرا لیتا تو بچ جاتا اور طبعی موت مرتا اور پھنسی سے مرنے کی صورت میں اس کو شہادت کا درجہ حاصل ہوتا جو انھیں گوارا نہ تھا۔ شریح کی خداترسی بدخواہی کی متحمل کیسے ہوتی ان کا مختصر مگر جامع جواب تھا: المستشار مُؤتَمَنٌ، یعنی جس شخص پر بھروسہ کر کے مشورہ کیا جائے اس کو سزاوار نہیں کہ غلط مشورہ دے[1]۔

سنہ ۶۰ھ میں شریح کی ایک ہلکی سی جھلک پھر نظر آتی ہے۔ سنہ ۶۰ھ میں معاویہ کی موت اور یزید کی خلافت پر کوفہ میں بڑی شدت سے حضرت حسین کی خلافت کی تحریک اٹھی شیعوں کے وفدان کے پاس مدینہ جانے لگے اور وفاداری وجاں نثاری کے عہد و پیمان سے مملو اتنے خط شیعہ لیڈروں کے ان کے پاس آئے کہ دو تھیلے بھر گئے۔ حضرت حسینؓ اہل کوفہ کی اس بدعہدی کو نہیں بھولے تھے جس سے وہ ان کے والد اور بھائی کے ساتھ پیش آئے تھے اس لئے انھوں نے شیعوں کی وفاداری پرکھنا ضروری سمجھا اور اس مقصد کے لئے اپنے چچازاد بھائی مسلم بن عقیل کو کوفہ بھیجا۔ مسلم مختار ابن ابی عبید (متوفی سنہ ۶۷ھ) کے گھر ٹھہرے اور حضرت حسین کے لئے بیعت لینا شروع کی جلد ہی بارہ ہزار شیعوں نے بیعت کر لی۔

یزید کو اس انقلابی تحریک کا جب علم ہوا تو اس نے کوفہ کے موجودہ گورنر نعمان بن بشیر انصاری کو جو اٹھتے ہوئے طوفان کا مقابلہ نہ کر سکے تھے ہٹا کر بصرہ کے گورنر عبید اللہ ابن زیاد کو کوفہ کی امارت بھی سونپ دی، عبید اللہ مستعد حاکم تھا، وہ ڈاک کے گھوڑوں سے کوفہ آیا اور بغاوت کو دبانے میں لگ گیا۔

---

[1] طبری ج ۷ ص ۱۴۲

عبیداللہ شیعی عرب سردار ہانی بن عروہ اور ایک دوسرے مقتدر لیڈر شریک بن اعور کی بڑی عزت کرتا تھا، شریک بصرہ سے اس کے ساتھ آیا تھا وہ بظاہر عبیداللہ کا بہی خواہ لیکن دل میں اس کا دشمن اور اہل بیت کا دوست تھا، کوفہ آکر وہ ھانی کے گھر فروکش ہوا جہاں مختار کا غیر محفوظ گھر چھوڑ کر مسلم پہلے ہی پناہ لے چکے تھے، یہاں وہ بیمار پڑا اور عبیداللہ نے اس کی عیادت کرنا چاہی۔ شریک نے یہ موقع غنیمت جانا اور مسلم کو عبیداللہ کے دوران عیادت میں قتل کرنے پر ہموار کرلیا۔ عبیداللہ آیا اور شریک کی مزاج پرسی کرتا رہا لیکن مسلم نے حملہ نہیں کیا۔ تب شریک نے ایسے زمزیہ الفاظ نکالے جن سے عبیداللہ کے اردلی کو شبہ ہوا اور اس نے عبیداللہ کو اٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ بخیریت محل لوٹ آیا اس کا ایک جاسوس شیعوں کے بھیس میں چھوٹا ہوا تھا، اس نے مسلم کی قیامگاہ اور ان کی جنگی تیاریوں کا مکمل پتہ چلالیا، شریک تیسرے دن مرگیا عبیداللہ کو ہانی کی غداری پر بہت غصہ آیا۔ اس نے ہانی کو بلایا اور گو ہانی نے بہانے بنائے اور بالآخران کو آنا ہی پڑا، عبیداللہ کی مجلس میں اس وقت شریح موجود تھے، ہانی کو مخاطب کرکے عبیداللہ نے کہا؛ تمہیں معلوم ہے میرے والد نے کوفہ آکر تمہارے اور حجر بن عدی کے سوا سارے سرغنہ شیعوں کو قتل کرادیا تھا، پھر حجر کا جو حشر ہوا وہ بھی تم کو معلوم ہے، اس کے قتل کے بعد وہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رواداری اور حسن سلوک سے پیش آتے رہے۔ ...... اس کا تم نے مجھے یہ صلہ دیا کہ اپنے گھر میں ایک شخص کو مجھے قتل کرنے کے لئے چھپالیا ہے" ہانی نے اس کی تردید کی۔ عبیداللہ نے اس جاسوس کو بلایا جو شیعوں کے بھیس میں ہانی کے گھر میں ہونے والی جنگی تیاریوں اور مسلم کے قیام سے واقف تھا۔ اس کو دیکھ کر ہانی کے ہاتھوں کے طوطے اڑگئے۔ تاہم اس نے معذرت کی اور عبیداللہ کو یقین دلایا کہ اس نے جو کیا مجبوری کے تحت کیا پھر ان کی گفتگو نے درشتی کا پہلو اختیار کیا (جس کی تفصیل طبری میں دیکھئے) اور ہانی نے سرکشی کی باتیں کیں جن سے عبیداللہ اتنا برہم ہوا کہ اس نے ہانی کے منہ پر خوب چھڑیاں ماریں جن سے وہ لہولہان ہوگیا۔ پھر اس

کو محل کے ایک کمرہ میں مقید کر دیا گیا۔ منٹوں میں ہانی کے قبیلہ مَذحج میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ ہانی قتل کر دیئے گئے اور وہاں کے جوان بپھرے ہوئے محل کی دیوار تلے جمع ہو کر شور و غوغا مچانے لگے۔ اس موقع پر شریح سے زیادہ موزوں آدمی اس شورش کو فرو کرنے کے لئے نہیں تھا کیونکہ ان پر سب بھروسہ کرتے تھے۔ پولیس کے چند سپاہیوں کو ان کے ہمراہ کر کے عبید اللہ نے کہا "آپ ہانی کو دیکھئے اور پھر لوگوں کو اطمینان دلا دیجئے کہ وہ زندہ ہے۔ شریح کو دیکھ کر ہانی نے کہا:" آپ میرے قبیلے کے لوگوں سے کہہ دیجئے کہ ساتھ لے جائیں ورنہ عبید اللہ مجھے قتل کر دے گا" شریح لوٹ کر عبید اللہ کے پاس گئے اور کہا وہ زندہ تو ہے لیکن اس کے زخم بہت کاری ہیں۔ عبید اللہ نے تیور بدل کر کہا: کیا آپ کو یہ بات ناپسند ہے کہ حاکم اپنی رعیت کو سزا دے، جائیے لوگوں کو مطلع کیجئے" شریح اس نازک مشن سے اس طرح عہدہ برآ ہوئے کہ ایک لفظ جھوٹا ان کی زبان سے نہ نکلا۔ انھوں نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ یہ بیہودہ خوف و ہراس کیسا، ہانی زندہ ہیں، حاکم نے ان کو مار کی سزا دی ہے جس سے وہ مرے نہیں ہیں لہذا آپ لوگ لوٹ جائیے اور اپنی شوریدہ سری سے خود کو اور اپنے سردار کو خطرہ میں نہ ڈالیے[1] لوگ شریح کا یہ اعلان سن کر لوٹ گئے۔

سنہ ۶۴ھ میں یزید بن معاویہ کا جب انتقال ہوا تو عبید اللہ بن زیاد کوفہ اور بصرہ کا گورنر تھا اس وقت اس کا قیام بصرہ میں تھا وہاں کے لوگوں نے نئے خلیفہ کے گورنر کے تقرر تک اس کو حاکم تسلیم کر کے اس کی بیعت کر لی تھی جس کو انھوں نے بہت جلد توڑا اور عبید اللہ کی اتنی مخالفت بڑھی کہ اس کو بصرہ سے بھاگنا پڑا۔ اہل بصرہ کی بیعت کے بعد اس نے ایک وفد کوفہ بھیجا اور وہاں کے لوگوں کو بھی نئے خلیفہ کے نمائندے تک اپنی بیعت کی طرف مائل کیا لیکن وہ نہ صرف یہ کہ تیار نہیں ہوئے بلکہ اس کے جانشین گورنر کو بھی نکال دیا۔ شام میں یزید کا لڑکا معاویہ خلیفہ ہوا، مکہ میں پہلے ہی ابن زبیر اپنی خلافت کا اعلان کر چکے تھے۔

---

[1] طبری ج ۶ ص ۲۰۴

لیکن بصرہ اور کوفہ کے لئے ان دونوں میں سے کسی کے گورنر مقرر نہیں ہوئے تھے اس لئے یہاں کا امن و امان سخت خطرہ میں تھا۔ مرکزِ خلافت کے نمائندہ کے تقرر تک کوفہ کے ارباب رائے نے عارضی طور پر عامر بن مسعود کو نماز جماعت کا امام تسلیم کر لیا تھا[1]۔ اس حالت میں جب کہ شہر سے باقاعدہ حکومت اٹھ چکی تھی اور سیاسی مطلع ابر آلود تھا شریح منصبِ قضا سے دست بردار ہو گئے اور تقریباً دو سال تک رہے یعنی ۶۴ھ سے ۶۵ھ تک۔

۶۶ھ میں وہ پھر قضائے کوفہ کے افق پر ذرا دیر کے لئے ابھرتے ہیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مختار بن ابی عُبید اہل بیت کے نمائندہ اور مظلوموں کے مددگار کی حیثیت سے ابن زبیر کے گورنر کو نکال کر کوفہ پر قابض ہوا اور خاص و عام کو خوش کر کے ایک مرکزی حکومت قائم کی اول اول وہ صبح شام خود مجلسِ قضا میں بیٹھ کر فیصلے کرتا لیکن حکومت کی بڑھتی ہوئی مصروفیتوں نے جلد ہی اس کو اس کام کے چھوڑنے پر مجبور کیا اور منصبِ قضا شریح کے سپرد کر دیا گیا، شریح نے شاید بادلِ ناخواستہ اس کو قبول کیا کیونکہ ماحول حزبیت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا، شیعیت پہلی بار فتح پا کر آپے سے باہر تھی کچھ ہی دن گذرے تھے کہ ان پر اعتراض ہونے لگا کہ وہ (۱) عثمانی ہیں۔

(۲) انھوں نے حُجر بن عدی کے خلاف شہادت دی تھی (۵۳ھ میں جب حجر نے کوفہ میں بغاوت کر کے حکومت الٹنا چاہی تھی۔

(۳) انھوں نے ھانی بن عُروہ کا پیغام نہیں پہنچایا تھا،

(۴) ان کو حضرت علیؓ نے معزول کر دیا تھا (یہ اشارہ ہے ان کی چالیس دن تک بانقیا میں جلاوطنی کی طرف) شریح نے اپنی روح اور جسم کی سلامتی کنارہ کشی میں دیکھی اور گھر بیٹھ رہے مختار نے ان کی جگہ ابن مسعود کے پوتے عبداللہ کو قاضی مقرر کیا[2]۔

اس کنارہ کشی کا خاتمہ حسب تصریح طبری ۶۶ھ میں ہوا غالباً دو سال بعد ان کو

---

[1] طبری ۷/۴/۲ [2] طبری ۲/۶۳۵

سالوں میں اٹھارہ ماہ مختار کے دورِ اقبال اور شاید چھ ماہ کے لگ بھگ مصعب بن زبیر کی ولایتِ عراق (بصرہ وکوفہ) کے شامل ہیں۔ مصعب نے اپنے بھائی ابن زبیر کی طرف سے مختار کو شکست دے کر رمضان ۶۷ھ میں کوفہ پر قبضہ کیا تھا۔ ۶۸ھ سے ۶۹ھ تک جب انھوں نے استعفیٰ دیا ایسا معلوم ہوتا ہے وہ مسلسل قاضی رہے۔ طبری نے شریح کی کنارہ کشی جن سالوں میں پیش کی ہے (یہاں یہ واضح رہے کہ طبری بس اتنا ہی بتاتے ہیں کہ کس سال کون کوفہ کا قاضی تھا) یعنی ۶۴ھ سے ۶۵ھ تک پہلی بار اور کچھ عرصہ قاضی رہنے کے بعد (مختار کے زمانہ میں) ۶۶ھ سے ۶۸ھ کے چند ماہ تک دوسری بار، ان کا موٹا حساب لگانے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ چار سال کے قریب معطل رہے۔ پیشِ نظر کتابوں میں ان کے تعطل کے بارے میں دو روایتیں ہیں: ایک یہ کہ وہ تین سال تک معطل رہے، یہ روایت طبری کی تاریخوں سے جو موٹا حساب بنتا ہے اس کے قریب تر ہے۔ کتاب المعارف، وفیات الاعیان، شرح نہج البلاغۃ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ نو برس تک معطل رہے، یہ روایت طبقات ابن سعد $\frac{6}{97}$ کے ایک راوی نے پیش کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: "دورانِ فتنہ میں شریح ۹ سال تک بیکار رہے، نہ کسی کو خبر سناتے نہ کسی سے سنتے" فتنہ سے مراد ابن زبیر اور اُموی سرداروں کی خلافت کے لئے باہمی پیکار کا زمانہ ہے (۶۴ھ سے ۷۳ھ تک) اس رائے کو تقویت متعدد تاریخی اشاروں سے ملتی ہے لیکن جب تک قطعی شہادت فراہم نہ ہو اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

زمانۂ تعطل سے زیادہ مختلف فیہ مسئلہ ان کی مدتِ قضا، بقا اور سنِ وفات کا ہے مصنف استیعاب اور شرح نہج البلاغۃ کی رائے میں وہ ساٹھ سال تک قاضی رہے مصنف معارف اور وفیات کی رائے میں پچھتر سال تک۔ طبری کی تاریخوں سے مدد لے کر جو نتیجہ نکلتا ہے وہ پہلی رائے کے حق میں ہے،

ان کی عمر کے بارے میں یہ رائیں دی گئی ہیں: ۱۰۰، ۱۲۰، ۱۱۰ سال بسند رُواۃ اغانی $\frac{16}{35}$

۱۶۸ سال بسند شرح نہج البلاغہ، ۱۰۸ سال بسند راوی ابن سعد ۶/۹۹، ۱۲۱ سال بسند راوی صاحب ۲/۱۴۶، ۱۰۰ سال بسند استیعاب حاشیہ اصابہ ۲/۱۴۹، ۱۲۰ سال بسند کتاب المعارف وتاریخ ابن الاثیر ۵/۸

ان کے سن وفات کا مسئلہ عمر سے بھی زیادہ الجھا ہوا ہے۔ ذیل کے سن پیش کئے گئے ہیں ۸۰ھ یا ۹۷ھ بقول شعبی مطابق روایت اغانی ۱۶/۳۵، یہی شعبی ابن سعد کی روایت کے بموجب ۷۶ھ یا ۷۸ھ سن وفات بتاتے ہیں، ۷۸ھ بسند اصابہ ۲/۱۴۸، ۷۶ھ اغانی وطبقات بسند روایت آخر، ۸۲ھ اصابہ بسند راوی خلیفہ ۲/۱۴۶، ۸۲ھ اصابہ بروایت ابن مدینی، ۹۶ھ یا ۹۷ھ تاریخ ابن الاثیر ۵/۸۔

ان تفصیلات کے بعد اب ان کے وہ حالات وواقعات پیش کئے جائیں گے جو کسی گورنر یا خلیفہ کے عہد میں مقید نہیں بلکہ سارے دورِ قضا پر پھیلے ہوئے ہیں اور جن سے ان کی سیرت بحیثیت قاضی ان کے انصاف کے طریقوں اور انفرادی سیرت پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

سیرت بحیثیت قاضی اور انصاف کے طریقے | وہ بارش کے دن مجلس قضا کی بجائے گھر پر مقدمے سنتے تھے، اگر بھوک لگتی یا غصہ آتا تو مجلس چھوڑ دیتے تھے۔

جب گھر سے عدالت کو جاتے تو یہ الفاظ کہتے جاتے: "جس نے حق مارا ہے اس کو حق لوٹانا ہوگا، ظالم سزا کا اور مظلوم کامیابی کا منتظر ہے۔"

وہ گواہوں کی شہادت پر ہی اکتفا نہ کرتے بلکہ مدعی سے حلف بھی لیتے تھے۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ شہادتیں آسانی سے فراہم ہو جاتیں اور وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ، پر کم عمل ہوتا تھا۔ ظن وشک کی شہادت دینے والے سے کہتے تھے "خدا کے بندے مشکوک ومظنون باتوں کو چھوڑ کر یقینی باتوں کا اتباع کر، خدا کی قسم اللہ کی رضا جوئی کی خاطر مشکوک ومظنون باتیں چھوڑنے سے کبھی تم کو نقصان نہیں پہنچے گا۔"

ان لوگوں کی شہادت قبول نہ کرتے: دشمن یا حریف مدعی، شریک مدعی، مشتبہ شخص

قرض دار مدعی، غلام یا ملازم مدعی،

ایک شخص نے کسی معاملہ میں ان سے فتوے دینے کو کہا بولے: "میں فتویٰ نہیں دیتا، انصاف کرتا ہوں"۔ اسی طرح وہ گواہی بھی نہ دیتے تھے، شعبی نے جو بشر بن مروان کی ولایتِ کوفہ میں عدالتِ مظالم کے انچارج تھے ان کا یہ قول نقل کیا ہے: "میں قاضی کے ساتھ شاہد بننا مناسب نہیں سمجھتا"۔

وہ اُن لوگوں کو مجلسِ قضا سے نکلوا دیتے جو مدعی و مدعی علیہ کے ساتھ تماشا دیکھنے آتے اور شور و شغب سے عدالت کے کام میں رخنہ ڈالتے؟

جب گواہوں کی عدالت پر ان کو شبہ ہوتا تو کہتے: "میں نے تم کو نہیں بلایا اور اگر تم چلے جاؤ گے تو میں تم کو نہیں روکوں گا، اس شخص (مدعی علیہ) کے خلاف فیصلہ مستلزم گناہ ہے، میں نہیں چاہتا کہ خدا کا عذاب تم پر نازل ہو سو اس کے عذاب سے بچتے رہو"۔ اگر اب بھی وہ گواہی دینے پر مُصر رہتے تو اس شخص سے جس کے حق میں فیصلہ کرتے کہتے: گو کہ میں تمہارے حق میں فیصلہ کرتا ہوں مجھے معلوم ہے کہ تم ظالم ہو، میں اپنے خیال کے بموجب فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے گواہوں کی گواہی کو پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے مگر اتنا واضح رہے کہ میرا فیصلہ تمہارے لئے اس چیز کو جائز نہیں کر سکتا (یعنی حق تلفی و ظلم) جو خدا نے تمہارے لئے حرام کردی ہے، جاؤ میری یہ بات گرہ میں باندھے رکھنا"۔

وہ پہلے قاضی تھے جنہوں نے گواہوں سے خفیہ طور پر ان کی صداقت کی تحقیق کے لئے سوالات کئے کسی نے بطور اعتراض کہا: ابو اُمیّہ (ان کی کنیت) یہ نئی بات کیوں؟ جواب دیا: لوگ نئی باتیں کرنے لگے (یعنی راستباز نہیں رہے) اس لئے میں بھی یہ نئی بات کرتا ہوں"۔

ایک شخص نے ان کے رشتہ دار کے خلاف عدالت میں چارہ جوئی کی: انھوں نے اس کے (رشتہ دار) خلاف فیصلہ کیا اور حکم دیا کہ مجلس کے ستون سے باندھ دیا جائے

جب وہ مجلس سے اٹھ کر گھر جانے لگے تو وہ رشتہ دار رہائی کے لئے ان سے منت سماجت کرنے لگا۔ وہ بالکل متاثر نہ ہوئے اور یہ کہہ کر چلے گئے، میں نے تم کو سزا نہیں دی انصاف نے دی ہے۔

ان کے لڑکے ایک دن کہنے لگے: "میرا کچھ لوگوں سے مالی جھگڑا ہو گیا ہے، قضیہ یہ ہے اس پر غور کیجئے، اگر فیصلہ میرے حق میں ہو تو میں مقدمہ دائر کروں ورنہ نہیں"۔ شریح سن کر بولے "مقدمہ دائر کردو" جب مقدمہ دائر ہوا تو انھوں نے اپنے لڑکے کے خلاف فیصلہ کیا۔ وہ بہت حیران ہوا اور گھر آکر کہنے لگا: "خدا کی قسم اگر میں پہلے سے آپ کو مطلع نہ کر چکا ہوتا تو ہرگز آپ کو ملامت نہ کرتا (یعنی یہ جانتے ہوئے کہ فیصلہ میرے خلاف ہے آپ نے مقدمہ دائر کرنے کا مشورہ کیوں دیا) آپ نے مجھے رسوا کر دیا"۔ شریح نے ٹھنڈے دل سے کہا پیارے بیٹے تم مجھے سارے جہان سے زیادہ عزیز ہو لیکن خدا کی رضا جوئی مجھے ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے۔ جب قضیہ تم نے پیش کیا تو مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں نے بتادیا کہ فیصلہ تمہارے خلاف ہے تو شاید تم فریق ثانی سے ان کا کچھ حق دبا کر مصالحت کرلو۔

ان کے ایک صاحبزادے کسی مجرم کے کفیل ہوئے اور اپنی ضمانت پر اس کو قید سے چھڑا لیا چھوٹ کر وہ ایسا بھاگا کہ پھر ہاتھ نہ آیا، شریح نے صاحبزادے کو قید کر دیا اور صبح شام اس کے لئے گھر سے کھانا بھیجتے۔

ان کی عدالت کے ایک اردلی نے کسی کے کوڑے مارے، ان کو جب اس زیادتی کا علم ہوا تو انھوں نے پٹنے والے سے اتنے ہی کوڑے اردلی کے لگوائے جتنے اس نے مارے تھے[1]

ظرافت کے نمونے ایک شخص[2] ان کی عدالت میں آکر کہنے لگا: "میرا مقدمہ سنئے" بولے: "کہو میں سنتا ہوں" نووارد: "میں شام کا باشندہ ہوں" شریح: "بہت دور افتادہ ملک ہے

---

[1] مذکورہ بالا تمام تفصیلات طبقات ابن سعد سے ماخوذ ہیں [2] عیون الاخبار (ج ۱ ص ۴۳) کے مصنف نے تصریح کی ہے کہ یہ شخص عدی بن ارطاۃ تھا۔

نووارد: "میں نے آپ کے شہر میں شادی کر لی ہے۔" شریح: "خدا کرے تم اتفاق سے رہو اور بیٹے ہوں۔" نووارد: "میں بیوی کو شام لے جانا چاہتا ہوں۔" شریح: "مرد کو اس کا حق ہے۔" نووارد: "شادی اس شرط پر ہوئی تھی کہ وہ اپنے وطن سے باہر نہ جائے گی۔" شریح: "شرط پورا کرنا لازم ہے۔" نووارد: "آپ ہمارے درمیان فیصلہ کیجئے۔" شریح: "میں کر چکا۔" نووارد: "کس کے خلاف؟" شریح: "تمہاری ماں کے بیٹے کے خلاف۔" نووارد: "کس کی شہادت پر؟" شریح: "تمہاری خالہ کی بہن کے لڑکے کی شہادت پر۔"[1]

ایک عورت آئی اور رو رو کر اپنے مظالم کی فریاد کرنے لگی۔ اس کی آہ وزاری سے شریح بالکل متاثر نہیں ہوئے ایک شخص نے ان کی اس بے اعتنائی پر حیرت سے کہا: "قاضی صاحب آپ کو اس عورت کی آہ وزاری کا کچھ خیال نہیں ہوتا؟" بولے: وَجَآءُوْٓا اِخْوَةُ یُوْسُفَ اِلٰٓی اَبِیْهِمْ عِشَآءً یَّبْكُوْنَ، (یوسف کے بھائی شام کو باپ کے پاس روتے آئے تھے)[2]

ایک شخص نے درخواست کی کہ عبیداللہ بن زیاد (گورنر کوفہ و بصرہ) سے کسی معاملہ میں سفارش کر دیں۔ کہنے لگے عبیداللہ کے سامنے کس کی چلتی ہے؟" اتنے میں ایک چڑیا اڑی اس کو دیکھ کر بولے: "عبیداللہ کے سامنے اس چڑیا کی مجھ سے زیادہ چل سکتی ہے"[3]

ان کا عدالتی لباس کڑھے ہوئے پالین (خز) کا گاؤن تھا (مُطْرَف) کبھی کبھی غالباً سردی کے موسم میں بُرنُس (چادر) بھی استعمال کرتے تھے، طبقات کی متعدد روایتیں شاہد ہیں کہ ان کا عدالتی لباس مطرف تھا۔

ان کی مہر کے بارے میں اختلاف ہے[4] ایک رائے یہ ہے کہ اس پر دو شیر کھدے تھے جن کے وسط میں ایک درخت تھا[5]۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس پر لکھا تھا: انگوٹھی گمان سے بہتر ہے[6]۔ تیسری رائے یہ ہے کہ اس پر شریح بن حارث یعنی ان کا نام کندہ تھا[7]

---

[1] وفیات الاعیان ۱/۲۲ [2] شرح نہج البلاغۃ [3] طبقات [4] طبقات ۶/۱۹۰ [5] طبقات ۶/۹۰ [6] عیون الاخبار ۱/۳۰ [7] اغانی ۱۶/۳۵

سیرت | مذکورہ بالا تفصیلات سے ان کی زندگی کے عام رجحان کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے یہاں وہ حقائق بیان ہوں گے جو ان کی پرائیویٹ زندگی کے بارے میں دریافت ہوئے ہیں اور جن کو نظر میں لا کر ان کی سیرت کا تصور اور زیادہ نکھر جاتا ہے؟

سب سے پہلے ان کی ایک شادی کا ذکر سننے کے لائق ہے خود ان کی زبان سے اس کی تفصیلات پڑھ کر ان کی سیرت کے علاوہ اس زمانہ کی بعض رسموں کی بھی نقاب کشائی ہوتی ہے، شعبی (متوفی ۱۰۳ھ) کہتے ہیں مجھ سے شریح نے کہا کہ اگر تم کو شادی کرنا ہو تو قبیلہ تمیم کی عورتوں سے کرنا۔ میں نے اس کا سبب پوچھا تو کہنے لگے: "ایک دن دوپہر کے وقت جنازہ دفن کرکے لوٹ رہا تھا کہ میرا گذر قبیلہ تمیم کے محلہ سے ہوا۔ ایک گھر کی ڈیوڑھی میں میں نے ایک عورت کو گدے پر بیٹھا دیکھا اور اس کے سامنے دوسرے گدے پر ایک بالغ لڑکی بیٹھی تھی جس کی پیٹھ پر بال لٹک رہے تھے، میں وہاں گیا اور پینے کو کچھ مانگا عورت نے پوچھا "تم کیا چیز پسند کروگے نبیذ، دودھ یا پانی؟ میں نے کہا جو تم آسانی سے دے سکو۔ عورت نے آواز دی ان کو دودھ پلاؤ مجھے یہ پردیسی معلوم ہوتے ہیں؟ جب میں دودھ پی چکا تو میں نے لڑکی کی طرف دیکھا وہ مجھے پسند آئی میں نے عورت سے دریافت کیا تو اس نے بتایا کہ وہ اس کی لڑکی ہے اور قبیلہ تمیم سے اس کا تعلق ہے دریافت کرنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ کنواری ہے، میں نے کہا کیا اس کی شادی مجھ سے کردوگی؟ بولی: ہاں اگر تم کفو ہوئے، اس کا ایک چچا ہے اس سے ملو، میں گھر آیا اور شہر (کوفہ) کے معزز قراء دوستوں کو بلا بھیجا۔ مسروق بن اجدع (متوفی ۶۳ھ) سلیمان بن صرد (متوفی ۶۵ھ) خالد بن عرفطہ (متوفی ۶۰ھ) عروہ بن مغیرہ (   ) ابو بردہ اشعری (متوفی ۱۰۳ھ) ان سب کو لے کر نماز عصر پڑھنے گیا۔ لڑکی کا چچا مسجد میں بیٹھا تھا اس نے پوچھا ابو امیہ آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا مجھے معلوم ہوا ہے آپ کی بھتیجی کنواری ہے بولا حاضر ہے آپ کو چھوڑ کر اور کسی کو تھوڑی دی جاسکتی ہے، آپ اس کے لئے بے بہا

موقع ہی پر اس نے مسجد میں میری شادی زینب (لڑکی کا نام) سے کردی۔ میرے ساتھیوں نے دعاء برکت مانگی اور ہم لوگ چلے آئے، گھر پہنچتے پہنچتے مجھے ندامت نے گھیرا میرے دل میں برابر یہ خیال آرہا تھا کہ میں نے ایسی قوم میں شادی کی ہے جو عربوں میں سب سے زیادہ اکھڑ اور بدتمیز لوگ ہیں جی چاہا کہ طلاق دے دوں پھر میں نے سوچا کہ اس کو آنے دوں، اگر ٹھیک ہوئی تو خیر ورنہ طلاق دے دوں گا۔

کچھ دن بعد دلہن کے گھر کی عورتیں اس کو رخصت کرنے آئیں، جب گھر میں بٹھائی گئی تو میں نے اس کی پیشانی پکڑ کر برکت کی دعا مانگی پھر جب سب لوگ چلے گئے تو میں نے کہا: "مسنون طریقہ یہ ہے کہ نکاح کے بعد پہلی بار جب بیوی خاوند سے ملے تو دونوں دو دو رکعت نماز پڑھیں اور خدا سے رات کے لئے خیر کی دعا مانگیں" یہ کہہ کر میں اٹھا اور نماز پڑھنے لگا: میں نے دیکھا کہ وہ بھی میرے پیچھے نماز میں مشغول ہے، جب میں نماز سے فارغ ہوا تو وہ لیٹ چکی تھی میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھائے تو وہ بولی ٹھہرئیے میں ایک عرب عورت ہوں اور آپ میرے لئے اجنبی ہیں میں آپ کے مزاج اور اخلاق سے ناواقف ہوں، اس لئے آپ بتائیے کون سی باتیں آپ کو پسند ہیں اور کون سی ناپسند تاکہ میں ان سے باز رہوں" میں نے کہا: "تم بہت اچھی جگہ آئی ہو تم ایسے گھر آئی ہو جہاں تمہارا خاوند مردوں کا سردار ہے اور تم عورتوں کی، مجھے یہ یہ باتیں پسند ہیں اور یہ یہ ناپسند" بولی: "آپ کو سسرال والوں کا یہاں آنا جانا پسند ہوگا یا نہیں؟" میں نے کہا: "میں قاضی ہوں اور اس عہدہ کی ذمہ داریوں کے پیش نظر ان کا زیادہ آنا جانا پسند نہیں کروں گا" اس گفتگو کے بعد میں نے نہایت اچھی رات گذاری اور تین دن کے بعد مجلس قضا گیا ہماری ازدواجی زندگی کا ہر نیا دن گذرے ہوئے سے بہتر ہوتا۔

سال ختم ہونے پر جب ایک دن میں گھر آیا تو ایک بڑھیا کو گھر میں نصیحت کرتے دیکھا۔ زینب سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ اس کی ماں ہے میں نے سلام کیا اس نے مزاج پرسی

کی اور زینب کی بابت پوچھا۔ میں نے اس کی تعریف کی تو وہ بولی: "عورت کا اخلاق ڈوھالتو میں بہت زیادہ بگڑ جاتا ہے: ایک جب وہ اپنے خاوند کی چہیتی ہو اور دوسرے جب اس کے لڑکا پیدا ہو اس لئے اگر آپ کو اس کی طرف سے شبہ پیدا ہو تو کوڑے سے خبر لیجئے گا، کیونکہ مرد کے گھر میں پھوہڑ اور گستاخ عورت سے بڑی مصیبت کچھ نہیں ہو سکتی۔ میں نے کہا میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ کی لڑکی کی خوبیوں نے مجھے مار کی مشقت سے بچا لیا ہے وہ نہایت باتمیز اور باادب عورت ہے" لڑکی کی ماں ہر سال ہمارے گھر آتی اور ان باتوں کا اعادہ کر کے چلی جاتی۔

زینب پر مجھے صرف ایک بار غصہ آیا اور اس میں زیادتی میری ہی تھی میں اپنے کنبہ والوں کا امام تھا۔ میں نے اقامت نماز (فجر) کی آواز سنی، سنتیں ختم کی ہی تھیں کہ ایک بچھو دیکھا اتنا وقت نہ تھا کہ اس کو مارتا (کیونکہ نماز تیار تھی) میں نے ایک برتن سے اس کو ڈھک دیا، دروازہ پر پہنچ کر میں نے زینب کو تاکید کی کہ میری واپسی تک برتن کو چھوئے چھیڑے نہیں لیکن اس کو بچھو مارنے کی جلدی تھی اس نے برتن کو چھیڑا اور بچھو نے اس کے ڈنک مار دیا میں نے آکر دیکھا تو وہ بری طرح تڑپ رہی تھی، پھر کچھ نہ پوچھو شعبی مجھے کتنا غصہ آیا اسی عالم میں اس کی انگلی پر نمک کا پانی گھستا، معوذتین اور سورۂ فاتحہ پڑھ پڑھ کر دم کرتا۔ میرا ایک پڑوسی تھا جو ہمیشہ اپنی بیوی کو مارتا تھا، میں نہیں بتا سکتا مجھے یہ دیکھ کر کتنا دکھ ہوتا، اس مناسبت سے میں نے یہ شعر کہے ہیں: ترجمہ

میں دیکھتا ہوں کہ بعض مرد اپنی بیویوں کو مارتے ہیں۔ میرا سیدھا ہاتھ شل ہو جائے جب میں زینب کو ماروں۔

کیا میں اس کو بے قصور ماروں۔ بے گناہ کو مارنا میرے لئے انصاف نہیں ہو سکتا[1]

وہ زیادہ تر با وضو رہتے تھے، اس کی تصدیق ابن سیرین کے اس قول سے ہوتی

---

[1] اغانی ۱۶ / ۳۷-۳۸

ہے کہ شریح ایک وضو سے سب نمازیں پڑھتے تھے۔"[۱]

مرنے سے پہلے انھوں نے وصیت کی تھی کہ ان کی موت کی کسی کو خبر نہ کی جائے، کوئی نوحہ خواں عورت روتی پیٹتی ان کے جنازہ کے ساتھ نہ چلے، نہ ان کی قبر پر چادر چڑھائی جائے، نیز یہ کہ ان کا جنازہ جلد قبرستان لے جاکر قبر میں دبا دیا جائے۔[۲]

ابن سلمہ کہتے ہیں کہ ایک بار شریح نے درہم پڑا پایا تو اٹھایا نہیں اور چلے گئے۔[۳]

وہ ہر موقع پر سلام میں خود سبقت کرتے تھے ان کے ایک ہم عصر نے کہا: "مجھے شریح کو ان سے پہلے سلام کرنے کا کبھی موقع نہیں ملا، سڑک پر ان کے سامنے آتا ہوتا تو دل میں کہتا اب میں سلام میں سبقت کروں گا، وہ مجھے دیکھ کر ذرا غافل ہو جاتے اور جب میرے قریب آتے تو سر اٹھا کر کہتے: السلام علیکم"[۴]

شعبی کہتے ہیں کہ شریح جب کبھی کسی سے ملتے تو پہلے خود سلام کرتے۔[۵]

ان کے گھر کے سب پرنالے ان کے گھر میں گرتے تھے، ان کی خدا ترسی کا اقتضا تھا کہ ان کے پڑوسی کو ان کی ذات سے نہ کوئی تکلیف ہو نہ شکایت، بالتو بلی اگر مرجاتی تو اس کو بھی گھر میں دفن کرتے تھے۔[۶]

فقیہ و محدث سب اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ثقہ تھے یعنی جو بات کہتے صداقت کے ساتھ کہتے جو کرتے راستبازی کے ساتھ کرتے جب کہ پہلی صدی ہجری کے بہت سے مفتی و دینی لیڈر مثلاً شعبی، زہری اور سعید بن جبیر یا خود ان کے بعض قراء دوست مثلاً سلیمان بن صرد اور عروہ بن مغیرہ نقادوں کے طعنوں سے نہ بچ سکے ان کا صاف نکل جانا ان کی سلامت روی کی بڑی شہادت ہے۔

ان کی سیرت کے ان تمام پہلوؤں کو جن پر پیش نظر تاریخ و ادب سے روشنی پڑتی ہے جب ان کی ہم عصر آشفتہ حال سیاسی، اجتماعی اور مذہبی پس منظر سے (جس کا مختصر خاکہ پیش ہو چکا ہے) ملا کر دیکھا جاتا ہے تو ان کی سلامت روی، ان کی پُر عافیت طولانی عمر ان کی ساٹھ سالہ ججی کا ایک طویل دور اور ان کے مقبول خاص و عام ہونے کا دار و مدار صرف دو باتوں پر نظر آتا ہے: خدا ترسی اور خدا ترسی

[۱] طبقات ج ۶ [۲] طبقات ج ۶ [۳] ایضاً [۴] ایضاً [۵] ایضاً [۶] ایضاً

حکیم سنائی

مترجم

جناب انعام اللہ خاں صاحب ناصر
(ایڈیٹر روزنامہ الجمعیۃ دہلی)

یہ کتاب انسان کو بیانِ حکیمانہ اور طریقِ صادقانہ سے منزلِ تحقیق کی طرف بلاتی ہے۔
اس میں دس ابواب اور تقریباً دس ہزار اشعار ہیں
پہلا باب تقدیس وتحمید وتعظیم باری تعالےٰ۔
(۲) نعت میں
(۳) صفت عقل کے بیان میں
(۴) فضیلتِ علم میں
(۵) غفلت کے بیان میں
(۶) افلاک و بروج کے بیان میں
(۷) حکمت وافعال
(۸) عشق ومحبت کے بیان میں
(۹) اپنے حال اور رتبہ کتاب کے بیان میں
(۱۰) بہرام شاہ اور قضات اور مشاہیر غزنی کی مدح میں
حدیقہ کی تاریخِ تالیف کے متعلق اختلاف ہے کتب خانہ وزارت معارف (افغانستان) میں عبداللطیف عباسی مرتب حدیقہ کا جو قلمی نسخہ موجود ہے اس میں تاریخ اس طرح

درج ہے۔

پنج و سی و چہار رفتہ ز عام پنج صد و سی و پنج گشتہ تمام

محمد علی بن رقام شاگرد حکیم سنائی کے جمع کردہ قلمی حدیقہ میں جو مذکورہ بالا نسخہ سے پہلے لکھا گیا ہے یہ بیت اس طرح لکھی ہوئی ہے

پنج صد و بست و چار رفتہ ز عام پنج صد و بست و پنج گشتہ تمام

بہرحال سنائی نے حدیقہ کو جب مکمل کرلیا تو غزنی کے بعض علماء شور مچانے اور اس کتاب پر اعتراض کرنے لگے۔ حکیم ان باتوں سے سخت متاثر ہوا اور حدیقہ کا ایک نسخہ دارالسلام بغداد میں بھیج دیا جو اس وقت خلافت عباسی کا مرکز اور علوم اور فنون کا مستقر تھا۔ برہان الدین ابوالحسن علی بن ناصر غزنوی کو ایک مکتوب منظوم تحریر کیا جس میں حقوق محبت و رفاقت دیرینہ یاد دلا کر ظاہر بینوں کے مظالم کی شکایت کی گئی تھی۔ برہان الدین نے حدیقہ کو انجمن علمائے بغداد میں پیش کردیا علمائے بغداد نے حدیقہ کو بغور مطالعہ کرنے کے بعد حکیم سنائی کے عقیدہ کی صحت اور حدیقہ کی فضیلت کی تصدیق کردی اس طرح حکیم سنائی کو ظاہر بینوں کے ستم سے نجات ملی۔

کتاب حدیقہ قدیم سے مشرق کے سخنوروں اور ادیبوں کی منظورِ نظر ہے خصوصاً حضرت مولوی جلال الدین بلخی نے اپنی مثنوی میں چند مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے اور اس کے اشعار کی تشریح و تضمین کی ہے نظامی گنجوی نے اپنی مخزن اسرار کو حدیقہ کا ہمسر فرض کرکے اس پر فخر کیا ہے۔

حدیقہ کی تدوین | کتاب حدیقہ کو اول خود حکیم سنائی کے عہد میں محمد بن علی رقام نے جو حکیم صاحب کا شاگرد تھا مرتب کیا اس پر دیباچہ لکھا اور کتاب کے آخر میں حکیم صاحب کا وہ خط بھی نقل کردیا جو انھوں نے غزنی کے ظاہر بیں علماء کی شکایت میں بہرام شاہ کو لکھا تھا۔

حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں اس امر کی تائید کی ہے کہ محمد بن علی رقام نے حدیقہ

کو مدون کیا حدیقہ کو دوسری بار عبداللطیف ابن عبداللہ عباسی نے سال ۱۰۴۰ھ میں بمقام کابل مدون کیا اور چند نسخوں سے تصحیح کرنے کے بعد اس کا نام امام حدائق رکھا۔ تصحیح کے لئے جو نسخے عبداللطیف نے جمع کئے تھے ان میں ایک ایسا نسخہ بھی تھا جو حدیقہ کی تصنیف سے اسّی سال بعد لکھا گیا تھا۔ عبداللطیف نے تصحیح کے بعد حدیقہ پر دیباچہ تحریر کیا اور عربی کے ان جملوں کی شرح جو حدیقہ میں مندرج تھے علیحدہ لکھ کر بصورت رسالہ مختصر کتاب کے آخر میں ملحق کر دی۔ دیباچہ منثور کو جو حکیم سنائی سے منسوب ہے کتاب کے اول میں رکھا لیکن تعجب ہے کہ عبداللطیف نے حدیقہ کی اس ترتیب کا کوئی ذکر نہیں کیا جو محمد بن علی رقام نے کی ہے۔

۱۹۱۰ء میں ایک مستشرق نے حدیقہ کا ترجمہ فارسی سے انگریزی میں کیا اور اس کا دیباچہ بھی لکھا محمد بن علی رقام کے مدونہ حدیقہ اور مطبوعہ حدائق میں جزوی اختلاف ہے۔

اسی مقدمہ میں محمد بن علی رقام اپنے استاذ حکیم سنائی کا ذکر خیر اس ادب و احترام سے کرتے ہیں۔

"۔۔۔ او خواجۂ روزگار بود حکیم العصر۔ ملک الکلام محقق الانام۔ سلطان البیان۔ حجۃ الایمان شمس العارفین بدر المحققین۔ عالم الحقیقت۔ قوام الطریقت۔ سدید النطق۔ رفیع الہمم۔ عزیز الوجود۔ عدیم المثل۔ محترز الدنیا۔ مقبل الدین۔ نظام النظم۔ موزز النثر۔ مادح سید الانبیاء (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ذواللسانین۔ ابو المجد مجدود بن ابی الحسن آدم السنائی الغزنوی رحمۃ اللہ علیہ و نور قبرہ کہ عالمیاں در ساحت یار احت او روزگار خوش دلی می گذاشتند و در بہشت نقد می بودند"۔۔۔

حدیقہ کے ظاہر میں مخالفین کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"۔۔۔ اندر روزگار آدم تا روزگار او (سنائی) کسے کتابے بدیں نسق نساختہ بود ما یۂ جہانے است و پیرایۂ عالمے آنرا حدیقۃ الحقیقت و الشریعت و الطریقت نام کرد جماعتے مختصر بے بصر زہر مینیہ۔ غول بنیہ کہ سرمایۂ عقل و پیرایہ صبر نداشتند و از دایۂ علم سیر نبودند میوہ از طبیدن گرفتند و آں موسکے در سہ صد و شصت رگ

رگ ایشاں سیصد و شصت رہ دارند (ان الشیطان یجری فی عروق احد کم مجری الدام) تخم وسوسہ درمیان دل ایشاں نہاد و آں عزیزی گفت و لا تقربا ھذہ الشجرۃ "

انتخاب حدیقہ

آں شنیدی کہ گفت دمسازے | با قرینے ازاں خود رازے
گفت کیں راز را نہ گوئی باز | گفت خود کے شنیدہ ام زتو راز
شہرے بود کز ہوا پژ مُرد | از تو زاد آں زماں و در من مُرد
باطن تو حقیقت دل تست | ہر چہ جز باطن تو باطل تست
دیں ز دل خیزد و خرد ز دماغ | دل ز روز آمد و خرد چو چراغ
دیں نہ دارد کسے کہ اندر دل | مرد را نیست مغز دل حاصل

آفتابے بہ باید انجم سوز
بہ چراغ تو شب نہ گردد روز

کارنامہ بلخ | حکیم سنائی کی دوسری تصنیف کارنامہ بلخ ہے یہ مثنوی میں حدیقہ کے وزن پر ہے۔ چونکہ یہ تصنیف قیام بلخ کے دوران کی گئی تھی اس لئے اس کا نام کارنامہ بلخ رکھا گیا اس میں حکیم صاحب نے بزرگان غزنی کے نام پیام بھیجا ہے۔ اس کا آغاز تحمید کے بغیر ایک خطاب سے ہوا ہے جو ہوا کے نام کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں حکیم صاحب نے مسعود کی تعریف کی ہے اس لئے یقیناً حدیقہ سے پہلے کی تصنیف ہے حدیقہ میں بہرام شاہ کی تعریف کی گئی ہے مسعود بہرام شاہ سے پہلے وفات پا چکا تھا سنائی نے کارنامہ بلخ میں اپنے والد کا ذکر بھی کیا ہے جو اس وقت بقید حیات تھے اس سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ کارنامہ بلخ دوسری مثنویات سے قدیم ہے کارنامہ بلخ ۳ ہزار ۶۰ اشعار پر مشتمل ہے اس میں صرف ایک یا دو مقامات پر تصوف اور معرفت کا ذکر ہے کتاب کے عنوانات یہ ہیں۔

خطاب بہ باد ۔ صفت خاندان محمود ۔ صفت شاہزادگان ۔ صفت ارباب قلم صفت

نقد الملک ۔ صفت قلم ۔ صفت پدر سنائی ۔ صفت لشکریاں ۔ صفت امیر صاحب ۔ صفت امیر صواب ۔ صفت امام یوسف حداد و پسیراد ۔ مثالب علمائے سور ۔ صفت ارباب طریقت ۔ صفت شعرا ۔ صفت سید شرف الدین ۔ صفت امیر حسینی ۔ صفت محمد افتوی ۔ صفت اسمٰعیل خجستہ ۔ طیبت با لبغوی ۔ صفت بو حنیفہ اسکانی ۔ صفت صابونی مثالب مدعیان ۔ مدح امیر سید حسین بن علی ۔ مناقب مختاری ۔ صفت خواجہ موید ۔ صفت قاضی لطیف ۔ صفت زیخ را ۔ صفت عبدالحمید بلخی ۔

طریق التحقیق | حکیم سنائی کی تیسری مثنوی طریق التحقیق ہے اس کتاب کے نام کے متعلق فرماتے ہیں

داد ایزد شعار تو منقش نام کردم طریق تحقیقش

یہ مثنوی ۵۲۸ھ میں حدیقہ کی تکمیل کے تین سال بعد تصنیف کی گئی ہے لیکن نہ حدیقہ میں طریق تحقیق کا ذکر ہے نہ طریق تحقیق میں حدیقہ کا ۔ حدیقہ اور طریق تحقیق میں حکیم سنائی نے ماحول اور زندگی کے متعلق جو تصور و خیالات ظاہر کئے ہیں ان میں تین فرق نظر آتا ہے اول یہ کہ حدیقہ بہرام شاہ کے نام پر لکھا گیا تھا ۔ اور حکیم سنائی نے اس میں اپنے معاصر علماء اور فضلا کی مدح کی تھی اور اس بلند پایہ کتاب کو بہرام شاہ کے نام کے شایاں سمجھا تھا لیکن طریق تحقیق میں اپنے ممدوحین باقی میں سے کسی شخص یا امیر کو اس لائق نہیں سمجھتے کہ کتاب اس کے نام سے منسوب کی جائے طریق تحقیق میں فرماتے ہیں میں نے یہ کتاب لکھنے کے بعد عقل سے پوچھا کہ اس عروس زیبا کو کس کی مدح کے زیور سے آراستہ کروں اس نے جواب دیا کہ اس ملک میں کوئی صاحب دل نہیں جو اس کتاب کے اہدا کا سزاوار بنے ۔

خرد از گوشہ بر آمد چیست گفت ایں نقد را کہ رشتہ نیست

سخن سرسری نمی بینم زاں نگیں مشتری نمی بینم

مزید فرماتے ہیں

خود گرفتم کہ آں سخن رانم کز عبارت نظیر حا ئم

در چنیں روزگار با نفرت — با چنیں منعمانِ دوں ہمت
چوں کنم دیں ہمہ پریشانی — در نثار مدیح حسانی
بس ازیں وصف زلف و طرہ خال — بس ازیں ہرزہ گفتگوئے محال

دوسرے یہ کہ طریق تحقیق کی تصنیف کے وقت حکیم صاحب پر تجرید و عزلت کی کیفیت حدیقہ کے زمانہ کی نسبت زیادہ شدت سے وارد ہوگئی ہے زمانہ کی شکایت زیادہ تلخی اور بلند آہنگی سے کرتے ہیں اور ان کا دل مادیات سے سیر ہوگیا ہے نالائقوں کی صحبت سے دل گرفتہ ہیں اور کسی کو اپنی مصاحبت اور ہمدمی کے لائق نہیں سمجھتے۔ فرماتے ہیں

چہ کنم با کہ ایں سخن گویم — گلہ از بخت یا ز چرخ کنم
جگرم خوں گرفت نیست کسے — کہ شود غمگسار من نفسے
من مسکیں مستمند ضعیف — با غم و محنتم ندیم و حریف
گلہ دارم ز روزگار بسے — کہ گویم کہ نیست ہم نفسے
جملہ روئے زمیں بہ گردیدم — ہمدمے کا فرم اگر دیدم
دوستے نیست کو شود محرم — محرمِ نیست کو شود ہمدم
دلم از جور چرخ جفت فنا است — کاندریں روزگار قحط وفا است

طریق تحقیق بحالت پیری و زمیں گیری تصنیف کی گئی ہے فرماتے ہیں

نالہ ام زاں شدہ است اثر آہنگ — کز عنا قامتم خمیدہ چو چنگ
روز عمرم بہ شب رسید و نبود — جز تعب حاصلم ز چرخ کبود
دود دل جیب و آستینم سوخت — سقف چرخ آہ آتشینم سوخت

حکیم صاحب طریق تحقیق کی تصنیف پر مباہات کرتے ہیں اور اپنی اس کتاب کو تحفہ ربانی اور اسرار روحانی کہتے ہیں۔

ایں سخن تحفہ ایست ربانی — رمز و اسرار ہائے روحانی

سخنے ز آسماں بلند تر است تا نہ گوئی کہ نظم مختصر است
نظم نغزش ز نکتہ و امثال سحر مطلق ولے مباح و حلال
اہل دل کیں سخن فرو خوانند آستیں از جہاں بر افشانند

طریق تحقیق ۸ سو ۶۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں حکیم صاحب نے مراتب سلوک وطریق عرفان اور مسائل اخلاق کی شرح کی ہے کتاب کی ابتدا حمد باری تعالےٰ سے کی گئی ہے اور انتہا ظالموں کی مذمت پر درمیان میں کبھی کبھی اپنی پریشانی اور تنگدستی کا ذکر بھی کیا ہے۔ اس کتاب میں آفتاب سے جو خطاب کیا گیا ہے خاقانی نے اس خطاب کی توصیف کی ہے طریق تحقیق بلحاظ سلاست وفصاحت ادبی اور عرفانی مثنویات میں شمار کی جاتی ہے۔

سیر العباد | سیر العباد حکیم سنائی کی مشہور مثنوی ہے اس کی ابتدا میں ہوا سے خطاب کیا گیا ہے یہ خطاب بلحاظ استعارہ وتشبیہ اور فصاحت ان کے بہترین قطعات میں شمار ہوتا ہے۔

اس مثنوی میں مراتب سلوک وطریقت اور تہذیب اخلاق کی تشریح کی گئی ہے ہوا سے خطاب کے بعد روحِ نامی اور روحِ حیوانی کی صفت بیان کی گئی ہے۔ سیر العباد ابو المفاخر[1] محمد بن منصور کی مدح پر ختم ہوتا ہے اس کتاب کے اشعار کی تعداد کے متعلق اختلاف ہے قاضی عبد اللطیف عباسی کے تدوین کردہ قلمی نسخہ سے بھی جو کتب خانہ وزارت معارف افغانستان میں موجود ہے سیر العباد کے اشعار کی تعداد ۷۰۰ معلوم ہوتی ہے منصور بن محمد کی مدح میں ۹ اشعار ہیں لیکن روایت نے مجمع الفصحا میں بیان کیا ہے کہ حکیم سنائی نے سیر العباد مدح محمد بن منصور میں ۲۰۹ اشعار کہے ہیں۔

انتخاب سیر العباد | مرحبا اے برید سلطان وَش تحفت از آب و تاجت از آتش

---

[1] ابو المفاخر محمد بن منصور اس زمانے کے ایک بزرگوں میں سے تھے اور ان کا لقب مفتی مشرق تھا وطن ان کا سرخس تھا اور حکیم سنائی نے حدیقہ میں ان کی تعریف کی ہے۔

نہ از آب آب را نقاش | نہ از خاک خاک را فراش
اے بہنگام خوبیٔ و زشتی | ساقیٔ ابر و قائد کشتی
باغ را ہم تو پشت و ہم روئی | شاخ را ہم تو زوج ہم شوئی
آتش از تو چو لب بدیں خرمن | آب با تو زمردیں خرمن
کنی از جنبشے کہ خواہی تو | روئے دریا تو پشت ماہی تو

عقل نامہ | حکیم سنائی نے یہ مثنوی خدا سے شروع کی ہے اور اس میں توحید اور علم کلام کے مسائل مثلاً استوا اور نزول اور آداب پیری و مریدی اور اصطلاحات صوفیا کا بیان ہے اس کے اشعار کی تعداد ۶۰۷ ہے طریق التحقیق کی مانند حکیم سنائی نے عقل نامہ میں بھی کسی امیر یا عالم کی مدح نہیں کی قناعت اور تجرید کو ہر ایک چیز پر ترجیح دی ہے۔ فرماتے ہیں

سنا بندہ را کہ بد باشد | مدح مخلوق ذم خود باشد
در ہمہ کارے یاری از خود خواہ | دست ازیں ناکساں بکن کوتاہ
بکن اے دوست با خود ایں بیداد | زاں طلب کن از انکہ جانت داد

عقل نامہ میں انداز بیان حدیقہ۔ طریق تحقیق۔ اور سیر العباد سے بالکل مختلف ہے ان کتابوں میں ایک طرح آمریت اور حاکمیت پائی جاتی تھی لیکن اس مثنوی میں حکیم صاحب نرمی اور ملامیت سے باتیں کرتے ہیں اور اس کتاب کو علوم دنیا و آخرت کا مجمع اور غزالی کی کیمیائے سعادت اور احیاء العلوم کا ہمسر جانتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں فرماتے ہیں

کاندریں نسخہ ہر کرا سمعست | علم دنیا و آخرت جمع است
ہر چہ در کیمیا و در احیا است | با مزید دگر دریں جای است
کردہ صاحب نظر دریں حدقہ | مشہدے چوں حدیقہ حدقہ

عشق نامہ | حکیم سنائی نے اس مثنوی میں عشق حقیقی کی تعریف اور اس کے مراتب عشاق کی صفت اور ان کے خصائل بیان کئے ہیں اور عشق و محبت کے حدوث و عدم پر بحث کی ہے

اور توضیح مطالب کے لئے حکایات بھی بیان کی ہیں یہ مثنوی بھی دفاتر عشق و عرفان کے امہات میں شمار کی جاتی ہے اس مثنوی کا اسلوب لطیف اور پیرایہ بیان حدیقہ کے بعد سنائی کے تبحر علمی اور قادر الکلامی کی ایک روشن دلیل ہے اس کا آغاز عشق کی تعریف سے ہوتا ہے اور اسی پر کتاب ختم ہوتی ہے قلمی نسخہ میں کل اشعار کی تعداد ۵۰۵ ہے

بہرام و بہروز | اس افسانہ کا موضوع دو بھائیوں کے عشق کے واقعات ہیں ان میں ایک کا نام بہرام اور دوسرے کا بہروز تھا یہ دونوں اپنی چچا زاد بہن گلچہر پر عاشق تھے۔

بہرام رند اور بد اخلاق تھا اور بہروز پارسا اور صالح حکیم صاحب نے اس افسانہ میں اچھے اور برے اخلاق کا نتیجہ دکھایا ہے۔ بیان کا اسلوب نہایت سادہ اور رواں ہے نظم فارسی میں کلیلہ دمنہ رودکی کے بعد اخلاقی انسانوں کی نگارش کا سلسلہ بہرام و بہروز سے شروع ہوتا ہے اس کتاب میں بہرام کو جب بہروز یا کوئی اور شخص نصیحت کرتا ہے اپنے مطلب کی تائید کے لئے ایک حکایت بھی بیان کرتا ہے مثلاً نیکی اور حسن سلوک کی پاداش کے سلسلہ میں ایک چور کا واقعہ بیان کیا ہے کہ وہ ایک مکان میں داخل ہو گیا اور سہواً ایک لقمہ کھا لیا لیکن صاحب خانہ کے اموال سے کوئی تعرض نہ کیا جب باہر آیا تو اس کے ساتھی نے سبب پوچھا اس نے جواب دیا میں نے حق نمک ادا کرنے کے لئے اس گھر سے کوئی چیز نہیں لی۔

ایک ظالم کی حکایت | ظلم کی بد انجامی واضح کرنے کے لئے یہ حکایت بیان کی ہے کہ ایک شہر میں ایک فقیر رہتا تھا وہ بھیک مانگنے کے لئے نکلتا تو دوسرے فقیروں کے برخلاف ہمیشہ صدا دیتا کہ جو اپنے لئے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لئے بھی پسند نہ کرو اسی شہر میں ایک ظالم بھی رہتا تھا ایک دن فقیر نے اس کے دروازہ پر بھی یہی صدا دی۔ ظالم کو فقیر کی یہ بات سخت ناگوار ہوئی اس روز تو ٹال دیا دوسرے دن اپنے آدمی سے کہا کہ اس فقیر کو زہر ملا کر روٹی دے دو فقیر یہ زہر آمیختہ روٹی لے کر شہر سے باہر چلا گیا اور ایک ویرانہ میں سو رہا۔ اتفاقاً اسی ظالم

کے بیٹے اسی روز بھوکے پیاسے شکار سے تھکے ہوئے اس مقام پر آ نکلے جہاں فقیر سورہا تھا۔ فقیر کو بیدار کرکے اس سے روٹی لے لی اور کھاتے ہی مر گئے۔

بہرام و بہروز کے اشعار ۵۰۰ کے قریب ہیں۔

قصائد اکثر تذکرہ نگار کہتے ہیں کہ مثنویات کے علاوہ حکیم سنائی نے ۳۰ ہزار اشعار لکھے تھے لیکن ان کے موجودہ دیوان میں صرف بیس ہزار اشعار مندرج ہیں۔ مطبوعہ دیوان میں توحید، اخلاق، مدائح اور مراثی کے عنوانات سے جو قصائد موجود ہیں ان کی تعداد ۱۷۴ ہے تمام قصائد میں بہتر وہ ہیں جو حکیم صاحب نے توحید اور معارف کے موضوع پر لکھے ہیں ان کا ہر ایک عرفانی قصیدہ توحید کا ایک دفتر اور معرفت اور فلسفہ کا گنجینہ ہے اکثر اساتذہ علم وادب نے ان قصائد کے تتبع میں خامہ فرسائی اور طبع آزمائی کی ہے۔

یہ دعویٰ بلا خوف تردید کیا جا سکتا ہے کہ جو تاثیر حکیم سنائی کے عرفانی قصائد میں ہے وہ شعراء میں سے شاذ ہی کسی کے کلام کو نصیب ہوئی ہے حکیم صاحب کو اس باب میں دوسرے شعراء سے خاص امتیاز حاصل ہے اور ان کے شعرائے مابعد میں کسی کا کلام یہ جوشِ عرفانی اور تجلیِ معرفت نہیں رکھتا۔ صوفیا میں اچھے اشعار اسی کے ہیں جس کا کلام شورانگیز سوزندہ اور دردناک تر ہے۔ ایسا ہی کلام دل میں عشق اور سینہ میں طپش پیدا کرتا ہے سننے والوں کو رلاتا ہے اور احساس میں شور برپا کرتا ہے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان ایک الہامی شعر میں دنیا اور مافیہا سے مستغنی ہو کر عالم قدس میں پہنچ جائے۔ کبھی ایک تازیانۂ عبرت سے انسان اپنی ہستیِ ضعیف کو خوار ترین ذرات وجود کے مقابلہ میں ہیچ دیکھتا ہے اور اپنے کو حقیر اور ناچیز سمجھتا ہے شاعر کبھی بوئے گل سے اسے مست کرتا ہے اور کبھی نالۂ بلبل سے محو فریاد بناتا ہے۔

اخلاقی شعراء میں اس کا شعر اچھا ہے جس کا کلام زیادہ دل نشین حکمت آمیز اور مدلل ہو، مسائلِ اخلاقی کو ایسے منطقی انداز سے بیان کرے کہ ایک اچھا شعر سننے والے کے دل کو شکار

بنا سکے اور تازیانہ اور ڈنڈے کے بغیر اس کے اخلاق کو آراستہ کردے۔

جس قدر اس کا طرزِ استدلال منطقی اور بیان بلیغ ہوگا اسی قدر تاثیر زیادہ ہوگی ایسا شاعر روزمرہ رونما ہونے اور مشاہدہ میں آنے والے واقعات سے عوام کی سمجھ کے مطابق اخلاقی دلائل اور موثر نصائح پیدا کرسکتا ہے

سنائی کے کلام میں یہ دونوں امتیاز پائے جاتے ہیں ان کے تمام عرفانی قصائد شورانگیز اور اثر آفریں ہیں تمام اخلاقی قصائد حکیمانہ اور فیلسوفانہ ہیں سنائی کا ایک قصیدہ جس کا مطلع ذیل میں درج کیا جاتا ہے امہات قصائد عرفانی میں شمار ہوتا ہے اور اکثر اساتذہ نے اس کا استقبال کیا ہے۔

مکن در جسم و جاں منزل کہ ایں دون است و آں والا
قدم زیں ہر دو بیروں نہ نہ اینجا باش و نہ آنجا

ترک و تجرید کے بیان میں اسی قصیدہ کا یہ شعر خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

بہرچہ از راہ دور افتی چہ کفر آں حرف و چہ ایماں
بہرچہ از دوست وامانی چہ زشت آں نقش و چہ زیبا

بے ثباتی دنیا | بے ثباتی دنیا کے موضوع پر اکثر شعرا نے طبع آزمائی کی ہے لیکن حکیم سنائی اس باب میں دوسرے شعرا سے پیش پیش ہیں اور اس مسئلہ کو ایسے منطقی اور حکیمانہ استدلال سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا زندگیِ مستعار اور ہستیِ ناپائیدار سے دلگیر ہو جاتا ہے۔

اسی موضوع پر فرماتے ہیں۔

گوئی ز بعد ما چہ کنند و کجا روند   فرزندگان و دخترگانِ یتیم ما
خود یاد نادری کہ چہ کردند و چوں شدند   آں مادراں و آں پدرانِ قدیم ما

یہ بات کہ ظاہر بینوں کی پیروی سے پرہیز کرنا اور تحقیق حق کے لئے جدوجہد جاری رکھنا چاہئے اس اندازِ حکیمانہ سے کہتے ہیں۔

مرو بر راہ ہر کورے اگر مردے برایں ہا موں ۔ کہ گمراہ بے برون آئی بسے گمرہ تراز ہا ماں
نہ ہر آہو کہ پیش آید بود در ناف او نافہ ۔ نہ ہر زندہ کہ می بینی بود در قالب جاناں
بسے آہو ست در عالم کہ شکلش نیست در باطن ۔ بسے شخص است در گیتی کہ جانش نیست در ابدان

اسی موضوع کو ایک جگہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

اندریں رہ صد ہزار ابلیس آدم روئے ہست ۔ تا ہر آدم روے راز ایں ہا بہ آدم نشمری

شراب کی مذمت میں فرماتے ہیں۔

ترا ازدہ می گوید کہ در دنیا مخور بادہ ۔ ترا ترسا ہمی گوید کہ در صفرا مخور حلوا
ز بہر دیں تو نہ گذاری حرام از حرمت یزداں ۔ ولیکن از بہر تن مانی حلال از گفتۂ یزداں

دنیا پرستوں کی باہم آویزی کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں۔

ایں جہاں بر مثال مرداریست ۔ کرگساں گرد او ہزار ہزار
ایں مرآں را ہمی زند مخلب ۔ آں مرایں را ہمی زند منقار
آخر الامر بر پرند ہمہ ۔ وز ہمہ باز ماند ایں مردار

موجودہ بین الملی تعلقات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ مردار دنیا کے طلبگاروں کی آج بھی وہی حالت ہے جو سنائی کے عہد میں تھی۔

مدائح | قصائد مدحیہ ارکان مہمہ شعر و شاعری میں شمار کئے جاتے ہیں کلام پر شاعر کی قدرت اور طبیعت کی قوت مدائح سے معلوم ہو جاتی ہے اگرچہ مداحی شاعر کو اس کی معنوی اور اخلاقی عظمت کے بلند تاریخی مقام سے گرا دیتی ہے۔ حکیم سنائی کے قصائد بدیع مدحیہ بلحاظ مضامین خاص مقام رکھتے ہیں۔ حکیم صاحب فرخی اور عنصری کی پیروی کرتے ہوئے قصائد کو زیبا تشبیہوں اور دلکش استعاروں سے آراستہ کرتے ہیں۔

خواجہ اسعد کی مدح میں لکھتے ہیں

گرد نو روز چو بتخانہ چمن ۔ از جمال بت و بالائے شمن

شد چو روئے صنماں لالہ لعل — شد چو پشت شمناں شاخ سمن
باغ شد چوں رخ شاہاں زکمال — شاخ چوں زلف عروساں ذشکن
ابر چوں خامہ خوجۂ بہ سخا — چوں دل خواجہ بہار است چمن

خواجہ اسعد کی مدح میں ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

گرچہ ز ہر درخت خوشی دید ہر دماغ — ورچند زاں بہار بہا یافت ہر دیار
لیک از بہار خرمی طبع نیستے — چوں خلق و طبع خواجہ اگر نیستے بہار

اشعار حماسی | مخاطب کو بوسیلۂ اشعار آتشیں جنگ کی ترغیب دینے اور آمادۂ قتال کرنے سے شاعر کی قدرت کلام اور قوتِ طبع ظاہر ہوتی ہے اس باب میں شعرائے عرب شعرائے مشرق سے بازی لے گئے ہیں فارسی میں اشعار حماسی کا رواج دربار غزنی سے ہوا اعلیٰ حضرت یمین الدولہ محمود کی بارگاہ میں فردوسی نے پہلی بار اس مفاخرت کا علم بلند کیا۔

حکیم سنائی نے بھی گاہ گاہ اشعار حماسی لکھے اور ان سے کامیابی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے ایک قصیدہ میں بہرام شاہ کو حفاظت وطن اور حراستِ ناموس مملکت کی ترغیب دیتے ہیں اور ممدوح کو پوچ مبالغوں سے مبتلائے غفلت کرنے کی بجائے سربازی اور فداکاری کے لئے آمادہ کرتے ہیں۔

چوں بطبع روزاں افزوں شود بر صلح جنگ — چوں بہ نزد بے دلاں بہتر شود از نام ننگ
از قوی دست اجل گردد اجل را پا شکست — وز سبک دست قضا گردد اجل را تیز چنگ
بے مزاج گرمی و خشکی شود چوں باد و خاک — جان بے شخص از شتاب و شخص بے جاں از درنگ
ناگہاں شاہا بروں نازی چو بر چرخ آفتاب — بر فراز کوہ رنگے ۔ ہم چو اندر کوہ زنگ

حدیقہ میں ایک مقام پر ممدوح کو وطن کی عزت اور اقتدار خاندان محمودی کی حفاظت کی ترغیب دیتے ہوئے ان الفاظ میں شجاعت کا درس دیتے ہیں۔

ملک چوں بوستاں نخندد خوش — تا نہ گرید سناں چوں آتش

مکن از خون دشمن آلودہ ... تیغہائے بنیام فرسودہ
من نہ گویم کہ تیغ بردوں زن ... گردن گرداں گردوں زن
دشمناں را بزیر پائے درآر ... گردن گرداں بدار بہ دار
خصم خود را بہ تیغ بردرپوست ... کہ دو سر در یکے کلہ نہ نکوست
ننگ باشد یکے جہاں دو شاہ ... ننگ باشد یکے سپہر دو ماہ
خوشہ ملک پختہ شد نو کن ... جامہ بخت کنہ شد نو کن

مراثی | مرثیہ گوئی بھی اجزائے اہم شاعری سے ہے۔ حکیم سنائی نے بزرگان وطن اور دوستوں کی وفات پر متعدد مرثیے لکھے ہیں ان میں امیر معزی کا مرثیہ خصوصیت سے قابل ذکر ہے حکیم صاحب کے تمام مرثیے استادانہ اور پختہ ہیں اور ان کی ترجیحات کو اس عہد کے بہترین مرثیوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

وصف مناظر طبعی | مناظر طبعی کا وصف شاعر کے شاہکاروں میں سے ہے قدرت کی زیبائی کو ضبطِ تحریر میں لانا۔ جمال و رعنائی کائنات کا حظ اٹھانا اور اپنے احساسات کو موزوں اور موثر الفاظ میں بیان کرنا شاعر کی طبیعت کے جوش اور اس کی قادر الکلامی کا ثبوت ہے حکیم سنائی نے مناظرِ طبعی کے وصف میں نہایت لطیف اشعار لکھے ہیں۔

ایک اندھیری رات میں گھوڑے پر سوار ہو کر کوئے معشوق کی طرف روانہ ہوتے ہیں منزل مقصود پر پہنچے تک جو کچھ پیش آیا اس کا حال سنئے۔

یارب چہ بود آں تیرگی۔ واں راہ دور و نیم شب

ازجان من یکبارگی۔ بردہ غم جاناں تعب

گردوں چو روئے عاشقاں در لولوئے مکنوں نہاں ... گیتی چو روئے دلبراں پوشیدہ از عنبر سلب
محکم عنان و رخنگ من سوئے نگار آہنگ من ... می بردہ شبرنگ من گاہے سریع وگہ خبب
بادبہاری خوئش او۔ ناورد جولاں کیش او ... صحرا و دریا پیش او چوں مہرہ پیش بوالعجب

آہو سریں۔ ضرغام بر۔ کیواں منش۔ خورشید فر — خارادل و سنداں جگر رو ئیں سم و آہن عصب
دلداہ چوں شبرنگ جم۔ باشیر بودہ دراجسم — آموختہ جولاں در عجم۔ خوردہ ربیع اندر عرب

کوئے معشوق میں پہنچ کر حکیم صاحب کا گھوڑا ہنہناتا ہے اور کوئی استقبال کے لئے بیتابانہ باہر نکل آتا ہے۔

آواز اسپ من شنید آں ماہ پیش من دوید — وصل آمد و ہجراں رمید آمد نشاط و شد کرب

گلزار سنائی میں کانٹے بھی ہیں | شاعر کا دل ایک صاف اور شفاف آئینہ ہے جو معمولی ناخوشگوار حادثہ سے مکدر ہو جاتا ہے اور شاعر اس صدمہ کو عملاً دفع کرنے کی بجائے شعر کے حربے سے کام لیتا ہے

چو شاعر برنجد بگوید ہجا — بماند ہجا تا قیامت بجا

حکیم سنائی کے کلام میں بھی ہجویات پائی جاتی ہیں، شبلی نے اس پر افسوس کیا ہے کہ گلزار سنائی میں یہ کانٹے کیوں اُگ گئے؟ لیکن کسی مبالغہ کے بغیر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کسی شاعر کا کلام ہجویات سے خالی نہیں رودکی سے لے کر ہمارے زمانہ کے شعرا تک سب کے کلام میں ایسے اشعار موجود ہیں، حکیم صاحب نے بھی جہاں لوگوں کے اخلاق کو مفادِ عمومی کے خلاف دیکھا ان کی مذمت کی۔

قرآن مجید اور ترجمہ و تفسیر

از

(جناب خواجہ محمد علی شاہ صاحب)

جَمِیْعُ الْعِلْمِ فِی الْقُرْاٰنِ لٰکِنْ تَقَاصَرَ عَنْهُ اَفْهَامُ الرِّجَالِ

یہ ایک مشہور شعر ہے اور اس شعر میں شاعر نے ایک نفس الامری حقیقت اور اپنے ایک واقعی تاثر اور صحیح جذبہ و خیال کو الفاظ کا جامہ پہنا کر حدیث نبوی (اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً) کی صداقت کا ایک لطیف و نفیس اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے، محاکات اور شعر کے فطری اور نیچرل ہونے کی دنیائے شاعری میں اس سے بڑھ کر اور کیا مثال مل سکتی ہے، شعر اگرچہ شعر ہی ہوتا ہے مگر شعر کا مضمون حقیقت پر مبنی اور حقانیت سے مملو ہونے کی بنا پر وہ شعر حقیقت کا شعور بن جاتا ہے صرف تخیل ہی نہیں رہتا، شعریت اور حقیقت کا حسین امتزاج ہو جاتا ہے۔

بے شک تمام علوم و معارف، ادراکات کلیہ و جزئیہ۔ اس ام الکتاب یعنی قرآن مبین میں اجمالی اصول کی صورت میں موجود ہیں اور اولین و آخرین کے جمیع علوم کا خلاصہ صراحتہً یا اشارۃً اس امام مبین میں مذکور ہے اور یہ کتاب عزیز و مقدس تمام علوم دینی و دنیاوی، بدیہی و نظری اور ادراکات ظاہری و باطنی اصولی و فروعی کی بنیاد و اساس ہے۔

اور یہ بھی درست ہے کہ اس کے علوم و حقائق۔ حکم و بصائر لامعدود و لامحدود ہیں اور اس کی تعلیمات محض روحانی دائرہ تک ہی محدود نہیں بلکہ معاشرتی، تمدنی اور سیاسی جملہ امور کو شامل و حاوی ہیں۔

دین و دنیا۔ معاش و معاد، زندگی اور موت کے ہر امر کے متعلق، تہذیبِ اخلاق، تدبیرِ منزل، سیاست مدنی اور حکمت نظری و عملی کے ہر شعبہ کے بارے میں خدا کی مرضی اور

اس کا منشا معلوم کرنے اور خدا کا فضل، سعادت اور نجات حاصل کرنے کے لئے یہ کتاب مبین انسانوں کو عطا کی گئی ہے۔

اس کی تلاوت، اس کا فہم اور اس پر عمل :- یہ تین چیزیں اس کتاب حق کے انزال و تنزیل کا اولین مقصد ہے۔

قرآن مجید :- تلاوت و قراءت، فکر و تدبر، اور سعی و عمل کی کتاب ہے، بنی نوع انسان کو علمی و عملی دستور العمل کے طور پر ملی ہے اور یہی تین چیزیں بحیثیت مجموعی اس کتاب عزیز کا منشا و مقصد ہے۔

تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے۔ فہم معانی کے ساتھ ہو یا بغیر فہم، برکت و فضل خداوندی کا سبب، اور معانی و مفاہیم کے ظہور و اظہار کا وسیلہ ہے۔

فکر و تدبر معانی میں ہوتا ہے، جو سعی و عمل کا مبدء اور اعمال و افعال کا ممد و محرک اور ممد و معاون ہے۔

اور فعل و عمل فضل خداوندی کے ساتھ انسان کی فلاح و سعادت اور نجات کا ذریعہ ہے

قرآن کریم کے علوم و ادراکات، اعمال و اخلاق اور اس کے نور حکمت کو مشکوٰۃ نبوت سے اخذ کرنے میں حضرات صحابہ کرام و اہل بیت عظام۔ تابعین رح۔ تبع تابعین رح۔ سلف صالحین رح ائمہ خیر و ہدایت رح اور جمہور متبعین اسلام نے حسب مدارج و مراتب اپنے علم و عمل اور ہدایت و استقامت کے اعتبار سے نزول قرآن کے وقت سے اب تک جو حصہ لیا اور بے مثل و مثال نمونۂ فہم و عمل پیش کیا ہے۔ وہ "ذٰلِكَ الْكِتَابُ" کی صداقت و ہدایت اور اس کے اعجاز و تاثیر کی لاریب و شک واضح و قوی دلیل ہے۔

اس کتاب سعادت کے نورانی لطائف و حکم، حقانی مضامین و مطالب، اور روحانی بصائر و مفاہیم کی جلوہ آرائیاں شریعت و دین کے عقلی و نقلی اصول کے مطابق ہر فرد بشر کے لئے جدا جدا ہیں۔ اور آیات کلام اللہ کی نورانی حقیقتیں اور نئے نئے مطالب ہر صاحب ذوق

ونظر انسان کے سامنے نئے نئے انداز میں بے نقاب ہوتے ہیں اِنَّ لِلْقُرْآنِ ظَهْرًا وَبَطْنًا
لَا يَفْقَهُ الْعَبْدُ حَتّٰى يَرَى لِلْقُرْآنِ وُجُوهًا كَثِيرَةً (عين العلم لمحمد بن عثمان بن عمر البلخی)

مخدرات سرا پردہائے قرآنی ۔۔۔ چہ دلبرند کہ دل می برند نہانی
کتاب نور درو عکس روئے اندازد ۔۔۔ جمالیات وہمہ نطقہائے سبحانی

کثرت تلاوت وقراءت اور تکرار ذکر و مداومت سے اس کتاب الٰہی میں پژمردگی، افسردگی اور ملالت پیدا نہیں ہوتی لَا يَخْلَقُ بِكَثْرَةِ التَّرْدَادِ، وَلَا تَلْتَبِسُ بِهِ الْأَلْسِنَةُ،

اور نہ اس کے حقانی علوم اور صحیح ادراکات کے احاطہ سے اہل علم کو کبھی کامل سیری اور سیرابی ہوئی ہے لَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَنْقَضِي عَجَائِبُهُ۔

قرآن مجید کی تعلیمات، عقائد و اعمال، اخلاق و آداب، عبادات و معاملات۔ بشری نفوس اور ارواح انسانی کی اصلاح و تربیت اور اس کے ظاہر و باطن کی تطہیر و تعمیر اور تزکیہ و تصفیہ کے لئے الٰہی و ربانی فیض کا ایسا سرچشمہ ہے جس کی سوتیں ہمیشہ اور ہر ایک کے لئے جاری رہتی ہیں۔

اس پر ایمان لانا، اس کی تصدیق کرنا، خلوص و اخلاص کے ساتھ اس کو قبول کرنا، محبت سے دل میں جگہ دینا اس کا پڑھنا سیکھنا اور تلاوت کرنا، اس میں تدبر اور غور و فکر کرنا اور اس پر عمل کرنا یہ سب باتیں جملہ انسانی افراد و اقوام کو شر سے خیر، ظلمت سے نور، جہالت سے علم اور ضلالت و شقاوت سے ہدایت و سعادت کی طرف لانے والی اور علمی و عملی تدریجی تربیت کے طریقہ پر انسان کی انسانیت کو کمال سعادت اور نجات سے بہرہ ور کرنے والی ہیں۔ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ،

عالم انسانی کے سب سے بڑے خیر خواہ، ہادی کائنات سید الموجودات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

عَلَيْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْآنِ، فَإِنَّهُ مَأْدُبَةُ ۔۔۔ لوگو! قرآن کریم کو تلاوت اور فہم وعمل کے لئے (

اللّٰهِ فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ اَنْ يَّأْخُذَ مَادُبَةَ اللّٰهِ فَلْيَفْعَلْ فَاِنَّمَا الْعِلْمُ بِالتَّعَلُّمِ (جمع الفوائد ج ۱ ص ۱۷) لازم پکڑلو، یہ قرآن اللہ پاک کی ایک دعوت ہے تم میں سے جو کوئی بھی خدا کی دعوت کو قبول کرنا چاہے وہ قرآن کو لے لے۔ کیونکہ علم تو سیکھنے ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے مقدمہ موضح القرآن میں فرمایا ہے کہ۔ (حق تعالیٰ کے غیر متناہی خزانے ہیں جس کو جس میں سے چاہتے ہیں حصہ معین فرما دیتے ہیں، وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَائِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ

بندہ نوازیاں تو یہ دیکھو کہ آدمی جزو ضعیف محرم اسرار کل ہوا

قرآن مجید کے فہم و تفہیم اور کتاب اللہ کے نظم و معانی پر نقد و بحث اور تدبر و تفکر اور تفسیر کے قدیم و جدید ذخیرۂ کتب سے دینی و علمی اور تاریخی و تحقیقی معلومات بہم پہنچانے کا ایک بہت بابرکت موقع راقم الحروف کو حاصل ہوا تھا۔ وولز ہوسٹل اورینٹل کالج لاہور میں ۱۹۴۲ء و ۱۹۴۷ء میں قیام رہا۔ اور کالج کے عربی پروفیسر، پنجاب یونیورسٹی کے عربی ڈیپارٹمنٹ کے صدر ڈاکٹر برکت علی صاحب قریشی کی توجہات اور علمی فیضان شامل حال حسب ذیل مضمون اسی وقت کا لکھا ہوا ہے جس میں منطقی و علمی ترتیب اور جامعیت و اختصار ملحوظ رہا ہے، یہ ایک ریسرچ ہے جس میں

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم

کے مصداق، بادۂ قدیم در ساغر نو کا نمونہ بصیرت افروز قلب و نظر کرنے کی سعی کی گئی ہے ۱۹۴۷ء کے عظیم تغیرات و حوادث کے سبب اب تک اصل مسودہ سے مبیضہ کرنے کی نوبت نہ آئی تھی، گویا بقول خواجہ آتش،

برنگ شمع ہم دل سوختوں نے بزم عالم میں زباں کھولی، نہ لیکن بات کرنے کا محل پایا

اسی وجہ سے یہ چند سطریں جو یادداشت کے طور پر لکھ لی گئی تھیں اب تک شائع

نہ ہو سکیں۔ اب ایک مناسب تمہید کے ساتھ (مجلسیہ دینیہ وعلمیہ برہان کے ذریعہ یہ معذرت کرتے ہوئے پیش کرتا ہوں کہ

زبان دہن میں تو غنچہ کے بھی ہے کیا لازم کہ جس کے منہ میں زبان ہو سخنوری جانے
بعید کیا ہے کریں اہل علم اس کو قبول خدا کے فضل سے مجھ کو یقین کامل ہے
یہ اس کلام کی تفسیری یادداشت ہے جو جلائے آئینۂ جاں ہے صیقلِ دل ہے

تمہید:۔ علم و معرفت انسان پر قدرت کا ایک وسیع اور عام نورانی فیضان و انعام ہے اور اس کو جہالت و غفلت پر بہرحالت و نوع فضیلت و شرف حاصل ہے قرآن مجید میں انسانی شرافت کو علم و فضل ہی سے وابستہ کیا گیا ہے اس شرافت و فضل کے دروازے تمام انسانوں کے لئے کھلے ہوئے ہیں، علم و عرفان کسی کی جدی میراث اور آبائی ترکہ نہیں بلکہ ہر شخص بلا امتیاز نسل و قوم و رنگ و وطن اس شرافت و فضل کا حقدار ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَیَانَ

اور یہ تو بالکل ہی ظاہر اور عیاں ہے کہ کوئی کام اور کوئی فعل و عمل بغیر علم و معلومات کے نہ تو کیا جا سکتا ہے اور نہ انجام کو پہنچایا جا سکتا ہے اور علم بغیر فہم و عمل کے ایسا ہے جیسے جسم بلا روح۔ علم کے لئے فہم ضروری ہے، اور چونکہ علم سے فہم و عقل اور سعی و عمل کی توفیق ملتی ہے اس لئے تمام علوم خواہ وہ دنیا کے ہوں یا دین کے موجبِ سعادت و فلاح اور باعث برکت و خیر ہیں۔

لیکن ان تمام علوم میں جو دنیا میں جاری اور رائج ہیں، علم الٰہی اور کلام ربانی بہر صورت و حیثیت انسانی علوم اور بشری کلام سے ظاہر و باطن، نتیجہ و مقصد، اور فوائد و تاثیر ہر ایک اعتبار سے احسن و اشرف اور اپنے منطوق و مفہوم، صورت و معنیٰ، عبارت و اشارت اقتضاء و دلالت ہر لحاظ سے افضل و اعلیٰ اور کَلَامُ الْمُلُوْکِ مُلُوْکُ الْکَلَامِ کا حقیقی مصداق ہے وَفَضْلُ کَلَامِ اللّٰهِ عَلٰی سَائِرِ الْکَلَامِ کَفَضْلِ اللّٰهِ عَلٰی خَلْقِهٖ (اشعہ ۱۳۲) واحسن

الحدیث کلام اللہ :-

کلام الٰہی یعنی حضرات انبیاء و رسل علیہم السلام کے صحیفے اور کتابیں خواہ وہ سب ہم تک پہنچی ہوں یا نہ پہنچی ہوں اور چاہے ان میں کا بعض حصہ اپنی اصلی حالت پر باقی ہو یا کل کا کل متغیر اور محرف و مبدّل ہو چکا ہو۔ بہرکیف قرآن مجید ان سب سابقہ کتب و صحائف کے لئے ناسخ و مکمل اور ان سب کے علوم و نصائح، معارف و حکم اور تعلیمات و احکام پر حاوی و مشتمل ہے اور ہر فرد بشر کی روحانی و جسمانی، دینی و دنیاوی، معاشی و معادی جملہ ضروریات و اقتضارات کے لئے حامل و کافی اور بلا استثنا تمام عالم کے لئے سرچشمۂ رشد و ہدایت اور ذریعۂ فلاح و نجاتِ دنیا و آخرت ہے۔

اس کتابِ عزیز کے بعد کوئی آسمانی یا الہامی کتاب عالم انسانی کے افراد و اقوام کی دنیاوی سعادت اور اخروی نجات کے لئے قطعی و یقینی حجت و برہان نہیں قرار دی جا سکتی۔ ذٰلِکَ الْکِتَابُ لَا رَیْبَ فِیْہِ، اِنْ ھُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعَالَمِیْنَ۔

ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم اسی قرآن مکرم کی سرمدی و لاہوتی آواز میں فرماتے ہیں وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْ بَلَغَ ۔ اور میری طرف (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف) یہ قرآن اس لئے وحی کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ میں تمہیں اور ہر اس شخص کو ڈراؤں جس کو بھی یہ قرآن پہنچے (یعنی قیامت تک آنے والی نسل انسانی کو اس قرآنِ عزیز کے ذریعہ خدا کا خوف دلاؤں۔)

علم و تعلیماتِ الٰہی کا یہ خزانہ۔ خدا کی مخلوق کو ظلمتِ جہل سے نکالنے اور اس کے بجائے نورِ علم و قوت و توفیق عمل ان میں بھرنے کے لئے عطا ہوا ہے۔

قرآن پاک کی سب سے پہلی وحی، سورۂ اقراء کی ابتدائی پانچ آیتیں ہیں جن میں انسان کی پیدائش کا مقصد اور انسان کے اپنی زندگی اور موت میں عزت و اکرام پانے کو خدائے پاک نے قرأت و علم یعنی پڑھنے، سیکھنے تعلیم حاصل کرنے اور جہالت کی تاریکی دور کرنے پر

موقوف قرار دیا ہے۔

جس سے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ علم و تعلیم قرآن پاک کے نزول کا سنگ بنیاد اور اساسی مقصد ہے۔

علم اپنی ذات کے اعتبار سے ایک متعدی امر ہے اور حق و حقانیت کی معرفت کے لحاظ سے ایک دائمی شے ہے۔ علم الٰہی حق تعالیٰ شانہ کی تجلی و تمثیل اور صفت نورانیت کا ظہور ہے اور مخلوق خدا کی جسمانی و روحانی جمیع سعادات کا ضامن و کفیل اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ۔

قرآن کریم خدا کا ایک کلام ہونے کی حیثیت سے تمام فطری و الٰہی خوبیوں کا معدن ہے اور تمام قدرتی حکمتوں کا مخزن۔ اور چونکہ یہ مقدس کلام خدا پاک کا دائمی، ازلی ابدی سرمدی اور ذاتی و نفسی کلام ہے اس لئے اس کے الفاظ و عبارت بھی خدا ہی کے ہیں اور معنی و مفہوم بھی اسی کی طرف سے ہیں۔ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۔

اگر قرآن پاک کے لفظ و معنیٰ دونوں خدا کی طرف سے نہ ہوتے تو تم اس میں بے حد لفظی و معنوی اختلافات پاتے اور نہ یہ کلام لفظی و معنوی تحریف و تبدل و تغیر سے محفوظ رہتا، مخلوق کا خواہ وہ فرشتہ ہو یا پیغمبر خدا کے اس پاک کلام اور اس کے مفہوم میں کوئی دخل نہیں، اس کی آیات کو (الفاظ و معانی کو) روح القدس اور روح الامین یعنی جبریل علیہ السلام نے "لوح محفوظ" "کتاب مکنون" اور "امام مبین" سے بعینہٖ و بجنسہٖ جوں کا توں نقل کر کے پیغمبر اسلام ہادی عالم فخر دارین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا اور پھر ان سے سنا اور حضور نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تمام لوگوں کو جو صحابہ کے لائق عزت اور ممتاز نام سے پکارے جاتے ہیں تمام و کمال بسم اللہ سے من الجنۃ والناس، تک ہو بہو اسی طرح پہنچا دیا جس طرح کہ انھیں پہنچا اور ملا۔ الفاظ و معانی دونوں کا منزل من اللہ ہونا

قرآن مجید کا وہ لفظی و معنوی اعجاز و کرامت ہے جس کی وجہ سے یہ کلام دائمی طور پر پورے جزم و یقین کے ساتھ علمی و عقلی اور روحانی معجزہ قرار پایا ہے۔

حق الامر یہ ہے کہ قرآن مجید کی روحانی عظمت، اور اس کی نورانی حکمتوں کی کرامت و فضیلت کا اندازہ قلب بشری سے ناممکن ہے۔ لیکن آئیے مشکوٰۃ نبوت کی روشنی سے سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے جو انوار و فیوض اس کتاب کریم کے بارے میں حاصل کئے ہیں۔ ان کو ہم ترمذی شریف سے نقل کرتے ہیں ذیل ان پر صدق دل اور خلوص نیت سے غور کریں اور اس روشنی میں اس محکم اور با حکمت کتاب کے اصل مرتبہ اور حقیقی درجہ تک پہنچنے کی امکانی سعی کریں۔

دل وہی دل ہے کہ جس دل میں ہے اس کی لگن سر وہی سر ہے کہ جس سر میں ہو سودا اس کا

سید الاولیاء حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ (عنقریب فتنے ظاہر اور برپا ہونے والے ہیں) حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا (یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ان سے بچنے اور محفوظ رہنے کی کیا سبیل ہے۔ ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کتاب اللہ یعنی قرآن مجید کو مضبوطی سے پکڑ لینا ان تمام فتنوں سے حفاظت کا سبب اور بچاؤ کا ذریعہ ہے۔ اس کے بعد حضرت علیؓ بھی کہتے ہیں کہ ہادی عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ "

التقریظ والانتقاد

مختصر سیرت قرآنیہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم[1]

از

(سعید احمد)

حضرت عائشہؓ سے پوچھا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کیا تھے؟ فرمایا آپ کا خلق قرآن تھا ام المومنین کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ قرآن مجید تو وہ ہے جو ما بین الدفتین مکتوب ومحفوظ ہے لیکن اگر کسی کو قرآن کا عملی پیکر اور اس کی ایک زندہ ومتحرک تصویر دیکھنی ہو تو آنحضرت کو دیکھے اسی بنا پر بعض علماء نے کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کا خاکہ قرآن مجید کے موئے قلم سے تیار کریں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کوشش ہے لیکن اس کے مرتب پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب نے اس میدان میں سب سے ہی الگ ایک نئی راہ نکالی ہے یعنی ایک تو یہ کہ آپ نے قرآن مجید کا مطالعہ اس کے ترتیب نزولی کی روشنی میں کیا ہے اور دوسرے یہ کہ اگرچہ عنوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے لیکن درحقیقت آپ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیرت کی آڑ لے کر اسلام کی اصل حقیقت کو اپنی فہم وفکر کے مطابق بیان کر جائیں۔ کتاب ایک مقدمہ اور دس فصلوں پر مشتمل ہے مقدمہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ واقعات زندگی تاریخی ترتیب سے بیان کئے گئے ہیں جن کا تعلق زمانہ قبل بعثت سے ہے اس کے بعد دس فصلوں میں بعثت سے وفات تک کے واقعات کا اسی تاریخی ترتیب سے بیان ہے لائق مولف کا جذبہ۔ محنت اور ذوق تحقیق لائق داد ہے جس کے باعث وہ ایک

[1] ازجناب محمد اجمل خاں صاحب ایم۔ اے تقطیع متوسط کتابت وطباعت بہتر ضخامت ۲۷۱ صفحات قیمت قسم اول پانچ روپیہ اور قسم دوم چار روپیہ۔ ملنے کا پتہ :- (۱) سنگم کتاب گھر اردو بازار دہلی (ہند) (۲) مکتبہ بیت الحکمت اردو بازار لاہور (پاکستان)

عرصہ سے قرآن مجید کا مطالعہ ایک مخصوص زاویہ نگاہ کے ساتھ بڑے انہماک سے کر رہے ہیں لیکن افسوس ہے کہ وہ اس مطالعہ کے بعد جن نتائج تک پہنچے ہیں ان میں سے اکثر ہمارے نزدیک غلط اور سخت گمراہ کن ہیں اس سلسلہ میں پہلی بات جو بنیادی طور پر یاد رکھنی چاہئے وہ یہ ہے کہ جس طرح ہر علم و فن کے چند اصولِ موضوعہ ہوتے ہیں جن پر اس علم و فن کے تمام کلیات و جزئیات اور اصول و فروع کی بنیاد قایم ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح ہر مذہب کے بھی چند اصولِ موضوعہ ہوتے ہیں جو اس کے تمام احکام و مسائل کے لئے اساس کا کام دیتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اصول موضوعہ اپنی صحت کے لئے کسی عقلی استدلال و منطقی ثبوت کے محتاج نہیں ہوتے مثلاً عربی نحو میں یہ مسلم ہے کہ ہر فاعل مرفوع ہوگا اور ہر مفعول منصوب تو اب اس کے ثبوت کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے بس یہی حال اسلام کے اصولِ موضوعہ کا ہے جن کا ماننا ہر شخص کے لئے خواہ موافق ہو یا مخالف بہر حال ضروری ہے ایک شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اصولِ موضوعہ میں سے کسی اصل کی معقولیت کو بھی تسلیم نہ کرے یہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے وہ بغیر اس اصل کو مانے نہیں سمجھا جا سکتا

اسلام کے اصولِ موضوعہ کیا ہیں؟ چند عقائد اور چند مخصوص عبادات جناب محمد اجمل خاں صاحب کی سب سے بڑی فروگذاشت یہ ہے کہ انھوں نے اس کتاب میں اسلامی عبادات کی کوئی اہمیت ہی نہیں دکھائی ہے۔ نماز کی حقیقت ان کے نزدیک تقریباً وہ ہی ہے جو عیسائیوں کے ہاں پریر (Prayer) کی ہے یعنی ایک جگہ جمع ہو جانا اور کچھ دعا مانگ لینا۔ چنانچہ لکھتے ہیں قرآن نے بتایا ہے کہ اسلامی نماز یا دعا یا اللہ سے مدد مانگنے کا طریقہ یہ ہے کہ (الف) سوائے اللہ کے کسی کو قادر نہ سمجھو۔ اس لئے اسی سے مدد مانگو ـــــ الخ (ص ۱۶۷)

اسی طرح فرضیتِ صیام کا بھی تذکرہ کیا لیکن اس طرح کہ گویا روزے ہنگامی حالات کے پیشِ نظر فرض کئے گئے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اب وہ ہنگامی حالات نہیں

ہیں تو روزہ رکھنا ضروری بھی نہیں ہوگا۔ لکھتے ہیں

"روزہ کا مقصد ہی جہاد تھا یعنی جس طرح سراپا بھیج کر مشق کرائی جاتی تھی اسی طرح بھوکے رہ کر مشقت اور انفاق کی عادت ڈالی جاتی تھی منشایہ تھا کہ لوگ کم کھائیں اور جن سے ہوسکے وہ اپنے غریب ساتھی کو کھلائیں۔ مسلمانوں پر بعد ہجرت بہت ہی سخت زمانہ تھا۔ اور اس کے سوا چارہ نہ تھا" ص ۱۹۴)

پوری کتاب پڑھنے کے بعد یہ صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ جس طرح ہندو مذہب اور عیسائیت میں نیکی اور بدی کے متعلق چند مبہم اور گول گول سی باتیں ہیں یعنی یہ کہ خدا پرستی کرو۔ اور کسی کا دل نہ دکھاؤ۔ خاں صاحب اسلام کو بھی کھینچ تان کر اسی سطح پر لے آئے ہیں۔ حالانکہ اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی اور بہر جہت کامل ایک دستورِ حیات ہے چنانچہ اسی جذبہ کے ماتحت انھوں نے سورۃ الفاتحہ میں نعبد کے معنی میں بھی ایسا تصرف کیا ہے جو عربی کے قواعد کے لحاظ سے بالکل نادرست ہے موصوف کے نزدیک نعبد کا ترجمہ حسبِ ذیل ہے

"ہم سب مانتے ہیں کہ سوائے تیرے ہمارا کوئی آقا نہیں اس لئے ہم تیری بندگی کا اعلان کرتے ہیں اور ہم سب صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں (کسی دوسرے دیوتا وغیرہ سے مدد نہیں مانگتے اس لئے کہ وہ خود مخلوق ولاچار ہیں)"

سوال یہ ہے کہ عبادت کے معنی بندگی کا اعلان کرنا کون سی لغت میں لکھے ہوئے ہیں۔ شاہراہِ عام سے ہٹ کر اگر کوئی بات کہی جائے تو ضروری ہے کہ اس کے لئے دلائل وشواہد فراہم کئے جائیں مگر افسوس ہے کہ خاں صاحب نے ترجمہ میں جگہ جگہ عجیب جدتیں کی ہیں مگر حوالہ کہیں پر بھی نہیں دیا۔ مثلاً اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔

"اے نبی اس آقا کے نام سے وعظ ونصیحت (یا حمد) شروع کر جس نے خلق کیا ہے اس لئے (رحم میں

کائنات) انسان کو انس (علق) محبت کا پتلا بنایا ہے۔ اے محمد تو یہ اعلان کر دے کہ تیرا آقا نہایت ہی کریم ہے ... اس آقا کا کتنا بڑا کرم ہے کہ اس نے انسان کو علم حاصل کرنے کا آلہ قلم (یعنی عقل) عطا فرمایا اور اس کے ذریعہ سے علم دیا۔ اب غور کیجئے قرآن کی صرف دو سطروں کا ترجمہ ہے لیکن کس قدر غور طلب ہے!

(الف) لائق مؤلف نے اقرء کے معنی ایک جگہ وعظ و نصیحت شروع کرنا بیان کئے ہیں اور دوسری جگہ اس کے معنی اعلان کرنا بتاتے ہیں۔ حالانکہ قراءت عربی زبان کا کوئی غریب لفظ نہیں ہے جس میں زیادہ کھینچ و کاؤ کی ضرورت ہو ہر شخص جانتا ہے اس کے معنی پڑھنا ہیں۔ اِقْرَءْ امر کا صیغہ ہے تو اس کے معنی "پڑھ" ہوئے جناب خاں صاحب کو اس کا بھی دھیان نہیں رہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اِقْرَءْ کے جواب میں "لست بقارئ" فرمایا تھا۔ اب اگر خانصاحب کے بیان کردہ معنی ہی مراد لئے جائیں۔ تو ایک جگہ اس کا ترجمہ ہوگا "میں وعظ و نصیحت یا حمد شروع کرنے والا نہیں ہوں۔ اور دوسری جگہ اس کا ترجمہ ہوگا کہ میں اعلان کرنے والا نہیں ہوں" خانصاحب بتائیں کہ آنحضرت کا اپنے متعلق مذکورۂ بالا دونوں باتوں میں سے کسی ایک بات کو فرمانا بھی صحیح ہے؟ ہرگز نہیں کیونکہ آپ وعظ و نصیحت اور حمد کرنے والے بھی تھے اور احکام خداوندی کا اعلان کرنے والے بھی

(ب) خانصاحب "رب" کے معنی آقا کرتے ہیں اور آقا بھی وہ جو ہر زمانہ میں خود غرض اور ظالم ہوتے رہے ہیں (ص ۷۳) لیکن یہ بھی صحیح نہیں ہے کیونکہ اگرچہ لغوی اعتبار سے رب کے معنی آقا یا مالک کے آتے ہیں جیسا کہ خود قرآن میں ہے "ھو رب کل شئ" یا حدیث اشراط الساعۃ میں ہے "وان تلد الامۃ ربتھا" لیکن علمائے لغت کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ جب کبھی رب کا لفظ مطلق ہوگا تو اس سے خدا ہی مراد ہوگا۔ اور اس وقت اس سے مراد "پروردگار" کے معنی ہوں گے۔ اگرچہ جو پروردگار ہوگا وہ مالک یا آقا ضرور ہوگا۔ اور اگر رب کا اطلاق غیر اللہ پر ہو تو وہ لازمی طور پر مضاف ہو کر مستعمل ہوگا اور اس وقت مضاف الیہ کے قرینہ سے اس کے معنی مالک یا آقا کے ہو سکتے ہیں مثلاً

اذا کان رب البیت بالطبل ضاربًا فلا تلم الاولاد فیہ علی الرقص

یا مثلاً رب الدار - رب السجن - ربات الاحجال - ربات الخدور وغیرہ

چونکہ رب کا لفظ جب خدا کے لئے بولا جاتا ہے اس وقت اس کے معنی پروردگار کے بھی ہوتے ہیں اسی بنا پر ایک حدیث میں جو حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی ممانعت کی ہے کہ کوئی غلام اپنے آقا کو رب کہہ کر پکارے ظاہر ہے کہ اگر خدا پر رب کا اطلاق بمعنی مالک یا آقا ہی ہوتا تو ممانعت کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ مالک یا آقا کا لفظ تو خدا اور وہ شخص دونوں پر بولا جا سکتا ہے۔

(ج) سب سے زیادہ غضب وربك الاکرم الایۃ کے ترجمہ میں کیا گیا ہے خاں صاحب نے اِقرَء کے معنے "اعلان کرنا" لئے اور وربك الاکرم کو اس کا مفعول واقع کیا۔ حالانکہ وربك میں واو حالیہ ہے اور یہ پورا جملہ اقرء میں جو ضمیر خطاب مستتر ہے اس سے حال ہے۔

(د) اسی طرح علق کے معنی انس ومحبت کے مراد لئے ہیں حالانکہ خلق اس بات کا صاف قرینہ ہے کہ یہاں علق سے مراد دمِ جامد ہے علاوہ بریں قرآن مجید میں کئی ایک مواقع پر آیا ہے ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً " تو کیا یہاں بھی علقۃ کے معنی انس ومحبت ہی کے لئے جائیں گے پھر لائق مؤلف کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ علق کے معنی اگرچہ محبت کے آتے ہیں لیکن وہ محبت جس کی بنیاد صنفی میلان پر ہو اور جس کو عربی میں ھوی کہتے ہیں۔ لسان العرب میں لحیانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ العلق الھوی یکون للرجل فی المرأۃ۔ چنانچہ کثیر عزہ کا شعر ہے

ولقد اردت الصبر عنك فعاقنی علقٌ بقلبی من ھواك قدیم

(باقی آئندہ)

حالاتِ حاضرہ

اہم عالمی واقعات پر ایک نظر

از

(جناب اسرار احمد صاحب آزاد)

کوریا کی جنگ | تازہ ترین اطلاعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ کوریا کی جنگ امروز فردا میں "متارکہ" پر ختم ہو جائے گی۔ یہ جنگ ۱۹۵۰ء میں ۲۵ جون کو شروع ہوئی تھی اور اگر مذکورۂ بالا اندازہ صحیح ثابت ہوا تو کوریا کے باشندوں کو پورے تین سال کے بعد امن کی فضا میں سانس لینے کا موقع نصیب ہو سکے گا۔ اور اس طرح دوسرے بین الاقوامی اختلافات اور تنازعات کو طے کرنے کے لئے زیادہ مہلت اور فرصت مل سکے گی، لیکن اس اطمینان بخش اطلاع کے ساتھ یہ تشویش انگیز خبر بھی موصول ہوتی ہے کہ جنوبی کوریا کے صدر سنگمان ری اور ان کی حکومت نے اعلان کیا ہے کہ وہ خود کو متارکہ کا پابند نہیں بنائیں گے اور اگر شمالی کوریا اور ادارہ اقوام متحدہ کے مابین مفاہمت اور مصالحت ہو گئی تو وہ جنگ جاری رکھیں گے اور جنوبی کوریا کی فوجیں شمالی کوریا پر یلغار شروع کر دیں گی۔ پھر اسی قدر نہیں بلکہ جنوبی کوریا میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا ہے اور جنوبی کوریا کے جو افسر ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں انھیں واپس بلانے کے لئے احکام جاری کر دئے گئے ہیں ان باتوں سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ صدر سنگمان ری نے اپنے اعلان کو عمل کی شکل دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

سنگ مان ری کا مطالبہ یہ ہے کہ متارکہ سے قبل امریکہ اور جنوبی کوریا کے درمیان ایک میثاق دفاع ہو جانا چاہئے جس کی رو سے ——— امریکہ، جنوبی کوریا کو

کثیر تعداد میں اسلحہ اور سامان مہیا کرتا رہے ۔اگر کوریا پر حملہ کیا جائے تو امریکہ فوراً جنوبی کوریا کے دوش بدوش کھڑے ہو کر حملہ آور کا مقابلہ کرے اور امریکی بحریہ اور فضائیہ اس وقت تک جنوبی کوریا میں موجود رہے جب تک جنوبی کوریا میں اپنی مدافعت کی اہلیت اور قوت پیدا نہ ہو جائے

اس میں شک نہیں کہ کوریا میں جنگ شروع ہونے کی اطلاع کے ساتھ ہی اس جنگ میں امریکی فوج کے حصہ لینے کی اطلاع بھی موصول ہوئی تھی لیکن ادارہ اقوام متحدہ نے اس معاملہ کو اس درجہ سرعت کے ساتھ اپنا لیا تھا کہ ایک ہی ہفتہ میں یہ جنگ ادارہ اقوام متحدہ اور شمالی کوریا کی جنگ متصور ہونے لگی تھی اور اب تک یہ جنگ شمالی کوریا اور ادارہ اقوام متحدہ ہی کی جنگ سمجھی جاتی ہے اس لئے اس سلسلہ میں متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً یہ کہ ـــــــ کیا جنوبی کوریا کو ادارہ اقوام متحدہ اور شمالی کوریا کے درمیان طے ہو جانے والی شرائط متارکہ کی خلاف ورزی کا کوئی حق حاصل ہے اور اگر اسے اس قسم کا کوئی حق حاصل نہیں تو خلاف ورزی کی صورت میں ادارہ اقوام متحدہ جنوبی کوریا کی حکومت کے خلاف کیا کارروائی عمل میں لائے گا ؟ اور کیا امریکہ کی طرف سے کسی ایسے ملک کی امداد مناسب فعل ہوگا جو ادارہ اقوام متحدہ کے فیصلہ سے انحراف پر آمادہ ہو اور اگر امریکہ نے سنگ مان ری کو مدد دی تو کیا اس کا مطلب ادارہ اقوام متحدہ کے فیصلہ کی خلاف ورزی نہ ہوگا اور اس صورت میں امریکہ کے متعلق ادارہ اقوام متحدہ کا رویہ کیا ہوگا ؟

مذکورہ بالا سوالات کا صحیح جواب مستقبل ہی دے سکے گا لیکن یہاں اتنی بات ضرور سمجھ لینی چاہئے کہ جس طرح کوریا کا میدان جنگ تین سال تک دو متضاد نظریوں اور قوتوں کی کشمکش کا میدان بنا رہا ہے اسی طرح اس جنگ کا خاتمہ بھی دنیا کے امن خواہوں جنگ بازوں کے ارادوں اور ادارہ اقوام متحدہ کے تدبر کے لئے آزمائش کا ایک نازک ترین دور ثابت ہوگا اور اس دور کے واقعات سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکے گا کہ امن پسند کون ہے اور جنگ باز کون نیز ادارہ اقوام متحدہ کس حد تک امن عالم کو برقرار

رکھ سکتا ہے!

برمودا کانفرنس عالمی تنازعات کو طے کرنے اور دنیا کو تیسری جنگ کے اندیشہ سے نجات دلانے کے لئے دنیا کی بڑی طاقتوں کے مابین ایک کانفرنس کا انعقاد بنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن جنگ کے اندیشہ سے نجات دلانے کے لئے دنیا کی بڑی طاقتوں کے درمیان مذاکرات بے حد ضروری ہیں لیکن مغربی جمہوریت پسندوں کے رہنما، کوریا کی جنگ جاری رہتے ہوئے اس قسم کے مذاکرات کو بے سود سمجھتے رہے ہیں اور اگرچہ برطانیہ کے وزیر اعظم سرونسٹن چرچل نے کم وبیش ایک ماہ قبل اس بات کا اعلان کیا تھا کہ مشرق و مغرب کے مابین پیدا شدہ اختلافات کو دور کرنے کا وقت آگیا ہے اور اب ہمیں سوویٹ یونین کے رہنماؤں کے ساتھ گفتگو کرنے کے لئے جلد از جلد بڑی طاقتوں کی ایک کانفرنس منعقد کرنا چاہئے لیکن صدر آئزن ہاور نے اس تجویز کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا اور اس بات کو مناسب سمجھا کہ سوویٹ یونین کے رہنماؤں کے ساتھ گفت و شنید سے قبل، برطانیہ، فرانس اور امریکہ کے درمیان تبادلہ خیالات کر لیا جائے. چنانچہ ماہ رواں کے اواخر یا آئندہ ماہ کے آغاز میں برمودا میں جو کانفرنس منعقد ہونے والی ہے اس میں صدر آئزن ہاور مسٹر چرچل اور فرانس کے وزیر اعظم شرکت کریں گے۔

آج سے چند روز قبل جب برمودا کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا گیا تھا کوریا میں جنگ جاری تھی اور اس لئے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ صدر آئزن ہاور اس جنگ کے پیش نظر سوویٹ یونین کے ساتھ گفت و شنید پر آمادہ نہ ہوں گے اور اس طرح سر چرچل نے جو تجویز پیش کی ہے وہ یا تو بالکل ہی مسترد ہو جائے گی یا اسے ایسی شرائط کے ساتھ مشروط کر دیا جائے گا جو دنیا کی بڑی طاقتوں کی کانفرنس کے انعقاد کو تقریباً ناممکن بنا دیں گی لیکن آج ایک طرف تو جنگ کوریا کے ختم ہونے کے قوی امکانات پیدا ہو گئے ہیں اور دوسری طرف وزرائے اعظم دولت مشترکہ کی کانفرنس نے سرونسٹن چرچل کی مذکورہ بالا تجویز کی تائید و حمایت کی ہے اس لئے اس امر کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ کانفرنس میں سرونسٹن چرچل کی تجویز کو منظور کر لیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد دنیا میں پہلی بار امن کی فضا پیدا ہوئی ہے اور اگر اس فضا کو قائم رکھا

ادبیات

غزل

از

(جناب انور صابری)

ہزار بار نشیمن بنے اُجڑ جائے
مگر چمن پہ نہ یارب کبھی زوال آئے

خزاں کے تلخ نتائج بھی ناگوار نہیں
اگر بہار کے انداز میں بہار آئے

خدا کرے کہ شریک مزاج گلشن ہوں
حسین چاندنی راتوں کے نقرئی سائے

تمہارے در کے سوا جس کا آسرا ہی نہیں
وہ بدنصیب کہاں جاکے ہاتھ پھیلائے

قدم قدم پہ قیامت نفس نفس مشکل
بُرے وہ دن کبھی تقدیر پھر نہ دکھلائے

اسی کو خاص ہوئی نسبتِ کرم حاصل
شب فراق کے دامن میں جس کو نیند آئے

میں ایسی موت پہ کردوں نثار عمر ابد
وہ ہنس کے دیکھتے ہوں اور دم نکل جائے

جنونِ شوق کی راہِ طلب بدل نہ سکی
خرد نے لاکھ اسے سبز باغ دکھلائے

ہیں سازِ عشق میں پنہاں کچھ ایسے نغمے بھی
اگر سنے تو مشیت بھی رقص فرمائے

یہ دور ڈھال رہا ہے وہ پیکرِ انساں
جو خود تڑپ نہ سکے دوسروں کو تڑپائے

بلا خلوص محبت سکوں ہے ناممکن
یہ بات آج کی دنیا کو کون سمجھائے

حیات اس کی ہے ننگِ حیات اے انورؔ
وہ آدمی جو غمِ زندگی سے گھبرائے

غزل

از

(جناب شارق میرٹھی ایم۔اے)

اہلِ دل کیا کریں گے تدبیریں کھیلتی ہیں نظر سے تقدیریں
اپنی ہستی پہ اک نگاہ تو ڈال ظلمتوں میں نہاں ہیں تنویریں
خامشی پر نہ جا مری ظالم میں نے چپ رہ کے کی ہیں تقریریں
اور کیا ہے جہاں کے پردہ پر میری نظریں تمہاری تصویریں
اب تو لگ جائے آگ ہی دل میں دیکھ لیں ضبطِ غم کی تاثیریں
میں تو اک آہ کر کے ہوں خاموش اب کرے کون غم کی تفسیریں

کیں نہیں بلکہ ہو گئیں شارق
ہیں کچھ ایسی بھی اپنی تقصیریں

شئون علمیہ

پرواز کی تیزی

برٹش اوور سیز ایرویز کارپوریشن کے صدر سر مائلس ٹامس نے پیش گوئی کی ہے کہ لندن سے نیویارک تک کی مسافت جٹ طیارے ۷ گھنٹے سے کم کی مدت کی پرواز میں طے کرلیں گے۔ اور خود کارپوریشن کے جٹ طیارے ۱۹۵۴ء میں ایسی پروازیں شروع کردیں گے۔

پہلی بار شمالی بحر اطلانتک کو جٹ طیارے پار کریں گے اور خود کوئی ۸ میل کی بلندی پر پرواز کریں گے۔ اس لئے موسمی حالات کا مطالعہ زمینی حالات کے مطالعہ سے مختلف ہوگا۔ راڈار پر کافی توجہ کرنا پڑے گی۔

۱۹۵۵ء میں ایسا ہوجائے گا کہ "دنیا کے گرد" پرواز کرنے کے لئے ۲ سروسیں قائم ہوجائیں گی۔ سر مائلس نے یہ بھی فرمایا کہ ایک کامٹ طیارے نے لندن سے ٹوکیو تک کی مسافت ۴۷ گھنٹہ ۵۴ منٹ میں طے کی اس سے صاف ظاہر ہے کہ برطانوی جٹ طیاروں سے دنیا کی کمر میں پٹی باندھنے کا منصوبہ کوئی خواب نہیں ہے۔

سائنس دانوں کی کمی

یہ ذکر ہندوستان کا نہیں ہے جہاں سائنس دانوں کی تعداد روز افزوں سہی لیکن ضرورتوں کے لحاظ سے بہت ہی کم ہے۔ یہ ذکر تو انگلستان کا ہے جس کی نسبت یہ کبھی گمان بھی نہ ہوسکتا تھا کہ وہاں سائنس دانوں کی کمی ہوگی لیکن واقعہ یہ ہے کہ وہاں سائنس دانوں کی اتنی کمی ہوگئی ہے کہ حکومت کو کچھ نہ کچھ اس سلسلے میں کرنا پڑے گا۔ صنعتوں میں ملازمتوں میں اور جامعوں میں تربیت یافتہ سائنس دانوں کی مانگ ہے اور وہاں اتنے موجود نہیں۔

برطانوی وزارت رسد کے ایک افسر نے کہا کہ "فنی آدمیوں کی کمی بہت سنگین ہوگئی ہے اور حالت ابتر ہوتی جارہی ہے"۔

مسئلے نے پیچیدہ صورت اس لئے اختیار کرلی ہے کہ مدارس اور جامعات میں فنی مضامین کی تعلیم کے لئے استاد نہیں ملتے۔ ایسے استادوں کی کمی کو صرف برطانیہ ہی محسوس نہیں کررہا ہے بلکہ تقریباً ساری دنیا میں سائنس دانوں کی طلب بڑھ رہی ہے۔

دولت مشترکہ کے جو ملک ہیں وہ برطانوی سائنس دانوں کو اونچے مشاہرے دیتے ہیں حتیٰ کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ نے برطانوی سائنس دانوں کو بڑے بڑے لالچ دئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ امریکی شہریت بہت جلد ان لوگوں کو عطا کردی جائے گی۔ اسی دقت کو رفع کرنے کے لئے لندن کے امپیریل کالج آف سائنس کو ایسا مرکز بنایا جارہا ہے جہاں فنی آدمیوں کی تربیت کا انتظام ہوگا۔

اڑن طشتریاں

سوئٹزرلینڈ کے ماہر ریاضی و موسمیات پروفیسر لوئی نکولٹ نے ایک ملاقات میں یہ خیال ظاہر کیا کہ تیسری عالمگیر جنگ میں جوہری بموں سے زیادہ اڑن طشتریاں حصہ لیں گی۔ ان سے طوفان اور آندھیاں پیدا کی جائیں گی۔ تاکہ دشمن کو شکست دی جاسکے۔

کوئی ۲ برس ادھر سے اڑن طشتریوں کا بہت چرچا رہا ہے۔ پروفیسر موصوف کا خیال ہے کہ یہ زمین ہی سے اٹھی تھیں۔ ان کا مقصد موسمی حالات میں خلل پیدا کردینا ہے۔

موصوف کا دعویٰ ہے کہ ان کو جو شہادت بہم پہنچی ہے اس سے انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان طشتریوں کی ابتدا سوویٹ یونین سے ہوئی ہے۔ ان سے موسموں میں جو خلل پیدا ہوا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ چنانچہ برطانیہ، بلجیم اور ہالینڈ میں جو طغیانیاں آئیں وہ موصوف کے نزدیک ان ہی طشتریوں کی کارفرمائی ہے۔ مزید شہادت یہ ہے کہ حال حال میں متعدد علاقوں میں غیر معمولی موسمی حالات پیدا ہوتے۔

اور سوویٹ یونین سے ان کے نزدیک طشتریوں کی ابتدا کی شہادت یہ ہے کہ ان علاقوں سے کسی طوفاں خیزی یا طغیانی کی اطلاع نہیں آئی ہے۔

کوئی جنگ اگر چھڑ گئی تو موصوف نے پیش گوئی کی کہ اُڑن طشتریوں سے یہ کام لیا جائے گا کہ وہ جوہری بم بردار ہوائی جہازوں کو طیران گاہوں سے نکلنے نہ دیں۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ اڑن طشتریاں اتنی تعداد میں روانہ کی جائیں گی کہ وہ زبردست طوفان پیدا کردیں تاکہ طیارے زمین سے اوپر نہ اٹھ سکیں۔

جب ان سے سوال کیا گیا کہ پچھلے چند مہینوں میں کسی نے اڑن طشتری نہیں دیکھی ہے تو انھوں نے جواب دیا کہ ان کو اب اتنا مکمل کرلیا گیا ہے کہ وہ کوئی ۶۰ ہزار فٹ بلند اڑتی ہیں اس لئے ان کو زمین سے دیکھا نہیں جا سکتا۔

پچاس برس بعد

انگلستان کے ایک استاد ریاضی مسٹر کنتھ اسنل نے پیش گوئی کی ہے کہ سن ۲۰۰۳ء میں مدرسوں میں لڑکے پہاڑوں کی بجائے مشینوں کی مدد سے حالی سوالات کریں گے اور اقلیدس پڑھنے کی بجائے آئنسٹائن کا نظریہ ان کے مطالعہ میں رہے گا۔ ابتدائی درجوں میں کوئی مضامین مقررہ نہ ہوں گے۔ عددی کھیل زیادہ ہوں گے۔ پہاڑوں وغیرہ کا یاد کرنا غیر ضروری ہو جائے گا۔ اور ریاضی کی تقسیم حساب، الجبرا، ہندسہ اور مثلث میں نہ کی جائے گی۔ کسروں کی بجائے اعشاریہ کا دور دورہ ہوگا۔ شاید نصف یا ثلث کی کسریں رہ جائیں گی۔

ریاضی کے ہر کمرہ میں ایک شمارندہ مشین ہوگی اور لڑکے کا کام یہ ہوگا کہ جس حساب کی ضرورت ہو مشین کی مدد سے انجام دے۔

تیز رفتاروں اور لمبی مسافتوں سے اس قدر تعلق خاطر ہو جائے گا کہ آئنسٹائن کا نظریہ پڑھانا ضروری ہو جائے گا۔ اور یہ بھی توقع ہے کہ شماریات اور جوہری انشقاق مدرسوں میں زیر درس رہیں گے۔

تبصرے

ترجمان اسرار از آنریبل مسٹر جسٹس شیخ عبدالرحمٰن۔ تقطیع کلاں۔ ضخامت پونے دو سو صفحات۔ ٹائپ جلی اور روشن۔ گٹ اپ خوبصورت اور جاذب نظر

پتہ:۔ مکتبہ کارواں۔ ایبک روڈ۔ انارکلی۔ لاہور۔ (پاکستان)

یہ کتاب ڈاکٹر سر اقبال کی مشہور مثنوی "اسرار خودی" کا اردو ترجمہ ہے۔ لائق مترجم کا شگفتہ و پختہ ذوق شعر و ادب اور قدرت کلام سزاوار تحسین و آفریں ہے کہ پنجاب کی عدالت عالیہ کے جج اور پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہونے کی دوگونہ مصروفیتوں کے باوجود ایسا عمدہ اور شگفتہ ترجمہ کیا ہے کہ اکثر جگہ ترجمہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا اور جگہ جگہ بے ساختہ ایسے اشعار قلم سے نکل گئے ہیں کہ بالکل اصل کا لطف آتا ہے مگر ان اشعار میں بھی اصل کلام اقبال کی اسپرٹ کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا ہے۔ تاہم جیسا کہ شیخ صاحب نے خود سر آغاز میں کہا ہے کہ انھیں اطمینان سے ترجمہ پر نظر ثانی کرنے کا موقع نہیں ملا بعض بعض اشعار نظر ثانی کے محتاج ہیں مثلاً صفحہ ۲ پر ع کہیں روشن ہے جام جم سے میری خاک کی مٹھی" سے اصل مفہوم ادا نہیں ہوتا، یہاں بجائے روشن کے "روشن تر" ہونا چاہئے" جیسا کہ اصل میں ہے "بھر مشت خاک" کا صحیح اردو ترجمہ "مٹھی بھر خاک" ہے نہ کہ خاک کی مٹھی، اسی طرح اصل مصرعہ "یوسف من بہر ایں بازار نیست" کا ترجمہ "یہ وہ بازار ہے جو میرے یوسف کے نہیں شایاں" بھی غور طلب ہے اس میں اصل مصرعہ کا مفہوم منقلب ہو گیا ہے۔ صفحہ ۱۲ پر

"قلم میرے نے راز نہ فلک سب کر دئے افشا"

ایک دہلوی نژاد ادیب کے قلم سے اچھا نہیں معلوم ہوتا" یہاں بجائے "قلم میرے

سے کے "میرے خامہ نے" بہت آسانی سے کہا جاسکتا تھا۔ یہ چند اشارات صرف اس لئے کئے گئے ہیں کہ آئندہ اڈیشن کے لئے فاضل مترجم نے ترجمہ پر نظر ثانی اطمینان اور یکسوئی سے کی تو امید ہے کہ یہ پھولوں کا دستہ اس طرح کے چند کانٹوں سے بالکل پاک وصاف ہوجائے گا ترجمہ کے شروع میں اقبالیات اور فلسفہ کے مشہور فاضل ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا ایک طویل مقدمہ ہے جس میں موصوف نے کلام اقبال کے مختلف پہلوؤں اور خصوصاً فلسفۂ خودی کی اصل حقیقت وعظمت پر بڑی فاضلانہ اور بصیرانہ گفتگو کی ہے اس حیثیت سے یہ مقدمہ خود ایک مستقل افادیت کا حامل ہے۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس کے مطالعہ سے محظوظ وشادکام ہوں گے اور فاضل مترجم ومقدمہ نگار اور ناشر جنہوں نے بڑے اہتمام سے اس کو شائع کیا ہے ان کی محنت وسعی کی داد دیں گے۔

رسالۂ نور المعرفت تصنیف ولی شاعر ہندی مرتبہ ڈاکٹر سید ظہیر الدین مدنی ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی تقطیع متوسط کتابت وطباعت بہتر ضخامت ۳۲ صفحات قیمت عہ، پتہ:۔ انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹیٹوٹ بمبئی

ہندوستان کی اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ سلاطین گجرات نے اپنے پونے دو سو سال کے دور فرمانروائی میں اسلامی علوم وفنون کی جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ دلی کی سلطنت اپنے چھ سو سال کے دور میں بھی نہیں کرسکی اسی کا نتیجہ تھا کہ صرف ایک احمد آباد میں عربی کے مدارس اور خانقاہیں اس کثرت سے تھیں کہ ایک شاعر کہتا ہے

مدارس درو بے حد و خانقاہ   برائے مسافر کہ آید ز راہ

انھیں مدارس میں ایک مدرسہ مدرسہ ہدایت بخش کے نام سے تھا جس میں گجرات کے مشہور فاضل اور بزرگ مولانا شیخ نورالدین اور آپ کے بعد آپ کے بڑے صاحبزادے شیخ محمد صالح عرف پیر بابا درس دیتے تھے اردو کے دور اول کے مشہور شاعر ولی کو جو پہلے دکھنی کہلاتے تھے مگر اب گجراتی لکھے جانے لگے ہیں) چونکہ مولانا شیخ نورالدین سے بڑی عقیدت تھی اس لئے

انھوں نے حضرت شیخ کے نام کی مناسبت سے ایک رسالہ مدرسئہ ہدایت بخش کی تعریف و توصیف میں لکھا تھا جس میں مولانا شیخ نورالدین کی مدح و منقبت کے ساتھ مدرسہ کی عمارت اس کی مسجد اور اس کے حوض وغیرہ کا تذکرہ ایک خاص شاعرانہ انداز میں کیا گیا تھا رسالہ اگرچہ مختصر ہے تاہم دلی کی فارسی انشاء پردازی اور اس کے علم و فضل کا ایک بہترین شاہ کار ہے۔ لائق مرتب نے اسی رسالہ کو اڈٹ کر کے اپنے ایک فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ دلی کی ایک علمی یادگار ہونے کی بنا پر امید ہے ارباب ذوق اس کی قدر کریں گے

نشانی مفتی اعظم مرتبہ مولانا ابوالخیر محمد ادریس نسیم دہلوی۔ تقطیع جیبی۔ کتابت و طباعت بہترین ضخامت ۳۲ صفحات۔ قیمت درج نہیں شاید ۴ر پتہ: بزم احمد حسین امروہوی۔ دارالکتابت گلی راجان فراشخانہ دہلی۔ مولانا ابوالخیر محمد ادریس فن تاریخ گوئی کے مسلم الثبوت استاد اور ماہر ہیں۔ موصوف نے حضرت مفتی محمد کفایت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے حادثہ وفات سے متاثر ہو کر کم و بیش ایک سو مادے تاریخ وفات کے نکالے تھے جو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں ہونے کے علاوہ عجیب و غریب قسم کی مختلف صنعتوں میں بصورت قطعات یا عبارتہائے منظوم و منثور پھیلے ہوئے ہیں۔ یہ کتابچہ انھیں کا دل پسند مجموعہ ہے، جو حضرات اس فن کا ذوق رکھتے ہوں انھیں کم از کم ایک مرتبہ فن کے اس حیرت انگیز نمونوں کو دیکھ کر لائق مؤلف کی لیاقت و محنت اور کمال و ہنرمندی کی داد ضرور دینی چاہئے۔

شرق اوسط میں کیا دیکھا؟ از سید ابوالحسن علی صاحب ندوی۔ تقطیع خورد ضخامت ۹۴ صفحات۔ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:۔ مکتبۂ تعلیمات اسلام نمبر ۳۸ امین آباد پارک لکھنؤ۔

یہ ان چند عربی تقریروں کا اردو ترجمہ ہے جو سید ابوالحسن علی صاحب ندوی نے شرق اوسط کے سفر سے واپس آ کر دہلی ریڈیو اسٹیشن سے عربی پروگرام کے سلسلہ میں نشر کی تھیں یہ سفرنامہ نہیں بلکہ صرف ان طبعی تاثرات کا ایک بیان ہے جو مصر شام و فلسطین وغیرہ میں گھومنے

سکے بعد لایق سیاح کے دل ودماغ پر طاری ہوتے علاوہ بریں ان ملکوں کے چند نامور علما اور ارباب اثر ورسوخ حضرات کا تذکرہ بھی ضمناً آگیا ہے۔ کتاب دلچسپ لائق مطالعہ اور مفید ہے

(۱) فقہ نظامی تقطیع خورد ضخامت ۱۱۲ صفحات۔

(۲) عربی اردو نظامی قاعدہ جدید حصہ اول ودوم مکمل ضخامت ۸۰ صفحات

(۳) سیرت محبوب رب العلمین ضخامت ۸۰ صفحات

از جناب مولانا ابو بکر خطیب مدنی قیمت کسی ایک کی بھی درج نہیں پتہ:۔ مدرسہ حاجی احمد بن محمد لوکھات مرحوم ڈربن نٹال (جنوبی افریقہ)

پہلے رسالہ میں نماز۔ روزہ۔ زکوٰۃ اور حج اور ان سے متعلقہ امور کے احکام ومسائل عام فہم اور سادہ زبان میں بصورت سوال وجواب بیان کئے گئے ہیں دوسرے رسالہ میں ایک نئے طریقہ پر بچوں اور بچیوں کے لئے قاعدہ اس طرح پر لکھا گیا ہے کہ اس کو پڑھ لینے کے بعد بچہ کو عربی حروف کے ساتھ ساتھ اردو حروف پڑھ لینا بھی آسان ہوجاتا ہے اس میں تین فصلیں اور ۳۹ اسباق ہیں جن میں حروف کی شکلیں اور قواعد بیان کئے گئے ہیں اور فصل سوم میں دینیات کے مسائل کا بیان ہے تیسرا رسالہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے آسان اردو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں بصورت سوال وجواب لکھا گیا ہے تینوں رسالے اس لائق ہیں کہ بچوں اور بچیوں کے مکاتب کے نصاب میں ان کو شامل کیا جائے۔ ان سے خاطر خواہ فائدہ ہوگا!

اخلاقی کہانیاں حصہ اول ودوم ہر ایک کی ضخامت ۳۲ صفحات۔

اخلاقی کہانیاں حصہ چہارم ضخامت ۴۸ صفحات۔

مرتبہ جناب افضل حسین صاحب ایم۔ اے بی۔ ٹی تقطیع خورد کتابت وطباعت بہتر اور دیدہ زیب حصہ اول ودوم کی قیمت ۳ر اور حصہ چہارم کی ۵ر پتہ:۔ مکتبہ جماعت اسلامی ہند دہلی (بلیماران دہلی)

ہندوستان کی جماعت اسلامی نے رام پور کو اپنا مرکز بنا کر وہاں مسلمان بچوں کے لئے ایک درسگاہ قایم کی ہے جس کا مقصد تعلیم سے زیادہ بچوں کی تربیت ایک ایسے طریقہ پر کرنا ہے کہ وہ بڑے ہو کر پکے اور سچے مسلمان بھی ہوں دینیات اور عربی سے آشنا بھی ہوں اور ساتھ ہی دنیوی زندگی عزت اور خودداری کے ساتھ بسر کرنے کے بھی قابل ہوں اس مقصد کے پیش نظر درسگاہ کے ارباب کار نے خود اپنا ایک نصاب تیار کیا ہے اور اب اسی نصاب کو اس درسگاہ میں رائج کر کے اس کا عملی تجربہ کیا جا رہا ہے۔ زیر تبصرہ یہ چھوٹے چھوٹے چند رسالے اسی نصاب اور اس کے ماتحت تعلیمی و ذہنی اصلاح کے جذبہ سے لکھے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ زبان و بیان، مضامین و ترتیب اور کتابت و طباعت ہر اعتبار سے یہ رسالے اس لائق ہیں کہ ہر مسلمان بچہ یا بچی کو پڑھائے جائیں ان کے پڑھنے سے اردو زبان بھی آئے گی نیکی کی عظمت اور اس کی طرف رغبت بھی پیدا ہوگی اور اخلاقی سربلندی و سرفرازی حاصل کرنے کا ولولہ بھی پیدا ہوگا۔

آسان کہانیاں مرتبہ جناب افضل حسین صاحب ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی قیمت ۳ر یہ رسالہ بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے جس میں دس کہانیاں بچوں کے لئے دلچسپ و آسان زبان میں لکھی گئی ہیں ان کہانیوں میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ کہانیاں بچوں کی ذہنی استعداد کے مطابق ہوں۔

باب القرآن از مولوی حاجی ابوالسعود احمد الباقوی تقطیع متوسط ضخامت ۳۲ صفحات کتابت و طباعت عمدہ قیمت ۶ر پتہ:۔ دارالاشاعت میل وشارام صلوٰیہ مدراس

یہ رسالہ کیا بلکہ قاعدہ قرآن مجید کی تعلیم کو آسان کردینے کی غرض سے لکھا گیا ہے اس کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصہ میں حروف تہجی اور حرکات و سکنات کی خوب مشق کرادی گئی ہے دوسرے حصہ میں حروف کی ترکیب اور مرکبات کو سہل و آسان طریقہ پر سمجھانے اور ان کی مشق کرانے کی کوشش کی گئی ہے امید ہے یہ قاعدہ تجربہ کے بعد اپنے مقصد میں کامیاب ثابت ہوگا۔

REGISTERED NO. D. 183

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ **محسن خاص** جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ **محسنین** جو حضرات پچیس روپئے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطۂ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلاکسی معاوضہ کے پیش کیا جاتا۔

۳۔ **معاونین:۔** جو حضرات اٹھارہ روپئے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا ان کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپئے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ **احبّاء** نو روپئے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبّاء میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دی جائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ بُرہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہیئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپئے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپئے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا